

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈائجسٹ

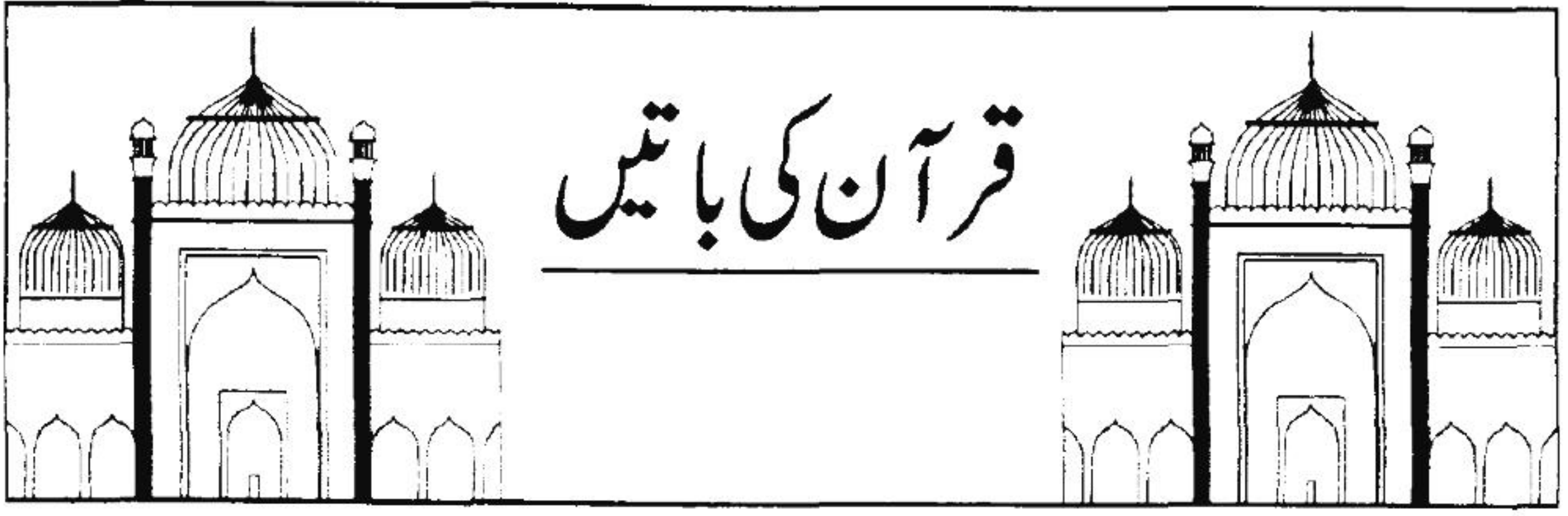
کراچی

ڈا

نومبر 2015

PDFBOOKSFREE.PK





☆ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان بخیلوں کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 34 سے 35)

☆ کچھ شک نہیں کہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند اور ستاروں کو پیدا کیا سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 54)

☆ اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست اور صاحب حکمت ہے اور جو شخص گناہ کے بعد توبہ کر لے اور نیکو کار ہو جائے تو اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 38 سے 39)

☆ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی کریں۔ اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے۔ ہاں جن لوگوں نے اس سے پیشتر کہ تمہارے قابو آ جائیں تو توبہ کر لی تو جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 33 سے 34)

☆ اور طبیعت تو حرص کی طرف مائل ہوتی ہے اور اگر تم نیکو کاری اور پرہیزگاری کرو گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 128)

☆ اور ہم جو پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں، تو صرف اس لئے کہ لوگوں کو اللہ کی نعمتوں کی خوشخبریاں سنائیں اور عذاب سے ڈرائیں۔ اور جو کافر ہیں وہ باطل کی سند سے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو پھسلا دیں اور جو کافر انہوں نے ہماری آیتوں کو اور جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے یہ نہی بنالیا۔ (سورۃ کہف 18 آیت 56)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر یہ شمع بک ایجنسی کراچی)



چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ  
ڈائجسٹ  
کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 02 نومبر 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 60/- روپے

سالانہ قیمت - 1080/- روپے



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔



16

بڑوں کی باتیں چھٹوں کے لئے سرمایہ حیات  
ہیں، پڑھ کر دیکھیں حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے

ایس حبیب خان

خوشبو کا شاخسانہ

33

رگ و پے میں خوف و ہراس کی لہر گردش کرتی  
ہوئی خوفناک حیرت ناک دل شکستہ کہانی

ساحل ابڑو

تنہا مکان

41

ماورائی قوت کی تحیر انگیز اور ورطہ حیرت  
میں ڈالتی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین کہانی

فلک زاہد

عجیب و غریب

50

وہ واقعی ہراسنا تو توں کا مالک تھا اس کی حیرت انگیز  
اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

اے وحید

رولو کا

71

جادوئی عمل کا لرزہ براندام کرتا عجیب و غریب  
شاخسانہ جو کہ دلوں پر ہیبت طاری کر دے گا

محمد خالد شاہان

بدروح بلی

79

کالا جادو جو کہ انسان کو تہ و بالا کر کے  
رکھ دیتا ہے..... حقیقت پر مبنی کہانی

ملک فہیم ارشاد

کالا عمل

96

خوف کے خونی لہاوے میں لپٹی ہوئی دماغ کو  
مبہوت کرتی اور دل کو دہلائی خونچکاں کہانی

ایس امتیاز احمد

تاریکی کا عفریت

122

دماغ میں نہ آنے والا حیرتناک اور خوفناک  
واقعہ مگر حقیقت کو دیکھ کر کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا

ضرغام محمود

کمرہ نمبر 78

127

خراں خراں دل و دماغ پر اثر انداز  
ہوتی دلکش و لغریب دلنشین انوکھی کہانی

ناصر محمود فرہاد

بریکنگ نیوز

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔



زندہ صدیاں

ایم اے راحت

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی  
بے مثال، لاجواب اور دل فریب کہانی.....

136

موت کا تعاقب

مدر بخاری

لمحہ لمحہ، ہل ہل خوف کے شکنجے میں جکڑتی  
ہوئی اور لرزہ بر اندام کرتی حقیقی کہانی

161

ظالم سلاطیہ

محمد قاسم رحمان

برسوں دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی ایک  
امنٹ حیرت انگیز تحیر انگیز اچھوتی کہانی

169

موت کا فرشتہ

پیا سحر

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں  
جلاد بھی، اسی کے مصداق پراثر کہانی

178

بھیا نک انجام

محمد ابو ہریرہ بلوچ

رات کے گھناؤپ اور ہاتھ کو ہاتھ کھائی نہ دینے  
والے اندھیرے میں جہنم لینے والی ڈراؤنی کہانی

195

قوس قزح

ادارہ

قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین  
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

206

آ سیبی جنگل

رضوان علی سومرو

خوف و ہراس کے لبادے میں لپیٹی ہوئی اور جسم و  
جاں پر لرزہ طاری کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

211

اجر صبر

ساحل دعا بخاری

محبت، خلوص اور چاہت کی دل گرہیت کہانی  
جس میں پڑھنے والوں کیلئے سبق ہی سبق ہے

225

انگارے

شہزادہ چاند زیب عباسی

حیرت و خوف کے گرداب میں غوطہ زن اپنی  
مثال آپ..... تحیر انگیز..... ایڈو نچر کہانی

236

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دو بازار کراچی: 32744391



**مریم شاہ بخاری** سرگودھا سے، السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے تمہاری ترقی کے لئے دن رات دعا گو ہوں، اللہ کرے تمہیں جو عروج حاصل ہے وہ دن بدن بڑھتا ہی رہے، تمہارے حسن و ترقی کو کبھی زوال کی ہوا چھو کر بھی نہ گزرے، تمہاری سانگمرہ پہ تمہیں مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ان سب کو بھی جو تم سے وابستہ ہیں تمہارے حسن کو سنوارنے اور نکھارنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ انہی کی محنت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے جو تم اتنے برس گزر جانے کے باوجود ہمیں ہر بار فریش اور خوب صورت سے خوب تر بن کر ملتے ہو۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی تمہارے حسن اور نزاکت میں کمی واقع نہیں ہوئی اور خدا کرے کہ آنے والے برسوں میں بھی تمہاری چمک دمک اور آب و تاب یونہی قائم و دائم رہے۔ (آمین) ”ڈرڈائجسٹ“ سے ہمارا تعلق بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوا اور اس کے قیمتی اوراق میں ہماری تحریریں یونہی شائع ہوتی رہیں، لوگوں کے لئے محبت اور امن کے نغمے بکھرتے رہیں، خوشیوں کی سرتال پہ دل جھومتے رہیں۔ اللہ کرے میری ارض پاک کا ہر فرد خوشحال اور باکردار ہو..... میری ارض پاک ہمیشہ سلامت رہے آباد رہے۔ (آمین) ثم آمین۔ ایڈیٹر صاحبان آپ سب کو بھی سلام، مبارکباد اور Very Very thanks اتنا پیارا رسالہ نکالنے کے لئے، ماہ اکتوبر 2015ء میں شائع ہونے والی ہر تحریر خوب صورت تھی، خاص طور پر تار عنکبوت، خون آشام، بھیا نک موت، آتش حسد، دھڑکتا دل، کرشمہ سازیاں، فرشتہ اجل، زندہ روح اور ”نخست زدہ“ بہترین تحریر ہیں جبکہ ”قوس قزح“ اور غزل میں شاعری خاص متاثر نہیں کر سکی بس ٹھیک تھی۔ سلسلے والے رمانوں میں ”رولوکا“ اور ”زندہ صدیاں“ کی تو کیا ہی بات ہے..... یہ دونوں کہانیاں ڈرڈائجسٹ کی جان ہیں۔ ”ڈرڈائجسٹ“ کا پڑھنا ہی ”رولوکا“ کی وجہ سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ نیا سلسلہ ”انگارے“ بھی اچھی ہے آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے، امید ہے شہزادہ صاحب کچھ اچھا ہی لے کر آئیں گے۔ باقی تمام رائٹرز کو سلام اور دعائیں۔ اپنی ایک غزل بھیج رہی ہوں امید ہے کہ جلد شائع ہوگی۔ اجازت دیں۔ اس بات کے ساتھ کہ خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھیں۔

☆☆ مریم صاحبہ: قلبی لگاؤ سے دعائیہ کلمات اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ اور پھر دوبارہ شکریہ کہ آپ اپنی قلبی لگاؤ کا اظہار ہر ماہ خط بھیج کر کریں گی۔ Thanks۔

**عروہ ہادی** بھکر سے، السلام علیکم! ڈرڈائجسٹ کے اسٹاف اور تمام لکھنے پڑھنے والوں اور دوستوں کو سلام۔ میں نے جولائی میں سنہری لاکٹ کہانی بھجوائی تھی وہ ملی؟ کیونکہ مجھے اگست کا شاہ نہیں ملا۔ ڈر میں سب اچھا لکھ رہے ہیں۔ مجھے ملک این اے کاوش سے کچھ کہنا ہے۔ لالہ چھوٹی بہن مجھ کے پڑھنے لگا۔ آپ کی کہانیاں بہت بہت اچھی ہوتی ہیں مگر بوسیدہ ڈائریہ اور درندہ کا تھیم ایک جیسا تھا۔ آپ نے مرکزی کردار کو لالچی بنایا۔ پھر ایک شکتی شالی سے ملوایا۔ آخر میں اس کا بھیجائی کر دیا۔ کچھ ایک سا نہیں تھا۔ دوسرا تھا۔ دونوں کہانیوں میں ملہو تر اخاندان؟..... ایسا کیوں کیا؟ ڈونٹ مائنڈ لالہ.....! سب اچھا لکھتے ہیں، خاص طور پر لالہ زرغام، لالہ عثمان اور آپی طاہرہ اینڈ آپی عطیہ ویری گڈ۔

☆☆ عروہ صاحبہ: خط لکھنے اور لالہ کاوش سے باتیں اچھی لگیں، امید ہے کاوش صاحب غور فرمائیں گے، مگر آپ بھی غور فرماتے ہوئے آئندہ ماہ بھی خط ضرور لکھئے گا۔ Thanks۔

**درخشاں طالب** حیدرآباد سے، السلام علیکم! میں ڈرڈائجسٹ کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور اس ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں منفرد ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر میرے دل نے کہا کہ میں اس کے لئے کچھ لکھوں، لہذا اپنی تحریر ”کٹھن ہے زندگی“ ارسال کر رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اگر اس میں کچھ غلطیاں ہوں تو انہیں درست کر کے ضرور شائع کر دیں گے۔ یہ میری التجا ہے۔ پلیز غور فرمائیے گا۔ ڈرڈائجسٹ کے تمام لکھاریوں اور قارئین کو اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس ڈائجسٹ کو اللہ دن دگنی رت چوگنی ترقی فرمائے۔ (آمین)

☆☆ درخشاں صاحبہ: آپ کی تحریر ضرور شائع ہوگی، نمبر آنے دیں اور ہاں تحریر ارسال کر کے بیٹھ نہ جائیں، امید ہے غور فرمائیں گی۔



**آصفہ سراج** لاہور سے، السلام علیکم! خیریت کے بعد عافیت کی طالب ڈرڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر حاضر خدمت ہوں۔ امید ہے ویلکم کہیں گے۔ پریشانیوں، دکھوں اور غموں میں کچھ عرصے کے لئے ڈرڈائجسٹ سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ مگر کہتے ہیں نا..... وقت ہر غم کا علاج ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دکھ ختم تو نہیں ہوتے مگر وقت بڑا مہم ہے۔ اس لئے تھوڑا سا قرار آ ہی جاتا ہے۔ اب اتنے عرصے بعد ڈرڈائجسٹ کو دیکھا تو بہت خوشی ہوئی کہ بہت نئے راسخاتنی پننگی سے لکھ رہے ہیں۔ اتنا عرصہ ڈرڈائجسٹ میں موجود رہنے کے بعد بھی لگتا ہے کہ لوگ آصفہ سراج کو بھول گئے ہیں۔ مگر آصفہ سراج ڈرڈائجسٹ کو نہ بھولی ہے نہ بھولے گی کیونکہ اس جیسا معیاری ڈائجسٹ پوری مارکیٹ میں نہیں ہے اور یہ واحد ڈائجسٹ ہے جو ہر نئے راسخ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ چلئے شاباش اب اپنی پرانی راسخ کو بھی ذرا خوب صورت انداز میں ویلکم بیک کہیں تاہم ہر مرتبہ ہر ماہ ڈرڈائجسٹ میں جلوہ افروز ہوتی رہوں اور اپنے قارئین کے لئے اچھی تحریر لکھتی رہوں۔ ابھی کہانی ادھوری ہے مکمل ہوتے ہی ارسال کر دوں گی، چند اشعار بھیج رہی ہوں، شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

☆ آصفہ صاحبہ: چلئے قلبی لگاؤ سے ایک مرتبہ پھر موسٹ ویلکم، وعدہ یاد رکھئے گا کسی ماہ کی بھی غیر حاضری قابل قبول نہ ہوگی، امید ہے اپنے چاہنے والوں کی خوشی کے لئے ضرور تحریر ارسال کرتی رہیں گی۔ شکریہ۔

**ثوبیہ شہزادی** کھڑیاں خاص سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، آداب! ماہنامہ ڈرڈائجسٹ میں پہلی بار ایک تحریر ارسال خدمت ہے! یہ تحریر ماہ اگست 2015ء میں بھیج دی تھی، اب معلوم ہوا ہے کہ آپ تک نہیں پہنچ پائی! بھلا ہو..... ڈاک خانے والوں کا! تحریر میں کمی بیشی ہوگی آپ درست فرما کر ہو سکے تو شامل اشاعت فرمائیں! شکریہ۔

☆ ثوبیہ صاحبہ: جی پلیز! ذرا دیکھیں، آپ کی کہانی لائن میں لگ چکی ہے، مگر خط لکھنا نہ بھولے گا۔

**فلک زاہد** لاہور سے، السلام علیکم! ماہ اکتوبر سا لگرہ نمبر بذریعہ ڈاک موصول ہوا، فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سب سے پہلے تو میں اپنے پیارے ڈرڈائجسٹ کو سا لگرہ مبارک کہنا چاہوں گی۔ خدا کرے ڈرڈائجسٹ جیسا معیاری رسالہ مزید ترقی کرے اس جیسا رسالہ کوئی نہیں جب تک اسے پڑھنے والوں چھین نہیں ملتا۔ اس میں وہ تمام کہانیاں شائع ہوتی ہیں جنہیں میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ ڈرڈائجسٹ میرے لگاؤ کو پورا ایک سال ہو چلا ہے اور اس ایک سال میں، میں نے باقاعدگی سے ڈرڈائجسٹ کا مطالعہ کیا ہے۔ انشاء اللہ آگے بھی اس سے جڑی رہوں گی۔ کیونکہ بچپن سے ہمارے کہانیاں میری پہلی پسند ہیں۔ کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس ماہ سا لگرہ نمبر کی سب سے زبردست نمبروں کہانی ”تار عنکبوت تھی۔ ویلڈن ضرغام محمود صاحب، دوسری اے ون تحریر جس کی وجہ سے شمارے کو مزید چار چاند لگے وہ عمران قریشی صاحب کی ”نخوست زدہ“ تھی۔ عمران صاحب مان گئے، آپ کو، آپ کبھی کبھی نظر آتے ہیں مگر جب آتے ہیں تو سب پر بازی لے جاتے ہیں۔ تیسری لا جواب کہانی ایس امتیاز صاحب کی ”پراسرار دھند لکا تھی۔ چوتھی خوب صورت تحریر جس نے دل موہ لیا وہ ساجدہ راجہ کی ”حیران کن“ تھی۔ آخری زبردست کہانی جس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا وہ ناصر محمود فرہاد صاحب کی ”سا لگرہ مبارک“ تھی، ناصر صاحب ویلڈن جبکہ بھائی خالد شاہان کی ”خون آشام“ بھی اچھی لگی۔ اپنی نئی کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے خاص کہانی ہے اس پر میں نے بہت محنت کی ہوئی ہے۔ بطور راسخ میری اپنی یہ کہانی میرے دل کے بہت قریب ہے۔ امید ہے آپ اسے دسمبر کے شمارے میں جگہ دیں گے کیونکہ دسمبر کی دوسری تاریخ کو میری سا لگرہ ہے اور میرا پیارا ڈرڈائجسٹ مجھے سا لگرہ وش نہ کرے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

☆ فلک صاحبہ: تمام اہل ڈرڈائجسٹ کی طرف سے سا لگرہ بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں کے پالنا میں جھلاتا رہے۔ آپ ہر پل ہر لمحہ خوش رہیں۔ خط کا وعدہ کریں کہ آئندہ ماہ خط بھیجنا بھولیں گی نہیں، کہانی شامل اشاعت ہے۔

**کوثر جہاں** کراچی سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہو گئے، سا لگرہ نمبر میرے ہاتھ میں ہے، رسالے کی کیسے اور کس طرح تعریف کروں الفاظ نہیں مل رہے، رسالہ دن دو دن رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ یوں تو رسالے کا ہر راسخ ہی شاندار ان کی کہانیاں جاندار مگر رسالے کی اصل جان اس شمارے میں شائع ضرغام محمود کی کہانی ”تار عنکبوت“ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بقیہ کہانیوں میں نخوست زدہ، فرشتہ اجل، خونی موبائل، انوکھی وصیت بھی خوب ہیں، ایس امتیاز بھی خوب لکھتے ہیں۔ کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ آخر میں آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنا بہترین اور معیاری رسالہ نکالا جو کہ ہم جیسے ہمارے کہانیاں پڑھنے والوں کو دلی تسکین پہنچا رہا



ہے۔ سب کے لئے دعا گو۔

☆ ☆ کوثر صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، ڈرڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا اور اس میں شائع کہانیاں بھی آپ کو اچھی لگیں اس کے لئے شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی تجزیہ ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ Thanks۔

**رابعہ عباس** ہستی نئے والی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام افراد خوش و خرم ہوں گے۔ ہماری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دگنی ترقی دے، میں ڈر میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کیا جائے گا۔ ڈر میں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ردلو کا کسی سے کم نہیں، عشق ناگن بھی اچھی کہانی تھی، بقایا سب کہانیاں اچھی تھیں۔ شاعری میں حکیم خان حکیم، اور قدیر رانا کی شاعری اچھی لگی۔ ایس امتیاز احمد کراچی سے اچھا لکھتے ہیں۔ میں لکھنے اور پڑھنے والوں سے درخواست کرتی ہوں کہ میری Teacher مکتبہ تنزیلہ دو ماہ سے بیمار ہیں۔ ہماری مس کو کینسر ہے۔ مہربانی کر کے میری Teacher کے لئے دعا کریں۔ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ تمام رسالوں میں ڈر بہت زیادہ پسند ہے۔ میں نے ڈر کے لئے دو کہانیاں لکھی تھیں جو شائع نہیں ہو سکیں اور اگر وہ کہانیاں آپ لوگوں کے پاس موجود ہیں تو اصلاح کر کے شائع کر دیں پلیز اگلے ماہ تک اللہ حافظ۔

☆ ☆ رابعہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں ویکم، ہماری اور قارئین کی دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ٹیچر کو کلی صحت عطا فرمائے اور ان کی جھولی خوشیوں سے بھر دے، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کاشدت سے انتظار رہے گا۔

**سیدہ عطیہ زاہرہ** لاہور سے، سب سے پہلے معذرت چاہوں گی کہ سالگرہ پر کہانی ارسال نہ کر سکی، دراصل میں کہانی لکھ ہی نہ پائی تھی۔ مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن ایم اے کے امتحانات دینا بھی ضروری تھے۔ سالگرہ نمبر بذریعہ ڈاک موصول ہوا، بہت اچھا پرچہ ہے، کہانیاں تو نہیں پڑھ پائی، لیکن خطوط سب کے پڑھے، سب سے پہلے انعم شہزادی صاحبہ، فلک زاہد، مریم مرتضیٰ، میرا عوان گل، مدثر بخاری، ان سب لوگوں کی میں شکر گزار ہوں کہ ان کی تعریف و تنقید نے ہی مجھے جلد جلد نئی کہانی لکھنے کا حوصلہ دیا، دراصل ڈر نے مجھے بہت ہمت دی ہے کہ آج میرا پہلا ناول مارکیٹ میں ”سلگتی دھوپ کے صحرا“ کے نام سے موجود ہے۔ دوسرا میں لکھ رہی ہوں۔ آپ سب دوستوں سے التماس ہے کہ آپ میرا یہ ناول ضرور پڑھیں اور اپنی رائے دیں۔ اور ہاں مریم مرتضیٰ صاحبہ Vampire کے متعلق شاید آپ نے میری تحریر نہیں دیکھی جو کہ مئی 2014ء کے ڈرڈائجسٹ میں ”ڈر یکولا کے سفر“ کے نام سے آئی تھی۔ اس میں تاریخ کے سارے جھروکوں میں جھانکا تھا میں نے اور اس کردار کی الف، ب واضح کر دی تھی، یونانی، جاپانی، ہندوستانی اور رومن دیومالائی داستانوں سے لے کر یورپ، مشرقی یورپ، امریکہ غرضیکہ ہر جگہ بکھرے ڈر یکولا کے نشانات کو جمع کر کے اس کی تصویر واضح کر دی تھی، پلیز آپ اس کو ضرور پڑھیں.....! میں دو کہانی اور ایک نظم ارسال کر رہی ہوں امید ہے پسند آئیں گی۔

☆ ☆ عطیہ صاحبہ: آپ نے خط لکھا اور کہانی بھیجی اس کے لئے بہت بہت شکریہ، ایک کہانی موصول ہوئی جو کہ لیٹ ملی اس لئے آئندہ شمارے میں ضرور شائع ہوگی، امید ہے مزید کہانیاں بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ Thanks۔

**صائمہ اختر** بہاولپور سے، السلام علیکم! ڈر سے منسلک تمام قارئین اسلاف اور رائٹرز کو دلی سلام، امید ہے سب خیر و عافیت سے ہونگے، میں ڈرڈائجسٹ کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ سب سے پہلے میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی وجہ سے میں ڈر میں آئی ہوں۔ بھائی خالد شاہان اور میرا کزن جو میرا بہت اچھا دوست بھی ہے اور اسی نے خط لکھنے کی ضد کی ہے۔ تو میں بھی آگئی، بس اب تو مجھے خطوط میں پیاری میٹھی سی دوست مصباح کریم میواتی، انعم شہزادی، ایمان فاطمہ، فرخندہ، سلمیٰ کریم، ندیم عباس، عثمان بلوچ اور قاسم رحمان کاشدت سے انتظار ہے، پلیز جلدی آئیں..... اپنے کزن کو نہیں کہوں گی کیونکہ وہ آل ریڈی موجود ہے۔ ایڈیٹر صاحب میں بہت ڈرتی ہوں، کیا میرا خط شائع کر کے میرا ڈر کچھ کم کر دیں گے۔ ستمبر کا شمارہ میرے کزن نے مجھے سینڈ کیا سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا..... اسٹوریز پر نظر پڑتے ہی زندہ صدیاں پڑھنے لگی جو کہ اچھی لگی۔ پھر ناگ بھون عجیب سا نام لگا تو پڑھنے بیٹھ گئی۔ ارے واہ بھائی، واہ..... خالد شاہان آپ تو سب سے بازی لے گئے، اتنی اچھی اسٹوری میں نے کبھی نہیں پڑھی، پورے ایک ہفتے ذہن پر سوار رہی، اب میری خواہش ہے کہ خالد شاہان کی کوئی قسط دار اسٹوری شائع ہونی چاہئے اور پھر ایس امتیاز احمد کراچی سے آئیڈ لائے زبردست تھی۔ انگارے بھی اچھی تھی۔ میری دعا ہے کہ ڈرڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔



☆ ☆ صائمہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم خط لکھنے اور قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے دیری دیری تھینکس، امید ہے آئندہ بھی آپ ہر ماہ خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔ خالد شاہان کی قسط وار کہانی کی تیاری ہو رہی ہے۔ بس دعا کریں۔ شکریہ۔

**ایس امتیاز احمد** کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! بڑی انتظار کے بعد ”ساگرہ نمبر“ ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ہم سب کے لئے ایک اعزاز ہے کہ ”ڈرڈائجسٹ“ نے شاندار کامیابی کے 15 سال مکمل کر لئے ہیں۔ دعا ہے کہ اسی طرح کامیابی سے یہ سفر جاری و ساری رہے۔ آتے ہیں ”ساگرہ نمبر“ کے تجزیہ کے ساتھ۔ ٹائٹل پر حسینہ خنجر کے ساتھ خوف و دہشت کا شکار ہے تو جناب موت سامنے دیکھ کر تو اچھے اچھوں کا..... ”قرآن کی باتیں“ ہم سب کے لئے مشعل راہ..... ”خطوط“ ”ڈر“ کے خوب صورت ویوز کے خوبصورت دل موہ لینے والے ”سندیسے“ جواب نہیں محبت اور خلوص کا حسین امتزاج۔ ”نحست زدہ“ واقعی انسان کے سوچ کے برخلاف خوبصورت تحریر ”عمران قریشی“ کوئٹہ سے لائے زبردست عمران جی! ”ساگرہ مبارک“ ناصر محمود فرہاد فیصل آباد کی ساگرہ پر دل گرفتہ تحریر، ناصر صاحب آپ اچھا لکھ رہے ہیں تھوڑی سی کمزوری اگر دور ہو جائے تحریر میں تو کیا بات ہے..... ”زندہ روح“ رضوان علی سومرو کراچی سے خوب صورت اسٹوری لائے، ارے دل کے ہاتھوں تو اچھے اچھے مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ اسٹوری کا نام اگر تبدیل کر دیتے تو..... 2 ماہ قبل ہم نے ”زندہ روح“ کے نام سے ایک ترجمہ لکھا تھا!..... بہر حال اچھا لگا..... ”پراسرار دھند کا“ اگا تھا کرشی کی ڈرامائی اسٹوری کا خوب صورت ترجمہ ”ایس امتیاز احمد“ کے قلم سے یعنی ہماری اپنی کاوش اور آپ سب نے بتانا ہے آپ کو اسٹوری کیسی لگی، منتظر ہیں، آپ سب ویوز کے کمنٹ کے..... ”رولو کا“ پراسرار قوتوں کے مالک کی کرشمہ سازیاں بیسٹ رائٹر اے وحید کی سلسلہ وار ناولٹ 125 ویں قسط میں داخل ہو گئی ہے نہایت اثر انگیزی کے ساتھ کیا بات ہے۔ اے وحید صاحب۔ ”فرشتہ اجل“ مدثر بخاری، شہر سلطان سے، سسپنس اور ہارر سے بھرپور، اچھا لکھ رہے ہیں آپ مگر تھوڑی سی مزید محنت آپ کی اسٹوری کو چار چاند لگا سکتی تھی۔ ”گرداب“ عامر زمان عامر ”ڈیرہ اسماعیل خان“ سے خوبصورت تحریر لائے۔ عالموں کی بات پر عمل کرنے نوجوان کا دلچسپ شاخسانہ..... عامر صاحب بچوں کے رائٹرز بن سکتے ہیں کچھ بڑوں کے لئے بھی لکھتے نا! ”انوکھی وصیت“ عامر ملک راولپنڈی سے لائے..... بلیک میجک پر اثر انگیز تحریر، اسٹوری ذرا سی طویل ہو جاتی تو..... ویسے خوب لکھتے ہیں، عامر جی! ”زندہ صدیاں“ ایم اے راحت کا خوب صورت ناولٹ صدیوں پر محیط سوچ کے درپے کھولتی خوب صورت تحریر قسط نمبر 13 میں داخل ہو گئی ہے۔ ایم اے راحت صاحب ویلڈن، آپ واقعی استاد ہیں ہم جیسوں کے ہم نے آپ جیسے عظیم رائٹرز سے ہی لکھنا سیکھا ہے۔ ”خونی موبائل“ طارق محمود، کامراں کلاں انک سے دلچسپ تحریر لائے۔ طارق صاحب! آپ نے بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ عنوان بچوں والا ہے، تھوڑی سی محنت مزید کر لیتے۔ ”حیران کن“ ساجدہ راجہ ہندواں سرگودھا ساجدہ صاحبہ نوڈاؤٹ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مگر ساگرہ نمبر کے لئے کوئی خوب صورت سی اسٹوری تخلیق کر تیں آپ، آپ کی اسٹوری میں ایسی چاشنی رہ گئی امید ہے Next Month اچھی تحریر دیں گی۔ ”کرشمہ سازیاں“ این اے کاوش سلاٹوالی، سرگودھا حرص و لالچ انسان کو کس طرح برباد کرتی ہے۔ کاوش صاحب نے بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ جواب نہیں آپ کا، میں بھی یہی کہتا ہوں تحریر کا کوئی مقصد ہو اور وہ راستہ دکھانے کی مترادف ہو۔ کاوش صاحب، کیا بات ہے زبردست..... ”دھڑکتا دل“ فلک زاہد لاہور سے لائیں، فلک جی! آپ اچھا لکھ رہی ہیں اور لکھتی رہیں۔ یہ ”ڈرڈائجسٹ“ ہے۔ سسپنس، ہارر اور خوفناک تحریر کے لئے ”یہ رومانوی نام اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی اگلی اسٹوری کے منتظر ہیں۔ امید ہے آپ ایک خوب صورت اسٹوری دیں گی۔ گڈ..... ”انگارے“ شہزادہ چاند زیب عباسی“ ایڈوینچر، سسپنس، خوف اور ناقابل یقین واقعات سے خوب صورت اسٹوری اپنے قسط نمبر 2 میں داخل ہو گئی ہے، شہزادہ جی! بہت خوب لکھ رہے ہیں آپ، اب تو آپ نے بھی اپنا ویوز بنالیا ہے ہمیں، جواب نہیں آپ کا! اگلی قسط کے منتظر ہیں..... ”آتش حسد“ طاہرہ آصف ساہیوال سے خوب صورت اور فکر انگیز اسٹوری لائیں۔ بعض اسٹوری واقعی دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے بھی ایک اچھی بلکہ بہت اچھی کوشش کی ہے۔ ”بھیا نک موت“ پشاور سے عثمان غنی کی خوفناک اسٹوری جنونی خواہشات کے تحت دوسروں کو اذیت دینے والے خود ہی اذیت انگیز موت کا شکار ہوتے ہیں۔ دل و دماغ کا احاطہ کرتی دلچسپ اسٹوری، عثمان صاحب آپ تو بہت چھا لکھنے لگے ہیں۔ گڈ! ”قوس قزح“ ڈر کے ویوز کے دلفریب اشعار اچھے لگے۔ ”غزلیں“ ڈرڈائجسٹ کے خوب صورت ویوز کی خوب صورت غزلیں، ہم سب کے لئے آؤ کے کچھ گنگنا لیں ذرا..... ”خون آشام“ خالد شاہان لوہار، صادق آباد سے انسانی



سوچوں سے ماورا اسٹوری لے کر آئے۔ خوب صورت تحریر اگر تھوڑی طوالت اختیار کر لیتی تو کیا بات تھی خالد جی! ”تار عنکبوت“  
ضرغام محمود کراچی سے لائے، بالکل صحیح قبر بھی ایک علم نامعلوم ہے۔ ڈر کے آخری صفحات پر ایک دل میں اتر جانے والی تحریر ضرغام  
صاحب جواب نہیں پھر بھی کہیں گے کہ خدا کرے اور ہوز در قلم زیادہ۔ تو جناب یہ تھا ماہ اکتوبر کے ساگرہ نمبر پر تجزیہ آپ کی رائے کے  
منتظر ہیں۔۔۔۔۔ تمام خوب صورت لکھنے، پڑھنے والوں دو یوزر کو دعا سلام، پلیز اپنا بہت بہت خیال رکھئے گا!

☆☆ امتیاز صاحب: ویری ویری ٹھیکس کہ آپ نے قلبی لگاؤ سے لکھ کر تجزیہ بھیجا۔ آئندہ ماہ بھی تجزیہ کا انتظار رہے گا۔

**ریاض حسین قمر** منگلا ڈیم سے، لائق صدا احترام جناب مدیر صاحب سلام مسنون! خوب صورت ٹائٹل والا ڈرڈائجسٹ کا  
ساگرہ نمبر پیش نذر ہے۔ قرآن کی باتیں ایمانوں کو تازہ کرنے والا سیکشن ہے۔ یہ سب باتیں اس جہاں اور اس جہان کے لئے فائدہ  
مند ہیں شرط عمل کرنے کی ہے۔ اس دفعہ آپ نے خطوط سے پہلے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار نہیں فرمایا بہت کی محسوس ہوئی۔ خطوط میں  
سب قارئین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ سب دوست بڑی اپنائیت سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا خیال کرتے ہوئے  
خطوط ارسال کرتے ہیں۔ رب کریم اس الفت و محبت کو قائم دائم رکھے آمین۔ کہانیوں کا انتخاب حسب سابق خوب ہے۔ قوس قزح  
میں تمام منتخب کلام خوب رہے، اس میں جناب حکیم خان حکیم کا کلام بہت پسند آیا، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو، میری ایک تجویز ہے  
قوس قزح کی ابتدا احمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے کی جائے۔ میری شعراء کرام سے گزارش ہے کہ وہ اپنا حمد یہ اور نعتیہ کلام بھی  
ادارے کو ارسال فرمایا کریں۔ شکر الحمد للہ، کراچی کے حالات جناب جنرل راحیل شریف صاحب کی بے لوث کوششوں سے بہت حد  
تک ٹھیک ہو گئے ہیں، لیکن ایک خبر سن کر پھر پریشانی سی لاحق ہو گئی ہے کہ خود غرضوں نے پھر تاجروں کو بھتے کی پرچیاں سنگین دھکیوں  
کے اتھ بھجی ہیں۔ مدیر محترم کیا دوسروں کا حق مارنے والے خواہ وہ بھتہ خور ہوں یا ڈاکو مسلمانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ دیکھیں  
مسلمان ہونا تو بہت بڑی بات، مسلمان ہونا تو انسانیت کی معراج ہے۔ ”دی بیسٹ آف دی مین آرسنلر“ لیکن جو کچھ ہم کر رہے ہیں  
وہ ہمیں مسلمان ہونا تو دور کی بات ہمیں انسانیت کے زمرے سے بھی خارج کر رہا ہے۔ غلط کرنے والوں کو خدا سنبھلنے کی توفیق بخشے اور  
ان میں صراط مستقیم پر چلنے کا جذبہ اور ولولہ پیدا فرمائے تاکہ ملک اور قوم ان کے شر سے محفوظ ہو سکے۔ آمین۔

☆☆ ریاض صاحب: ہمارے ملک میں جتنا بھی غلط ہو رہا ہے یہ سب مسلمانوں کے ہاتھ سے ہی ہو رہا ہے، کاش! کہ غلط کرنے  
والے سنجیدگی سے غور کریں، اپنے قول و فعل پر تو ہمارا ملک خوشیوں کا ہوادارہ بن جائے۔ آپ کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔

**مہر پرویز دولو** میاں چنوں سے، سلام مسنون، محبتوں کے سیر ڈر سے متعارف کرانے کا سہرا جناب عامر زمان عامر کے  
سر ہے۔ جس ہستی نے ڈر کو اسٹیل لاہور اخبار مارکیٹ سے خرید کر میرے حوالے کیا۔ میرے اس محسن کا نام جناب عبدالغفار عابد ہے یہ  
ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ تھوڑا لکھتے ہیں لیکن معیاری اور با مقصد تحریروں کے لکھاری ہیں۔ ”ڈر“ سے ملاقات کروا کر مجھ  
جیسے معمولی پڑھے لکھے طالب علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ساگرہ نمبر میرے سامنے محبتوں کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔ سرورق کی  
حسینہ سے ڈرنے کے بجائے اس سے دل پشوری کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ انم شہزادی کا خط مفکرانہ سوچ کا عکاس تھا۔ مریم مرتضیٰ اور  
مسن عزیز کے خط پسند آئے، ساگرہ عام سی کہانی تھی، زندہ روح رضوان سومرو کی لا جواب تحریر تھی۔ ”فرشتہ اجل“ مدثر بخاری کی  
بہترین سبق آموز اور آخرت سنوارنے والی تحریر تھی۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عامر ملک کی ”انوکھی نصیحت“ بھی خوب نصیحت تھی  
گناہوں کے کفارے کی، حیران کن، گرداب، انگارے، آتش حسد، خون آشام، تار عنکبوت اچھی تحریریں تھیں۔ قوس قزح اور غزل  
میرے پسندیدہ کالم ہیں۔

☆☆ مہر پرویز صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں دیکھ کر یہ قبول کریں کہ آپ آئندہ ماہ خط بھیجا کریں گے، کہانیوں کی تعریف کے لئے  
شکریہ۔

**محمد اسلم جاوید** فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، عید کے فوراً بعد شہر جانا  
نصیب ہوا جب بک اسٹال پر پہنچا تو ماہ اکتوبر 2015ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہو گئی، سرورق بہت ہی خوب صورت تھا، اندر  
جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہو گئی۔ ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ غزل اور شعر شائع کرنے کا  
بہت بہت شکریہ، آپ کے خلوص اور چاہتوں کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں، یہی جذبہ آپ کو خط تحریر پر مائل ہوتا ہے، اس بار قرآن کی



باتیں، خطو، شعر اور غزلیں خوب سے خوب تھیں، اس دفعہ ہر کہانی کا اپنا ایک الگ معیار تھا جن سے میں متاثر ہوا مثلاً انوکھی وصیت، سالگرہ مبارک، گرداب، انگارے، دھڑکتا دل، آتشِ حسد ان تمام قلم کاروں کو میری جانب سے مبارک کہنا۔ غزل ارسال خدمت ہے۔ شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆☆ السلام صاحب: آپ جس خلوص سے ہر ماہ خط بھیجے ہیں آپ کی محبت ڈرڈا بجسٹ سے قابل دید ہے اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔

**فرحان احمد نصیب** کراچی سے، سب سے پہلے ڈرکی پوری ٹیم اور ادب کی اس بے آواز دنیا کو بے بہا تصانیف سے آراستہ، پیراستہ بنانے والے پیارے رائٹر برادران، قدردان، قارئین کو میرا پیار، محبت اور خلوص بھر اسلام قبول ہو۔ کئی ماہ بعد حاضری دے رہا ہوں۔ وجہ بیان کر چکا ہوں کہ طویل علالت نے جان نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ اب نئی دواؤں سے طبیعت ذرا سنبھلی تو پیارے قارئین کی دعاؤں کو طلبگار بن کر پھر سے حاضر ہوں۔ اب کے جو گھر سے باہر نکلا تو ستمبر اور اکتوبر 2015ء کے ڈر خرید لایا۔ سالگرہ نمبر ابھی پڑھا نہیں، البتہ ستمبر کے متعلق تھوڑی سی رائے پیش خدمت ہے۔ قرآن پاک کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل کو چھو گئیں، قوس قزح کی محفل بھی خوب رہی، سلسلہ وار کہانیاں نہیں پڑھتا۔ دیگر کہانیوں میں سب سے بہترین پیا سحر کی ”اندھیری رات“ لگی۔ مختصر تھی پر نڈر عسکری جوان دل میں اتر گیا۔ ویلڈن پیا، شکیل نیازی کی ”ہوائی مخلوق“ رضوان علی سومرد کی ”تصویر کا قیدی“ منعم اصغر کی ”خطرناک سائے“ احسان سحر کی ”سائنسی حادثہ“ بھی بہت پسند آئیں۔ امتیاز سر، خالد شاہان بھائی، سیدہ عطیہ زاہرہ اور راشد نذیر بھائی کی کہانیوں کے کیا ہی کہنے۔ یہ سب نام ”ڈر“ کی شان ہیں۔ (بلاشبہ) آخر میں میری مکمل صحت یابی کے لئے ایک بار پھر دعاؤں کی درخواست۔

☆☆☆ فرحان صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور آپ کو جلد کلی صحت عطا کرے۔ نئی کہانی کا انتظار رہے گا۔ شیدا والا پرچہ جلد آپ کو مل جائے گا۔ اللہ حافظ۔

**اسد اللہ بھٹی** بھکر سے، السلام علیکم! اکتوبر کا شمار سالگرہ نمبر جلد مل گیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جس سے دل کو کافی حد تک سکون پہنچا، اگلا صفحہ فہرست کا تھا، اپنے پیارے رائٹر محمد خالد شاہان کی کہانی خون آشام دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی تار عنکبوت ضرغام محمود کی تھی۔ خالد شاہان کی بھی Best تھی۔ انگارے شہزادہ چاند زیب عباس ویری ٹائس پہلی قسط ایڈوینچر تو دوسری میں تھوڑا تھوڑا sex تھا۔ اگلی قسط کا انتظار، رولو کا اے وحید..... پہلے کی طرح روپ بدلتی کہانی، زندہ صدیاں ایم اے راحت زبردست تھی، باقی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ کچھ کہانیاں ارسال خدمت ہیں پڑھ کر ضرور بتائیے گا۔

☆☆☆ اسد اللہ صاحب: کہانی لکھتے رہیں ایک دن آپ بھی لکھاری بن جائیں گے۔ دل برداشتہ ہونا ٹھیک نہیں۔ ڈر کی کہانیوں پر غور کریں اور کہانی لکھا کریں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

**ابو ہریرہ بلوچ** بہاولنگر سے، ڈر کی بزم سے منسلک تمام قاری قلم کار اور اسٹاف کو السلام علیکم! ارسال سے میری وابستگی کو تقریباً دو سال کا طویل عرصہ بیت چکا لیکن میں ممنون ہوں۔ پوری ٹیم کا جنہوں نے میری بھیجی ہر چیز کو شرف قبولیت کا درجہ دیتے ہوئے جگہ دی۔ یہ میرے لئے باعثِ فخر کی بات ہے کہ میری کہانی فردری میں ڈر کے اوراق کی زینت بن چکی ہے۔ ایک کہانی بعنوان مظلوم روح ہے جو زیرِ تحریر ہے جلدی روانہ کر دوں گا۔ اب اگر اکتوبر 2015ء کے سالگرہ نمبر پر تبصرے کی بات کی جائے تو جناب پورا ناول رنگ رنگ کی تحاریر سے مزین تھا ہر ایک نے خوب محنت کی جن کا شراعت کی صورت مل چکا۔ سب سے پہلے نامور قلم کار عمران قریشی کی تحریر نحوست زدہ پڑھی۔ ویلڈن۔ ایس امتیاز احمد پر اسرار دھندلکا لے کر آئے اور چھا گئے۔ خالد شاہان اس دفعہ خون آشام کے ساتھ محفل میں براجمان نظر آئے، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ مستقل ہو رہے ہیں، اچھا لکھا، عامر زمان عامر کی گرداب، عثمان غنی بھیا تک موت، طاہرہ آصف آتشِ حسد، عامر ملک انوکھی وصیت بھی عمدہ کہانیاں رہیں۔ قسط وار میں رولو کا، زندہ صدیاں، انگارے بھی خوب جاری ہیں۔ غزل بھیج رہا ہوں، قبولیت کی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔

☆☆☆ ابو ہریرہ صاحب: خوش ہو جائیے، کہانی ”بھیا تک انجام“ شامل اشاعت ہے، اب جلدی سے کوئی نئی کہانی بھیج دیں، آئندہ ماہ خط لکھنا بھی بھولنے کا نہیں۔



**محسن عزیز حلیم** کوٹھاکلاں سے، اکتوبر کا سالگرہ نمبر 23 تاریخ کو مل گیا، ورک گردانی کی تو اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی، قرآن کی باتیں ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی تھیں، ستمبر کا مہینہ تو میرے لئے بہت ہی کٹھن تھا، کیونکہ پہلے تو میرے پاؤں پر سانپ نے سونگھ لیا، اس سے جان بچی تو جنات کا سایہ ہو گیا، خدا خدا کر کے وقتی طور پر جان چھوٹ گئی آگے کا پتہ نہیں، کہانیوں کی محفل میں دھڑکتا دل جو کہ فلک زاہد نے لکھی پڑھ کر سچ مچ دل دھڑکا تھا، Very Best حیران کن ساجدہ آپی نے لکھی، بہت خوب آپ پچھلے چند ماہ کہاں تھیں..... کرشمہ سازیاں ملک این اسے کاوش آپ کی اسٹوری نے اس بار میرے دل میں جگہ بنالی، آتش حسد طاہرہ باجی کی بہت اچھی تھی۔ تار عنکبوت ضرغام محمود نے بہت محنت سے لکھی ہے، باقی سب بھی بہت اچھی تھیں۔ قسط وار کہانیوں میں انگارے بہت اچھی ہے، زندہ صدیاں میں ڈر کا کوئی عنصر نہیں، رولو کا اچھی جاری ہے، قوس قزہ میں سب کے کلام پسند آئے، پلیز میری کہانی کا کچھ کیجئے گا، میری طرف سے ندیم بلوچ ٹیلر ماسٹر ملک نوید شوکت ذیشان بھٹی کو بہت بہت سلام، خط کمپلیٹ شائع کیجئے گا، آخر میں ڈر کے لئے ڈھیر ساری دعائیں اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆ ☆ محسن صاحب: آپ گھبرائیں نہیں، عنقریب آپ کی کہانی بھی بہت جلد شائع ہوگی، دیسے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے دیری دیری ٹھیکرس۔

**محمد علی چغتائی** خیر پور نامیوالی سے، سلام مسنون، امید واثق ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، تازہ شمارہ جس کی پیشانی پر سالگرہ نمبر تحریر ہے ہاتھوں میں ہے اور پہلی تین کہانیاں نظر سے ہو کر دماغ تک پہنچ کر دل میں گھر کر چکی ہیں، اگا تھا کرٹی کا ترجمہ حکایت نامہ بہت ہی خوب تھا۔ عمران قریشی صاحب نے نحوست زدہ پر خوب محنت کی ہے۔ بہر حال اچھی کاوش تھی باقی جریدہ ابھی باقی ہے۔ دیگر احوال ہے کہ میرے والد گرامی عید کے تیسرے روز قضائے الہی سے وفات پا گئے ہیں ادارہ ہذا اتمام قارئین و مصنفین سے دعائے مغفرت برائے والد گرامی تن کی عاجزانہ التماس ہے۔ رولو کا ابھی پڑھی نہیں ہے مگر مجھے یقین کامل ہے کہ یہ قسط بھی حسب سابق بہترین ہوگی رولو کا میں ایک زبردست انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ہندوانہ کلچر کے بارے میں کافی معلومات ہوتی ہیں میں بہت متاثر ہوں۔ آئندہ ماہ بشرط حیات حاضری دوں گا، اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔

☆ ☆ محمد علی صاحب: ہماری اور قارئین بلکہ تمام اہل ذر کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت کرے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سمیت تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کر کے خوشیوں سے نوازے۔

**عرفان اللہ** جہانگیرہ سے، السلام علیکم! امید واثق ہے کہ تمام قارئین و راسٹر صاحبان خیر و خیریت سے ہونگے۔ ایک عرصہ بعد دوبارہ اپنے محبوب ڈائجسٹ میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، امید ہے پذیرائی ملے گی۔ بہر حال اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ ملا جو کہ سالگرہ نمبر تھا۔ سالگرہ نمبر میں سرکہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ہمیں جو کہانی سب سے زیادہ پسند آئی وہ ضرغام محمود کی کہانی تار عنکبوت تھی۔ دوسرے نمبر پر ایم اے راحت کی زندہ صدیاں اور آخر میں عباسی صاحب کی انگارے تھی۔ خط کے ہمراہ ایک کہانی بنام ”آتش انتقام“ بھیج رہا ہوں جو ہم نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ اگر ڈر ڈائجسٹ کے مطابق ہو تو شائع کر کے بندے کو مشکور فرمائیں۔

☆ ☆ عرفان اللہ صاحب: دوبارہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو بہت جلد شامل اشاعت ہوگی، امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا تجزیہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں۔

**محمد قاسم رحمان** ہری پور سے، السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں تین ماہ کی غیر حاضری کی معذرت چاہتا ہوں، بیماری نے ایسا جکڑا کہ ڈر کے لئے کچھ لکھ ہی نہ پایا۔ تاہم مطالعہ جاری رکھا۔ لیکن مجھے ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ نہیں ملا، میں نے ایک ایک بک اشال چھان مارا لیکن ندارد، باقی اگست اور اکتوبر کے ڈر پڑھ لئے ہیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ ڈر دن بدن ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے، لیکن ایڈیٹر صاحب آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، پانچ ماہ سے آپ کے پاس میری دو کہانیاں ”کالی طاقتوں کا انتظار“ اور ”پراسرار درخت“ پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔

☆ ☆ قاسم صاحب: چلئے توجہ دی اور کہانی جلوہ گر ہوگئی۔ اب تو خوش ہیں ناں اور اس خوشی میں شمارے کا تجزیہ ارسال کرنا بھولنا

مت۔ Thanks۔



**امام بخش مجاہد** جعفر آباد سے، السلام علیکم! عرض ہے کہ ماہ اکتوبر کا تازہ شمارہ ڈرڈائجسٹ میرے سامنے ہے، خوب صورت ٹائٹل اور اسلامی صفحہ پڑھ کر ایمان کو تازہ کیا۔ خطوطوں سے فارغ ہو کر کہانیوں کی بستی میں جھانک کر دیکھا۔ تو سب سے پہلے عمران قریشی صاحب کو پڑھنے کے لئے دل نے چاہا تو ماشاء اللہ (نحست زدہ) نے زیادہ متاثر کیا، عمران بھائی میرے فیورٹ رائٹر ہیں، ناصر محمود فرہاد (ساگرہ مبارک) بھی بہترین تھی۔ رضوان علی سومرو (زندہ روح) قرآنی آیات کا ایک معجزہ دل چھو لینے والی کہانی تھی۔ ایس امتیاز احمد (پراسرار دھندلکا) سبق آموز کہانی ثابت ہوئی۔ مدثر بخاری (فرشتہ اجل) خوفناک چیخوں سے بھری ہوئی کہانی پڑھنے کو ملی۔ عامر زمان عامر (گرداب) عامر بھائی آپ پہلے یہ بتائیں کہ بورے والا سے ڈیرہ اسماعیل خان یہ کیسے ہوا۔ گرداب معاشرے کی عکاسی بنی۔ عامر ملک (انوکھی وصیت) نے ہمیں زیادہ ہی وصیت سے نوازا۔ ساحل ابودا چھ تھیں تخلیق کار ہیں۔ اب اجازت دیں پھر ملیں گے۔

☆☆ امام بخش صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویکم خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، قوی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اپنا نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

**عابد اسلم** سمندری سے، کافی عرصہ سے ڈر پڑھ رہا ہوں، یہ کافی معیاری اور اچھا رسالہ ہے، خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میری ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ ”سوریا کی روح“ یہ ڈائجسٹ مجھ سے گم ہو چکا ہے۔ مجھے اس رسالے کی بہت ضرورت ہے اگر آپ مجھے یہ ڈائجسٹ بھیج دیں تو آپ کی بہت نوازش ہوگی۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

☆☆ عابد صاحب: خط لکھنے اور پرچے کی تعریف کے لئے شکریہ، محترم یہ تو بتائیں کہ کہانی کس سن اور ماہ میں چھپی تھی، امید ہے جواب ضرور دیں گے۔

**یاسر وکی** دیپالپور سے، سب قارئین کو محبت بھر اسلام قبول ہو، ستمبر کا ڈرڈائجسٹ ملا پڑھ کر بہت مزا آیا، کہانیوں میں اندھیری رات، رولوکا، تصویر کا قیدی، مار گنج، خونی واردات اچھی تھیں، پیارے لکھاری دوستو! ڈرڈائجسٹ کی شان آپ لوگ ہیں، اللہ آپ کو ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے اور ادارے سے میری ایک گزارش ہے کہ سرجی اگر اجازت ہو تو ہم بھی اپنی اسٹوری لے کر آپ کی نگری میں آسکتے ہیں، اگر آپ کی اجازت ہوگی تو ہم بھی اسٹوری کی طرف دھیان دیں گے اور ہاں اگر قریبی شمارے میں اسٹوری کو جگہ ملتی ہے تو بھیج دیتا ہوں لگا دیں گے، نوازش ہوگی۔

☆☆ یاسر صاحب: کہانیوں کی تعریف اور نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں، جناب آپ بھد شوق کہانی بھیج دیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

**مدثر بخاری** شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! خیریت مسنون! ڈھیروں خوشیوں کے لئے ڈھیروں دعاؤں کا تحفہ قبول فرمائیں.....! ساگرہ نمبر کا خوبصورت ٹائٹل سے ہی ڈر 18 ستمبر کو موصول ہوا۔ خوب صورت حسینہ کی خوفزدہ آنکھیں اور ڈارک براؤن زلفیں، کانوں والی تلوار، لمبے ناخنوں والا ہاتھ اور سرخ کتاب..... آمیزنگ تھا..... بھئی اس دفعہ ٹائٹل تو دل کو بھا گیا..... خطوط زبردست تھے۔ ضرغام بھائی اسپتال میں ٹائیفائیڈ کا علاج کر رہے تھے۔ امید ہے ٹائیفائیڈ نے ان کی جان چھوڑ دی ہوگی، ان کی تار عنکبوت بہترین رہی، اچھا لکھتے ہیں ضرغام صاحب..... ایس امتیاز ایک مرتبہ پھر پرانی روش پر آ گئے، جناب کچھ عرصہ تک تو خوب تبصرہ فرماتے رہے، ملک این اے کاوش نے خطوط میں جان ڈال دی، البتہ جب ان کی کرشمہ سازیاں پڑھیں تو جان نکال بھی لی، کاوش صاحب کی کاوشیں ڈر کے صفحات پر خوب سے خوب تر ہیں ویلڈن..... خالد شاہان نے ڈر کے تمام نمبرز کو Family سے Relate کیا، واقعی ہم سب ایک family کی طرح ہیں، دکھ سکھ اور تمام جذباتوں کو دل سے سمجھنے والے۔ خالد صاحب کی خون آشام پسند آئی..... خدا مزید زور قلم دے۔ ویسے تمام کہانیاں خوب سے خوب تر تھیں، ایک مرتبہ پھر سب کے لئے دعا۔

☆☆ مدثر صاحب: ”موت کا تعاقب“ جلوہ گر ہے، اب دیکھتے ہیں کہ آئندہ ماہ اور کیا ہونے والا ہے، خوش رہیں اور اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بھی شامل کریں، دکھوں کو بانٹیں اور کر جاؤ کچھ کام جہاں میں کہ بس رہ جائے نام جہاں میں، آئندہ ماہ پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

☆☆



# خوشبو کا شاخسانہ

ایس حبیب خان - کراچی

ایک نادیدہ جوان وجود درخت پر اپنی مستی میں محو خواب تھا کہ اچانک اس کی ناک کے نتھنوں میں ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا خوشبو کا جھونکا آیا تو اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی تو پھر.....

بڑوں کی باتیں چھوٹوں کے لئے سرمایہ حیات ہیں، پڑھ کر دیکھیں حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے

خوشبو نہیں لگانی چاہئے اور نہ ہی پھول پہننے چاہئیں۔“ مگر پھر بھی زنیہ موقع ملتے ہی اپنے شوق کو پورا ضرور کرتی۔ زنیہ بھاگتی ہوئی دادو کے پاس آئی۔

”اے لڑکی کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے؟“ دادو نے اس کی تیزی پر کہا۔

”وہ دادو آپ بلا رہی تھیں ناں۔“ زنیہ نے کہا۔ ”ہاں یاد آیا تمہاری سہیلی کی امی نے قرآن پاک کا کہا تھا وہ انہیں دے دینا۔“ دادو نے کہا۔ ”جی اچھا!“ زنیہ نے کہا۔

”زونی بیٹا بہت دیر مت کرنا واپسی پر!“ امی نے کہا۔

”امی! مہندی تو شروع ہی لیٹ ہوتی ہے۔“ زنیہ نے آگے آتے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”مہندی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ بارات میں چلی جانا۔“ دادو نے کہا۔

”دادو! میری بیسٹ فرینڈ ہے رائیل اس کے تو ہر فنکشن میں جاؤں گی۔“ زنیہ نے جلدی سے کہا اسے پتہ تھا کہ اگر ابو کو خبر ہوگئی کہ دادو نے جانے سے منع کیا تھا پھر اس کا جانا پکا کینسل ہو جانا تھا۔ ”ٹھیک ہے! جانا ہے

**زنیہ** نہا کر باہر آئی اور اپنے لمبے لائٹ براؤن بالوں کو تولیے سے خشک کرنے لگی، بال خشک کر کے اس نے تولیہ بیڈ پر پھینکا اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پرفیوم کو اٹھایا، کیپ کھولا اور ہاتھ کے پشت پر اسپرے کر کے اسے ناک کے قریب لا کر سونگھنے لگی۔ زنیہ کو خوشبوؤں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ شاید ہی کوئی پرفیوم ہوگا جو اس کی کلکیشن میں نہ تھا۔ مگر اس کے عشق اور اس کے بیچ اس کی دادو ظالم سماج بنی رہتی تھیں۔ ”زونی!“ دادو کی آواز پر زنیہ کو کرنٹ لگا اور اس نے تیزی سے پرفیوم کی بوتل بند کر کے رکھ دی اور واش بیسن میں جا کر ہاتھ دھونے لگی۔

”زونی بیٹا!“ دادو نے دوبارہ آواز دی۔

”جی دادو ابھی آئی۔“ اس نے کہا اور سر پر دوپٹہ اوڑھ کر کمرے سے نکل گئی۔ زنیہ گھر میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی تھی اس سے بڑا ایک بھائی معاذ اور بہن زارا تھی۔ معصوم سی پیاری سی زنیہ کو گورا چٹا رنگ اور بھورے بال اور آنکھوں کی وجہ سے سب مانو کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اپنے خوشبو سے لگاؤ کی وجہ سے اکثر اسے دادو سے باتیں سننا پڑتی تھیں۔

دادو کا کہنا تھا۔ ”جوان خاص کر کنواری لڑکیوں کو







تو وقت سے گھر واپس آ جانا۔“ دادو نے کہا تو زنیہ نے سکون کا سانس لیا۔

”بیٹا کپڑے استری کر لئے؟“ امی نے پوچھا۔

”امی وہ تو رات کو ہی کر لئے تھے، یہاں تو لائٹ آنا خواب ہو گیا ہے۔“ زنیہ نے کہا تو دادو بھی بجلی والوں کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔ امی اور دادو کو چھوڑ کر زنیہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر اپنی جیولری پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے تو کوئی بھی اچھا نہیں لگ رہا! زنیہ نے اپنے آپ سے کہا۔

”کیا اچھا نہیں لگ رہا؟“ زارا نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

یہ ”ایئر رنکس“ زنیہ نے کہا۔

”یاد آ یا زارا آپ۔“ اس نے اچھل کر کہا۔

”زارا الماری سے کچھ نکال رہی تھی۔“

اس نے رک کر کہا۔ ”آپی مجھے آپ اپنا کندن

والا سیٹ دے دیں، وہ میرے سوٹ کے ساتھ چل جائے گا۔“

اوکے! ابھی دیتی ہوں۔“ زارا آپی نے کہا اور جھٹ الماری سے سیٹ نکال کر اسے دے دیا۔ آپ کیا کر رہی ہیں آپی؟“ اس نے پوچھا۔

”اپنی شرٹ سلوانی ہے ناپ کی شرٹ نکال رہی تھی۔“

”آپی! مجھے سینڈوچز بنادیں۔“ زنیہ نے اپنی خوب صورت مخروطی انگلی میں انگلی پھینکتے ہوئے کہا۔

”ابھی بنا دیتی ہوں۔“ زارا بولی۔

”تھینکس آپی!“ زنیہ نے جلدی سے کہا۔ کچھ ہی دیر میں زارا نے سینڈوچز بنا کر بھیج دیئے۔

دھانی رنگ کے سوٹ میں اس کی رنگت اٹھ پڑ رہی تھی۔ معاذ باہر گاڑی میں بیٹھا ہارن بجا رہا تھا۔

”ابھی آئی!“ زنیہ نے جلدی سے کہا۔ اور نکلنے لگی۔

”زونی جلدی آنا بیٹا!“ امی نے تاکید کی تو زنیہ

گردن ہلانے لگی اور تیزی سے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

رائیل کے گھر پہنچ کر زنیہ جلدی سے گاڑی سے اتر کر

اندر جانے لگی۔ ”زونی!“ معاذ نے آواز دی تو وہ پلٹ کر آئی۔ ”جب آنا ہو تو دس منٹ پہلے کال کر دینا۔“ معاذ نے کہا۔

”اوکے بھائی!“ زونی نے کہا اور رائیل کے گھر چلی گئی۔

رائیل اپنے کمرے میں بیٹھی تھی زنیہ اس کے پاس جا کر اس سے لپٹ گئی۔ ”اب آئی ہے زونی کی بچی؟“ میں نے کہا تھا کہ دوپہر سے پہلے آ جانا!“ رائیل نے شکوہ کیا۔ ”دوپہر! میڈم دادو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے ابھی بھی آنے سے روک دیتیں۔“ زنیہ بولی۔

”اچھا چھوڑ ان سب باتوں کو تو مجھے اپنے پرفیومز کی ریج دکھا۔ گھر سے تو میں ایسے ہی آ گئی۔ تجھے تو پتہ ہے ناں۔ خوشبو کے بغیر میں رہ نہیں سکتی اور دادو مجھے خوشبو لگا کر آنے نہیں دیتیں۔“ زنیہ نے سامنے لگے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہیں دیکھ لے۔“ رائیل نے کہا تو زنیہ پرفیومز دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ایک بوتل اٹھائی اور اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کر لیا۔ ”ہوں!“

”بس کر۔“ رائیل نے کہا کیونکہ زنیہ نے اس کے اوپر بھی اسپرے کرنا شروع کر دیا تھا۔ ”ارے بھئی آج تو زنیہ قیامت ڈھا کر چھوڑے گی۔“ رمشا ان کی دوست نے کہا۔

”کیسی ہو زونی بیٹا؟“ رائیل کی والدہ نے کمرے میں آ کر زونی سے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی!“ زنیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”چلو لڑکیوں! اب باہر آ جاؤ ڈھولکی شروع کر لو، لڑکے والے آ گئے ہیں اور زونی تم رائیل کو باہر لے آؤ۔“ رائیل کی والدہ نے کہا تو زنیہ اور رائیل کی کزنز اور دوستیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ سب رائیل کو لے کر باہر آ گئیں۔

مہندی کا انتظام چھت پر کیا گیا تھا۔ رائیل کو اسٹیج پر بیٹھا کر تمام لڑکیاں ڈھولکی لے کر بیٹھ گئیں۔ ”ذرا



ڈھونکی بجاؤ گوریوں.....“ زنیہ ڈھونکی پر تھاپ مارتی جا رہی تھی اور لڑکیاں زور زور سے گانے گارہی تھیں۔

زنیہ دھانی رنگ میں الگ ہی چمک رہی تھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی سب کی نگاہوں کا مرکز بنی زنیہ اس بات سے بالکل بے خبر اپنی دھن میں مگن ہنس رہی تھی کہ وہ یہاں موجود ان سب لوگوں کے علاوہ ”کسی ان دیکھی نگاہوں کے حصار میں آچکی تھی ایسا حصار جس سے نکلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔“

سامنے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک اندیکھا وجود آرام سے سو رہا تھا۔ نیند میں ہونے کے باوجود اس کے نتھنے انتہائی مسحور کن خوشبو کے ٹکرانے سے پھڑکنے لگے۔ اس نے نیند سے بوجھل اپنے پوٹوں کو تین، چار بار جھپکا اور پھر اس نے اپنی سرخ ڈوروں سے بھری نیند سے بھری گہری سبز ترچھی پتلی آنکھوں کو جنبش دے کر کھول دیا۔ پھر اس کے کان ہوا میں اونچے کھڑے ہو گئے، ایک کھٹکتی ہنسی ان سے ٹکرائی تھی جیسے کسی نے جلت رنگ کو چھیڑ دیا ہو، اس نے اپنے آپ کو کھینچ کر انگڑائی لی اور سیدھا ہو کر آواز کی سمت مڑ گیا، وہ ایک کے بعد ایک شاخ اتر کر نیچے آ رہا تھا اور پھر وہ پہلی شاخ پر آ کر رک گیا، اس کی نگاہ آواز کی سمت کا تعین کر چکی تھی اور وہ ایک جگہ ٹھہر گئی۔

دھانی رنگ میں ملبوس سرخ و سفید بھوری سی وہ حسین پیکرا اپنے گلاب کی پنکھو یوں جیسے لبوں سے گانے گارہی تھی۔ اس کے سنہری بالوں کی لٹیں ہوا سے بار بار رخسار چھو رہی تھیں۔ اس کا وجود خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ حسن کے اس نظارے میں کھو گیا تھا، کتنی دیر گزر گئی اور وہ بت بنا اسے تکتا رہا، وہ اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔ پر اس کی نگاہوں کا حصار ایک دم ٹوٹ گیا۔

وہ حسن پیکرا اس کی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر اپنی نگاہوں کو حرکت دی اور متلاشی انداز سے آگے بڑھنے لگا۔

”چلو بچیو! ابھی ڈھونکی اٹھالو، رسم شروع کرنی ہے، پھر بعد میں گانے گاتی رہنا۔“ رائیل کی پھپھو نے

کہا تو زنیہ اور باقی لڑکیاں کھڑی ہو گئیں، رسم شروع ہو گئی اور خواتین رائیل کو ابلن لگانے لگیں۔ زنیہ ایک طرف جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”چل ناں زونی! یہاں کیوں بیٹھ گئی؟“ رمشا بولی۔

”تو چلو میں ابھی آئی، ڈھول بجانے سے ہاتھ دکھ رہا ہے۔“ زنیہ نے کہا اس کا اتنا کہنا تھا کہ ایک طرف رکھا ڈھول کرسی سے نیچے گرا اور دو ٹکڑے ہو گیا، سب اسی طرف دیکھنے لگے۔ ”ارے! یہ ڈھول کیسے ٹوٹ گیا؟“ ایک عورت نے کہا۔ ”کچی لکڑی کا ہوگا۔“ دوسری نے رائے دی۔ پھر دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ ڈھول اتنا اہم نہ تھا کہ کوئی ایشو بنتا، رمشا وہاں سے جا چکی تھی، زنیہ اٹھنے لگی تو اس کی نگاہ اپنے برابر میں پڑے موتیا کے گجروں پر پڑی۔ زنیہ نے وہ گجرے اٹھالئے وہ انہیں ہاتھ میں پہننے ہی والی تھی کہ رائیل کی پھپھو آ گئیں۔ ”زنیہ بیٹا رمشا اور رائیل تمہیں بلارہی ہیں۔ ارے اتنے خوب صورت گجرے!“ انہوں نے زنیہ کے ہاتھ میں گجرے دیکھ کر کہا۔

”آئی آپ پہن لیں یہ میرے نہیں ہیں۔“ زنیہ بولی اور گجرے ان کی جانب بڑھائے۔ رائیل کی پھپھو نے وہ گجرے لے کر پہن لئے۔ ”تھینک یو بیٹا!“ انوں نے کہا اور زنیہ مسکراتی رائیل کے پاس چلی گئی۔

رسم چل رہی تھی ایک دم شور ہونے لگا۔ سب وہاں گئے تو وہاں عجیب ہی منظر گھر پر بچی لائیں جانے کیسے ٹوٹ کر گر گئیں ان کے نیچے رائیل کی پھپھو کھڑی تھیں وہ ان میں الجھ گئیں۔ ان کے دونوں ہاتھوں سے تار ٹکرائے اور انہیں زوردار جھٹکا لگا تو وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ سب ان کے پاس آ گئے اور انہیں نکالا وہ بچ تو گئیں مگر ان کے دونوں ہاتھ کلائی سے کہنیوں تک جھلس گئے۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا تقریب ختم کر دی گئی۔

زنیہ نے معاذ کوفون کر کے بلا لیا اور رائیل کو بتا کر گھر چلی گئی جب وہ گھر پہنچی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ گھر پہنچ کر جب دادو کو پتہ چلا کہ زونی خوشبوؤں



میں ڈوبی ہوئی ہے تو انہوں نے اس کی خوب کلاس لی، اب تو زونی کی ٹھیک ٹھاک شامت آگئی۔ ابو، امی اور دادو نے اس کو بہت ڈانٹا۔ ”زونی وقت دیکھا ہے تم نے؟ ضروری نہیں ہے کہ بڑوں کی بات کو رد کر کے ہر جگہ من مانی کی جائے، جانتی ہو کہ رات میں لڑکیوں کا یوں خوشبو لگانا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے! دشمن نہیں ہوں میں تمہاری؟“ دادو روہانسی ہو گئیں۔

”بہت بری بات ہے زونی جو تم نے اپنی دادو کی نافرمانی کی۔“ زنیہ کی والدہ نے خفگی سے کہا۔

زنیہ اس وقت شرمندگی سے زمین میں گڑی جارہی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی آن پڑا تھا۔ وہ دادو سے لپٹ گئی۔ ”دادو مجھے معاف کر دیں! یہ سراسر میری بدتمیزی، بے ادبی ہے کہ میں نے آپ کے کہنے کے باوجود یہ حرکت کی، میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ زنیہ کو سچ مچ اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ دادو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنیہ سے کمرے میں جانے کا کہا۔

زارا اور زنیہ کا ایک ہی کمرہ تھا زنیہ جب کمرے میں گئی تو زارا سوچکی تھی، زنیہ کو اپنے قدم منوں بھاری محسوس ہو رہے تھے۔

ان دیکھا بوجھ اس کے کاندھوں پر تھا ایک عجیب سی تھکن اسے اپنے وجود میں طاری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سر بے انتہا بھاری ہو رہا تھا۔ زنیہ بڑی مشکلوں سے بستر تک آئی اور دھپ سے گر گئی۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر اس کو اپنے وجود میں اٹھتی تپش کا احساس ہونے لگا وہ بستر پر لوٹنے لگی۔ لاتعداد انگارے اس کو اپنے وجود میں رقص کرتے محسوس ہونے لگے۔

ایک ان دیکھی آگ اس کے وجود کو کھلسا رہی تھی اس نے بے بسی سے گردن موڑی اور زارا کو آواز دینی چاہی زارا..... مگر اس کے ہونٹ آپس میں چپک گئے۔ خوف سے زنیہ کی آنکھیں پھٹنے لگیں ایک دم زنیہ کو اپنے اوپر اندھیرا آتا محسوس ہوا اور اس کی آنکھیں جلتے جلتے بند ہوتی چلی گئیں۔

صبح کے وقت ”زونی اٹھو! گیارہ بج رہے ہیں۔“ زارا نے زنیہ کو اٹھانے کے لئے ہاتھ لگایا تو وہ چونک گئی، زنیہ بھٹی کی طرح تپ رہی تھی اس کی گوری رنگت تانبے کی طرح ہو رہی تھی، ”زونی چندا!“ اس نے زنیہ کی دہکتی پیشانی کو چھوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ زنیہ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے، زارا نے گھر والوں کو بتایا تو سب آگئے۔ زارا اور معاذ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ واپس آ کر زنیہ دوا کھا کر سو گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا پھر وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ زنیہ کو ایک دم سے بے انتہا تپش محسوس ہونے لگی، وہ نیند میں تھی، مگر تپش سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سینے میں شرابور ہو چکی ہے۔

اس نے زنیہ کی پیشانی کو چھوا تو زنیہ کو آگ میں لپٹیں محسوس ہونے لگیں، اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے، اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری اور بولی۔ پ..... پانی..... پانی!!! وہ بمشکل بول پائی۔

وہ مڑی تو اس کے ہونٹوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لگا دیا گیا وہ پانی پی کر تنکے پر گر گئی۔

صبح زارا آئی تو زونی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ ایک ہی رات میں اس کی آنکھیں سیاہ حلقوں سے بچی ہوئی ملیں۔ ”زونی! یہ کیا حالت بنالی ہے؟ چلو اٹھو رانیل کا فون آیا ہے آج اس کی شادی ہے تمہاری بیسٹ فرینڈ کی۔“ زارا نے پیار سے کہا۔

مگر زنیہ نے صاف منع کر دیا اور بولی۔ ”میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے، میں نہیں جاؤں گی۔“

رانیل کی ناراضگی کی وجہ سے باقی گھر والے شادی میں چلے گئے صرف دادو اور زنیہ رہ گئیں۔ زنیہ دوا کھا کر لیٹ گئی اور دادو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

زنیہ کمرے میں لیٹی تھی کہ کسی نے دروازہ ٹاک کیا۔ ”ٹھک! ٹھک! ٹھک!“ زنیہ نے سوچا دادو کو کچھ ضرورت ہوگی وہ مشکل سے اٹھی اور دروازہ کھولا تو ایک



زور دار ہوا کے جھونکے نے اس کے بال بکھیر دیئے، زونی کو یہ یاد تک نہ تھا کہ زار نے اس کے بال باندھے تھے مگر وہ تو کھلے ہوئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے بستر پر آئی تو اسے ایک سایہ سا اپنے اوپر محسوس ہوا، اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ وہ بے اختیار بستر پر دراز ہوتی چلی گئی۔

کچھ تھا جو ایک تنی چادر کی طرح اس کے وجود پر چھا گیا تھا مگر وہ کیا تھا؟ یہ جاننے کے لئے وہ حواس میں نہ تھی۔

”زونی! یہ لو تمہارے لئے فروٹ چاٹ بنا کر لائی ہوں۔“ زار نے کمرے میں داخل ہو کر کہا مگر کمرہ خالی تھا۔ زار نے ٹرے ایک طرف رکھی اور زنیہ کو ڈھونڈنے لگی، اس نے سب جگہ دیکھ لیا مگر زنیہ نہ دکھائی دی پھر زار کا ذہن چھت کی طرف گیا، وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی مگر اوپر پہنچ کر آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ ٹھنک گئی۔ ”سامنے زنیہ بڑے سے لگے ہوئے جھولے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کے سنہری بال پھیلے ہوئے تھے اور ساری چھت خوشبو سے رچی ہوئی تھی جبکہ زنیہ کے اوپر سیاہ بادل جیسا اندھیرا سا ہو رہا تھا۔“ زار نے اپنی آنکھیں ملیں پھر دوبارہ دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ زار کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔ وہ جا کر زنیہ پر برس پڑی۔

”یہ کیا ہے زونی! دادو نے منع کیا تھا تا تمہیں اس طرح پر فیوم لگانے سے وہ بھی مغرب کے وقت!“ جواب میں زنیہ نے زار کو چند لمحے گھورا پھر اجنبی انداز سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”اٹھو یہاں سے اور نیچے چلو!“ زار نے اس کو اٹھایا، زنیہ اٹھ تو گئی مگر آگے نہ بڑھی۔ ”چلو اب۔“ زار نے پھر کہا، زنیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ”چلو زونی“ زار نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر کھینچا۔

جواب میں ایک تھپڑ زار کے پڑا اور وہ چکر کر رہ گئی۔ اذان کی آواز آئی تو زنیہ خود تیزی سے نیچے بھاگ گئی اور کمرے میں گھس گئی۔ زار اس کی حرکت پر حیران

پریشان نیچے آگئی مگر اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں۔

اگلے روز جب زونی واش روم میں تھی تو زار نے اس کے سارے پر فیوم اٹھائے اور انہیں لے جا کر باہر پھینک آئی۔ ”بہت بدتمیز ہو گئی ہو زونی! بڑوں کی عزت کرنا بھول گئی ہو، یہ ہی تمہاری سزا ہے!“ زار نے غصے سے کہا۔ پھر زار نے امی سے کہا کہ وہ نہانے جا رہی ہے۔ زار نے گرم اور ٹھنڈے پانی کو بیلنس کیا اور شاور کھول دیا پھر سر میں شیمپو لگانے کے لئے اس نے شاور بند کیا، بالوں میں شیمپو لگانے کے بعد زار نے شاور کھولا اور اس کے نیچے آکھڑی ہوئی اور اس کی چپٹیں نکل گئیں۔

اس کے پورے وجود پر پانی لاوے کی طرح برساتا پانی ابلنے کے حد تک کھول رہا تھا۔ زار کے جسم پر آبلے پڑ گئے تھے وہ مسلسل چیخ رہی تھی، اس کی آواز پر امی دوڑتی ہوئی آئیں، اور باہر سے معلوم کرنے لگیں زار نے انہیں اندر بلا لیا اور امی کس طرح اسے لے کر باہر آئیں، انہوں نے بڑی چادر سے اسے ڈھانک دیا تھا پھر اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا گیا کافی روز اس کا علاج چلا پھر وہ گھر آگئی، کمرے میں سے جب سب چلے گئے تو زنیہ نے اپنا انداز بدل لیا۔ ”اگر خیریت چاہتی ہے تو اپنے کام سے کام رکھ، میرے بچ آئی تو!“ زنیہ نے روکھے انداز سے کہا زار کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا اس نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

”زونی بیٹا! معاذ کی شرٹ استری کر دو۔“ امی نے زنیہ کو شرٹ دیتے ہوئے کہا اور چلی گئیں۔ زنیہ نے شرٹ کی طرف دیکھا اور شرٹ سے دھواں نکلنے لگا۔ جب معاذ اپنی شرٹ لینے آیا تو اسے دیکھ کر اس کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ”یہ کیا کیا؟ زونی تم تو بالکل پھوہڑ ہو سوائے فیشن کرنے کے کچھ نہیں آتا تمہیں، آپی کیا بیمار ہوئیں پورا گھرا لٹ گیا! تم تو کسی کام کی نہیں ہو، ایک کام کہا اس کا بھی بیڑا غرق کر دیا، پتہ ہے کتنی مہنگی شرٹ تھی یہ جاہل!“ معاذ غصے میں بکتا رہا اور زنیہ خاموشی سے سنتی رہی معاذ کے جاتے ہی کمرے کی میز پر



رکھا گلداں خود بخود کچی کچی ہو کر بکھر گیا۔

”معاذ بیٹا! پانی کی موٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے ذرا دیکھ لو بیٹا“ امی نے معاذ سے کہا۔

”جی امی! آپ چلیں میں یہ سوال سالو کر کے آتا ہوں۔“ معاذ نے ادب سے کہا۔ ”بیٹا جلدی نہیں ہے آرام سے اپنی پڑھائی کر کے دیکھ لینا۔ امی نے کہا اور چلی گئیں۔ معاذ نے دس منٹ بعد کتابیں رکھیں اور موٹر دیکھنے چلا گیا۔ اس وقت صحن میں کوئی نہ تھا اس کے ابو بھی گھر پر نہ تھے۔ معاذ نے بٹن پر پریس کیا تو موٹر چلنے لگی۔ ”لو جی! امی تو کہہ رہی تھیں چل نہیں رہی۔“ اس نے خود سے کہا اور بٹن کو بند کرنے اس پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بورڈ میں آگ لگ گئی اور معاذ کا ہاتھ وہیں چپک گیا وہ وہیں جھٹکے لیتا رہا اور اس کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی وہ جل کر سیاہ ہو گیا، ایک دم آگ بجھ گئی اور معاذ اچھل کر دور جا گرا، کتنی ہی دیر وہ صحن میں پڑا رہا مگر کسی کو خبر نہ ہو سکی جب معاذ کے والد چابی سے لاک کھول کر گھر کے اندر آئے تو ان کی نظر معاذ پر پڑی۔

”معاذ!!!“ وہ دوڑ کر پاس آئے اور اسے اٹھا کر اسپتال بھاگے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاذ واپس نہ آنے والے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ سارے رشتے دار، ملنے والے اس جوان موت پر آبدیدہ تھے۔

زنیرہ اب بھی اپنے کمرے میں گھسی خاموش بیٹھی تھی۔ سب سمجھ رہے تھے کہ بھائی کی موت کا صدمہ ہے، زارا پھر بھی ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور والدین کو دلا سے دیتی رہی، اس موقع پر اسے اپنی پھپھو سے بہت ڈھارس ملی، روبینہ پھپھو، اپنے بیٹے ضامن کے ساتھ آئی تھیں انہوں نے بکھرے ہوئے غمزدہ والدین کو سمیٹا، زنیرہ کی داد کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی، معاذ ان کا اکلوتا پوتا تھا۔ معاذ کی تدفین کے بعد تایا، چچا اور روبینہ پھپھو وہیں رک گئے تھے، روبینہ پھپھو نے خاموش بیٹھی زنیرہ سے کہا۔ ”زوننی کچھ بولو بیٹا!“ مگر زنیرہ خاموشی سے گردن جھکائے زمین کو تکتی رہی۔

”بھابھی! اس کا بولنا یا رونا بہت ضروری ہے، اس سے کچھ بلوائیں۔“ روبینہ پھپھو نے فکر مندی سے زنیرہ کی امی سے کہا۔ پھر تو سب نے زنیرہ کو ہلانا شروع کیا۔ پہلے تو زنیرہ کچھ نہ بولی پھر منہ اوپر اٹھا کر ایک زناٹے دار تھپڑ روبینہ پھپھو کے رسید کیا۔ روبینہ پھپھو چکرا کر رہ گئیں اور ہکا بکا زنیرہ کو دیکھنے لگیں۔ لمحہ بھر کو کسی کے کچھ سمجھ نہ آیا اگلا لمحہ سب کے لئے دانتوں تلے انگلی دبانے والا تھا۔

زنیرہ نے بھاری آواز میں جب کہا۔ ”مر گیا اپنے کئے کی وجہ سے، جو مجھ سے اڑے گا اپنے انجام کو جائے گا!“

سب زنیرہ کو چونک کر دیکھنے لگے۔ ”بھائی! زونی نے معاذ کی موت کا اثر دماغ پر لے لیا ہے، بھائی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر پائی میری بچی۔“ زنیرہ کے چچا بولے۔

”نورا ڈاکٹر کو بلواؤ۔“ تایا ابو نے کہا تو ضامن ڈاکٹر کو لانے چلا گیا۔ ڈاکٹر زنیرہ کو دیکھنے آیا اور دوا دے کر بولا۔ ”اگر یہی حالت رہے تو آپ ان کے پاس پہلی فرصت میں مریضہ کو لے جائیے گا۔“ انہوں نے سائیکاٹرسٹ سہیل حسن کا کارڈ انہیں دیتے ہوئے کہا۔ گھر والوں نے زونی کو پابندی سے دوا دی مگر اس نے کسی سے ملنا تک بند کر دیا تھا کوئی اس کے کمرے میں نہ جاتا۔

شام ہوتے ہی زونی تیار ہو کر خوشبو لگا کر چھت پر بال کھول کر چلی جاتی اور فجر کی اذان سے پہلے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیتی، پھر دروازہ شام کو کھلتا۔ ”ایسے کب تک چلے گا، ہمیں زونی کو زبردستی لے جانا ہوگا۔“

زنیرہ کے ابو نے کہا اور پھر انہوں نے دوپہر میں زبردستی زنیرہ کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ اندر صرف پشٹ کو جانے کا کہا گیا کیونکہ سہیل حسن نے پوچھا جواب میں زنیرہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ”اچھا میں آپ کی ہسٹری دیکھتا



ہوں۔“ سہیل حسن نے فائل دیکھی۔ ”اچھا تو آپ کا نام زنیہ ہے۔“ اس نے کہا۔  
زنیہ خاموش رہی۔

”اوکے! تو مس زنیہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟“ سہیل حسن نے دوبار سوال کیا۔

جواب خاموشی۔ ”آپ کے گھر والوں نے آپ کے بھائی معاذ کی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا، واقعی بہت افسوس ہوا سن کر، آپ کی اپنے بھائی سے کافی دوستی تھی۔“

”رائٹ؟“ سہیل حسن نے زنیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر زنیہ نے جواب دینے کی کوئی زحمت نہ کی۔ سہیل حسن نے گہری سانس لی اور اپنی چیئر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ گھوم کر ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھی زنیہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”مس زنیہ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آپ بولیں گی نہیں تو آپ کو میں واپس بھیج دوں گا، جب تک آپ بات نہیں کر لیتیں آپ اس روم سے باہر نہیں جاسکتیں۔“ سہیل حسن کا بس اتنا کہنا تھا، زنیہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور جانے کے لئے مڑ گئی۔

”مس زنیہ آپ یوں نہیں جاسکتیں!“ سہیل حسن نے اسے روکنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ خود بخود دفعتاً اوپر اٹھا اور ایک زور دار دھکا لگنے سے دور جاگرا، اس کی چیئر اڑتی ہوئی اس کے پاس آ کر گری اگر وہ ایک طرف نہ ہوتا تو وہ اس کے لگتی۔ سہیل حسن نے مڑ کر زنیہ کی جانب دیکھا تو اسے اپنے جسم سے جان کھسکتی محسوس ہوئی۔

زنیہ کی چٹیا کے بل خود بخود ایک ایک کر کے کھلنے لگے اور پھر اس کے بال بکھر گئے، زنیہ نے منہ اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں کی پتلی میں آگ کے شعلے جل رہے تھے۔ ”تیری اتنی ہمت کہ ہماری چیز کو چھوئے!“ زنیہ کے منہ سے بھاری مردانہ آواز نکلی۔ سہیل حسن نے گرتے پڑتے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو اس قوت نے اس کا گلا اپنے گرفت میں جکڑ لیا، سہیل حسن کو اپنا دم گھٹتا

محسوس ہونے لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے کسی اندیکھی گرفت سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”بھابھی بہت دیر ہو گئی ہے، اندر چل کر دیکھتے ہیں۔“ روبینہ پھپھو نے زنیہ کی امی سے کہا۔ ”چلو!“ وہ اٹھ گئیں اور دونوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ اندر قدم رکھتے ہی دونوں ٹھٹک گئیں۔ ان کی نظر پہلے سہیل حسن پر پڑی جس کا منہ سرخ غبارہ ہو رہا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب!“ زنیہ کی پھپھو بولیں۔ زنیہ کی امی اس کی طرف بڑھیں۔ ”میری بچی!“

”رک وہیں!“ زنیہ کے منہ سے مردانہ آواز نکلی اس نے پھر ڈاکٹر سہیل کی سامان سے بھری ٹیبل کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر ہوا میں اوپر اٹھایا جو اس کے سر سے اوپر اٹھ گئی تھی۔ ”روبینہ پھپھو یہ منظر دیکھ کر غش کھا کر زمین پر جا پڑیں، جبکہ زنیہ کی امی نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کر دیا، کچھ دیر میں زنیہ لہرا کر کرسی پر جا گری اور سہیل حسن زمین پر لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

زنیہ کی امی زنیہ کے گال تھپتھپانے لگیں۔ ”زونی! اٹھو بیٹا۔“ زنیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ سہیل حسن اٹھے اور ٹیبل بجا کر اسٹاف کو بلایا۔ ان کی اسٹنٹ ساتھ آئی اور زنیہ کی پھپھو کو پانی کے چھینٹے مارے وہ ہوش میں آ گئیں مگر زنیہ کو خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

سہیل حسن نے زنیہ کو وہیں بیٹھایا اور اس کی والدہ اور پھپھو کو لے کر باہر آ گئے۔ اور ایک طرف لے جا کر بولے۔ ”دیکھیں آپ کو شاید میری بات عجیب لگے کہ میں سائیکاٹرسٹ ہو کر آپ سے یہ بات کر رہا ہوں، مگر میں مسلمان ہوں اور اس بات پر میرا یقین ہے کہ دنیا میں آسیب یا جنات کا وجود ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو اپنی بچی کو ”کسی“ کو دکھائیں! یہ میرا میٹر نہیں ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔“



”جی! ڈاکٹر صاحب میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ روبینہ پھپھو نے کہا پھر وہ لوگ واپس گھر آ گئے۔

زنیرہ کو اس کی امی نے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ پھر دوسرے کمرے میں بڑوں کی میٹنگ شروع ہو گئی۔ روبینہ پھپھو نے سائیکائرسٹ سہیل حسن کے ہاں ہونے والے تمام واقعات سے آگاہ کیا، سب باتیں سننے کے بعد زنیرہ کی دادو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”ہزار ہا دفعہ منع کیا تھا۔ اس لڑکی کو کہ مت بسی رہا کرو ہر وقت خوشبوؤں میں! مگر کب مانی اس نے میری بات“ دادو روتے ہوئے بولیں۔

”مجھے تو زارا کا جلنا اور معاذ کی موت اسی سلسلے کی کڑی لگ رہی ہے۔“ زنیرہ کے چچا بولے تو سب تائید کرنے لگے۔

”زارا کو بلاؤ!“ زنیرہ کے والد بولے۔ زارا آ گئی۔ ”بیٹا اس روز کیا ہوا تھا جب تم جلی تھیں۔“ ابو نے پوچھا۔

”ابو! زنیرہ دادو کے منع کرنے کے باوجود پرفیوم لگا کر مغرب کے وقت چھت پر لیٹی ہوئی تھی میں نے اسے نیچے آنے کو کہا تو اس نے..... زارا چپ ہو گئی۔“ اس نے کیا بیٹا؟“ تایا ابو بولے۔

”اس نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔“ زارا نے سر جھکا کر کہا۔ ”اوہ! اللہ! اتنی بدتمیزی۔“ دادو بولیں۔

”تو میں نے اگلے دن اس کے سارے پرفیومز لے جا کر پھینک دیئے۔ پرفیومز پھینک کر میں نے نہانے کے لئے پانی چیک کیا وہ بالکل نارمل تھا مگر جیسے ہی میں نے شاور دوبارہ کھولا اس میں سے ابلتا ہوا پانی نکلا۔“ زارا نے بتایا۔

”اس کے بعد تمہاری زونی سے کوئی بات ہوئی تھی۔“ چچا بولے۔

”جی چچا جان! جب اسپتال سے واپس گھر آ کر میں روم میں آ گئی تھی تو زونی نے اکیلے میں مجھے دھمکی

دی تھی کہ ”اگر اپنی خیریت چاہتی ہے تو اپنے کام سے کام رکھ، میرے بیچ آئی تو!“ اور ہاں یاد آیا جب اس روز میں اسے بلانے چھت پر گئی تو میں نے زونی کے اوپر ”ایک سیاہ بادل نما سایہ دیکھا تھا مگر وہ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا تھا۔“ زارا نے تفصیل سے بتایا۔

زنیرہ کی امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ ”یا اللہ! میری بچی کی حفاظت کر، وہ تو نادان تھی مگر تو بچانے والا ہے۔“

”ہمت رکھئے! مجھے ایک حل سمجھ میں آتا ہے۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک ہے بھی یا نہیں۔“ زنیرہ کے چچا بولے۔ ”جلدی بتائیں بھائی صاحب!“ زنیرہ کی امی بے تابی سے بولیں۔

”ہم زنیرہ کا نکاح کر دیتے ہیں۔“ چچا نے کہا۔ ”نکاح! یہ کیسا حل ہے بھائی جان؟“ روبینہ پھپھو بولیں۔

”ہم اس کا نکاح کر کے اسے رخصت کر کے دوسرے گھر بھیج دیتے ہیں اس طرح اس کی جان اس مصیبت سے چھوٹ جائے گی۔“ چچا بولے۔

”ہاں یہ حل ٹھیک ہے۔“ تایا ابو نے تائید کی۔ ”مگر بھائی صاحب اتنی جلدی نکاح کیسے کریں گے؟“ ابھی تو معاذ کو گئے.....“ زنیرہ کی امی نے رونا شروع کر دیا۔

”بیگم خود کو سنبھالئے! معاذ تو چلا گیا کیا اب زنیرہ کو کھونا چاہتی ہیں؟“ زنیرہ کے ابو بولے۔ ”اللہ نہ کرے! میں کیوں ایسا چاہوں گی مگر لوگ کیا کہیں گے؟“ انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ”لوگوں کی نہیں بھابھی ہماری بچی کی فکر کریں۔“ چچا بولے۔

”تم سب سے اہم بات تو بھول ہی گئے کہ ”زنیرہ کا نکاح کریں گے کس سے؟“ دادو نے کہا تو سب ایک دوسرے کی شکلیں تکتے لگے۔

”میں کروں گا زنیرہ سے نکاح!“ ضامن نے اندر آتے ہوئے کہا تو لمحہ بھر کے لئے سب بالکل خاموش ہو گئے۔



زنیرہ کے والد نے خاموشی کو توڑا۔ ”ضامن بیٹا یہ جذباتی بات نہیں عمر بھر کا فیصلہ ہے، تمہاری اپنی زندگی ہے۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ضامن بھائی صاحب اگر معاذ کا معاملہ نہ ہوا ہوتا تو میں دو چار روز میں زونی کا ہاتھ ضامن کے لئے مانگنے آنے والی تھی۔“ روبینہ پھپھو نے کہا۔

زنیرہ کی امی روتے ہوئے ان کے گلے لگ گئیں۔ ”میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں روپی!“

”بھابھی کر دی ناں آپ نے میری خوشی پھیلکی، بھلا اپنوں کو شکریہ کہا جاتا ہے؟ بلکہ اپنوں پر تو حق جمایا جاتا ہے۔“ روبینہ نے کہا اور دونوں پھر گلے لگ گئیں۔

”تو پھر ٹھیک ہے نکاح کی تقریب میں صرف گھر والے ہونگے؟ پرسوں جمعہ ہے، عصر، مغرب میں دونوں بچوں کا نکاح کر دیں گے۔“ دادو نے کہا تو سب نے فوراً اس فیصلے کو مان لیا۔

”بس اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس مصیبت سے میری بچی کی جان چھڑا دے!“ زنیرہ کی امی نے کہا تو سب نے جلدی سے کہا۔ ”انشاء اللہ!“

جمعے کا دن آگیا صبح سے ہی سب کی مصروفیت کا آغاز ہو گیا تھا آج زنیرہ کا نکاح تھا۔ دوپہر تک تایا ابو اور چچا کی فیملیز بھی آگئیں۔ شام ہونے لگی تو زنیرہ کے ابو بولے۔ ”ارے روبینہ کو کال کرو جلدی نکلے، شام میں ٹریفک بہت ہو جاتا ہے۔“ ان کے کہنے پر زارا نے

روبینہ پھپھو کو کال کی۔ ”ارے بیٹا بس بیٹھ رہے ہیں گاڑی میں بھائی صاحب تو ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں، کہہ دو ان سے پونے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔“ روبینہ پھپھو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اللہ حافظ پھپھو!“

”او کے بیٹا اللہ حافظ۔“ روبینہ پھپھو نے کہا۔

زارا نے فون رکھ کر اپنے ابو کو جا کر بتا دیا وہ پونے گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ ”ٹھیک ہے بیٹا۔“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا گھڑی کی سوئی پانچ بج رہی تھی۔

وہ سب لوگ انجام سے بے خبر اپنی نادانی میں سب کر رہے جا رہے تھے اور مطمئن تھے کہ ان کا سوچا ہوا حل مسئلے کو ختم کر دے گا۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت کرتی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ سوا پانچ، چھ پھر سوا چھ بج گئے مگر روبینہ پھپھو اور ضامن نہیں پہنچے۔ ”ارے بھئی غیر ذمہ داری کی بھی حد ہوتی ہے! اگر کسی وجہ سے انسان کو دیر ہو بھی رہی ہو تو انسان ایک کال ہی کر دے۔“ زنیرہ کے ابو غصہ کرنے لگے۔

سب ضامن اور روبینہ بیگم کو کالز کرنے لگے، مگر دونوں میں سے کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ ”ایسا کرتے تو نہیں ہیں وہ اس طرح اللہ خیر کرے!“ زنیرہ کے چچا بولے۔

مغرب بھی ہو گئی اب تو سب پریشان ہونے لگے۔ اتنے میں گھر کے نمبر پر تیل ہوئی۔ زنیرہ کے ابو تیزی سے فون سیٹ کی طرف بڑھے۔ سی ایل آئی پر روبینہ بیگم کا نمبر آ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور بولے۔ ”حد کر دی روپی! کہاں رہ گئی ہو بھئی اور ضامن کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا۔“

”دیکھئے جناب مجھے آپ کا نام نہیں معلوم مگر آپ فوراً نیشنل اسپتال پہنچئے!“ دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

”معاف کیجئے گا آپ کون؟“ زنیرہ کے ابو نے حیرانی سے پوچھا۔

”انسپکٹر اظہر بات کر رہا ہوں، اس موبائل پر آخری نمبر آپ کا تھا اس لئے آپ کو کال کی گئی ہے۔“ دوسری طرف سے جواب آیا۔

”جی یہ میری بہن کا نمبر ہے وہ کہاں ہے؟“ زنیرہ کے ابو نے گھبرا کر کہا۔

”ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے! آپ جلدی آجائیں۔“ زنیرہ کے ابو ریسیور چھوڑ کر دوڑ پڑے سب ان کے پیچھے تھے۔ زارا نے جلدی سے ریسیور اٹھایا تو اسے معلوم ہوا کہ کیا بات ہے۔ جب سب کو پتہ چلا تو



باقی لوگ ان کے پیچھے بھاگے زارا گھر میں دادو اور زنیہ کے پاس رک گئیں۔

جب سب اسپتال پہنچے تو ان سب کو اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا۔ انسپکٹر اظہر نے انہیں بتایا کہ ”ضامن اور روبینہ پھپھو گاڑی میں آ رہے تھے۔ ان کے آگے بڑا ٹرک سرے لے کر جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹرک خراب ہو گیا اور پیچھے سے تیزی سے آتی آپ کی بہن کی کار میں ٹرک سے باہر نکلے سرے وند اسکرین توڑ کر گھس گئے، ضامن کے تو سینے میں سرے آ رہا ہو گئے اس کی تو آن دی اسپاٹ ڈسٹھ ہو گئی! گاڑی بے قابو ہوئی اور بیرج کی دیوار توڑ کر نیچے گر گئی۔

”یا اللہ!“ زنیہ کے ابو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ”انسپکٹر صاحب ہماری بہن کہاں ہے؟“ پچانے پوچھا۔

”وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں ان کی سرجری چل رہی ہے۔“ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سب بیٹھ کر دعائیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر باہر آئے تو سب دوڑ کر ان کے پاس گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ”سرجری تو ہو گئی ہے مگر پیسٹ ہوش میں آنے کے بجائے کومہ میں چلی گئیں۔“ زنیہ کے ابو وہیں کرسی پر ڈھے گئے۔

تایا ابو اور تائی اسپتال میں رک گئے اور زبردستی سب کو واپس بھیج دیا۔ زنیہ کے ابو کو سب نے زبردستی دادے کر سلا دیا۔ تھوڑی دیر رک کر چچا اور چچی دوبارہ اسپتال چلے گئے۔ دادی جان کو چپ لگ گئی، گھر میں ماتم کی فضا چھائی ہوئی تھی، امی اور زارا صحن میں بیٹھی دادو کو دلا سے دے رہی تھیں۔ ”جانے کس منحوس کی نگاہ پڑ گئی میرے گھر پر!“ زنیہ کی دادو روتے ہوئے بولیں تو وہ دونوں بھی رونے لگیں روتے روتے وہ لوگ ایک دم اچھلے۔

صحن میں دھماکے سے ایک بہت بڑا پتھر آ کر گرا وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ ان لوگوں کے کچھ سمجھ آتا صحن میں پتھروں کی برسات شروع ہو گئی۔ اس کے بعد لگا جیسے چھت پر بھونچال آ گیا ہو، کوئی مانو بڑی بڑی چیزوں کو ادھر سے ادھر اٹھا اٹھا کر بیچ

رہا ہو، وہ لوگ دوڑ کر ایک دیوار سے جا لگے۔ ”یا اللہ! رحم کر۔“ دادو کے منہ سے نکلا۔ ”زارا بیٹا زونی کو دیکھو جا کر کمرے میں اٹھ تو نہیں گئی۔“ امی نے فکر مندی سے کہا تو زارا دوڑ کر اندر کمرے میں گئی۔ ”امی!!“ وہ وہیں سے بولتی ہوئی بھاگ کر آئی، امی زونی کمرے میں نہیں ہے!“ اس نے آ کر بم پھوڑا۔ ”میری بچی!“ زنیہ کی امی نے کہا۔ ایک دم چھت پر سے مردانہ قہقہے سنائی دیئے۔ تینوں کی نگاہ بیک وقت اوپر اٹھی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ”چھت کی منڈیر پر زنیہ ہاتھ چھوڑے کھڑی تھی اور مردانہ قہقہے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ بال اس کے ہوا میں اوپر اٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پتلی میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

”کون ہے تو اور تیری منشاء کیا ہے؟“ زنیہ کی امی پھٹ پڑیں تو ایک دم زنیہ کے قہقہے رک گئے۔

”دیکھ لیا انجام میرے بیچ آنے کا! یہ میری ہے اور میں اسے اپنے ساتھ ہر صورت لے کر جاؤں گا۔“ زنیہ نے اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

”یہ میری بیٹی ہے، تیری چیز نہیں نامراد۔“ زنیہ کی امی نے غصے سے کہا بس ان کا اتنا کہنا تھا کہ انہیں ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہوا میں معلق ہو گئیں، انہیں کسی نے چٹیا کے بل لٹکا دیا تھا، تکلیف سے ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ ایک دم دادو نے کلام الہی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ لمحہ نہ گزرا تھا کہ زنیہ کی امی نیچے آ گریں، زارا نے اوپر دیکھا تو زنیہ چھت کی منڈیر سے غائب تھی۔

”امی آپ ٹھیک تو ہیں؟“ زارا نے پوچھا۔

”مجھے چھوڑو بیٹا تم زونی کو دیکھو۔“ امی نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ زارا ڈرتے ڈرتے اوپر گئی تو دیکھا زنیہ چھت پر بے ہوش پڑی تھی۔ زارا مسلسل کلام الہی کا ورد کر رہی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اسپتال سے کال آئی کہ روبینہ بیگم کو ہوش نہ آیا اور کوما میں ہی ان کا

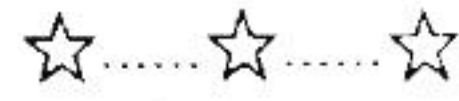


## اعتماد کا عالم

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے بارے میں مشہور واقعہ ہے۔ آپ ظہر کی نماز سے پہلے حجرے میں بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان آیا..... سلام و دعا کے بعد بیٹھ گیا۔ مولانا نے آنے کا مقصد پوچھا۔ کہنے لگا۔ حضرت میں اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند ہوں، لڑکی بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ لیکن چچا جان مانتے نہیں ہیں۔ آپ میرے ساتھ چل کر چچا جان سے بات کریں۔ مولانا نے جواب دیا۔ یہ تیرے گھر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کو درمیان میں لاؤ۔ بار بار کے اصرار کے باوجود مولانا گنگوہی ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئے تو نوجوان نے صحن میں موجود کنواں پر جا کر کپڑے اتار کر ایک چادر باندھ لی۔ مولانا کو آواز دی کہ میرا جنازہ آپ ہی کو پڑھانا ہے۔ مولانا ٹھہرو، ٹھہرو کا شور مچاتے ننگے سر، ننگے پاؤں بھاگے، نوجوان کو واپس پکڑ کر حجرے میں لائے..... سر پکڑ کر بیٹھ گئے پھر کاغذ قلم لے کر لکھا اور تاکید کی کہ چچا کو یہ تحریر دکھاؤ، یا اللہ میں کچھ جانتا نہیں اور یہ شخص کوئی بات مانتا نہیں، تو اس کا مولا اور یہ تیرا غلام، اب تو جانے اور تیرا کام، نوجوان اپنی گلی میں داخل ہوا، اس کے چچا اور دیگر اسے تلاش کر رہے تھے اسے دیکھ کر کہا۔ ”کدھر گئے تھے آؤ تیری شادی کرادیں، یہ تھا اللہ والوں کا اللہ پر اعتماد کا عالم“

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہ یار)

انتقال ہو گیا۔ زنیہ کے ابو کو جب خبر دی گئی تو ایک دم اسپتال دوڑ پڑے۔  
دادو پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ سنبھالے نہ سنبھل رہی تھیں۔



زنیہ کے ابو اپنی بہن کو دفنا کر گھر واپس آئے اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔  
دروازے پر ایک فقیر نے سدا لگائی تو اٹھ کر گئے اور اسے پیسے دینے لگے۔ فقیر نے نوٹ لیتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زنیہ کے ابو نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ”وہ اپنا کہا ضرور کرے گا۔“ اس کی نگاہیں آسمان پر تھیں۔

ایک دم زنیہ کے ابو کو جھٹکا لگا اور وہ وضو کر کے مسجد کی طرف گئے ان کا دل ڈوب رہا تھا ان کے پیارے ایک ایک کر کے انہیں چھوڑ کر جا رہے تھے اور وہ بے بس تھے۔ مسجد جا کر وہ اپنے رب کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ ”اے اللہ ہم پر رحم فرما! میری زونی کو اس عذاب سے نجات دلا دے، آج میں تجھ سے اپنی بچی کے لئے اس عذاب سے نجات مانگنے آیا ہوں۔ میری ہمت ٹوٹ چکی ہے.....“

انہوں نے اپنے رب کے آگے اپنے دل کو کھول کر رکھ دیا۔ وہ مستقل روئے جا رہے تھے۔ ان کی جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔ کتنا وقت بیت گیا انہیں کچھ علم نہ تھا وہ مسجد میں ہی تھے کہ کسی نے آہستہ سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگے۔ ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ ان کا چہرہ، داڑھی، جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ انہوں نے نگاہ اوپر کی تو وہ مسجد کے امام صاحب تھے جنہوں نے انہیں اٹھایا تھا۔

”میں معافی چاہتا ہوں جناب کہ آپ کو اس طرح پریشان کر کے اٹھایا مگر میں کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہا ہوں اور آپ کو اس طرح دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ دراصل آپ کی پریشانی مجھ سے برداشت نہ



ہوئی۔“ امام صاحب نے زنیہ کے ابو سے پیار سے کہا۔

”میں بہت بڑی مشکل میں ہوں!“ زنیہ کے ابو نے کہا۔

”آپ اٹھیے! اور میرے ساتھ آئیے۔“ امام صاحب نے کہا اور انہیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ ”اطمینان سے بیٹھیے۔“ انہوں نے زنیہ کے ابو کو بیٹھایا اور پانی پلایا۔ ”اب بتائیے آپ کو کیا پریشانی ہے؟“ انہوں نے پوچھا تو زنیہ کے ابو نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

ساری بات تفصیل سے سننے کے بعد امام صاحب بولے۔ ”پریشان نہ ہوں ہر مشکل کا حل موجود ہوتا ہے بس اللہ سے مدد مانگ کر ہم اس حل کو تلاش کرنے کی کوشش کریں تو مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ آپ ایسا کریں ایک کاغذ پر بچی اور اس کی والدہ کا نام مجھے لکھ کر دے دیجئے میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کے کام آسکوں، آپ تین روز بعد تشریف لائیے گا میرے پاس۔“

زنیہ کے والد نے جلدی سے زنیہ اور اس کی والدہ کا نام امام صاحب کو بتا دیا اور گھر آ گئے۔ پیش امام صاحب کی باتوں سے انہیں کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔ تین روز تک زنیہ نے گھر والوں کو خوب پریشان کیا جیسے تیسے تین روز گزر گئے۔ زنیہ کے ابو امام صاحب کے پاس گئے۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ امام صاحب کے ساتھ ان کے حجرے میں چلے گئے۔ امام صاحب بولے۔ ”محترم میں نے تین روز تک پڑھائی کی، اس سے آپ کی بچی کے لئے کافی کچھ معلوم ہوا ہے۔ ایک نہایت ضدی جن ہے۔ جو آپ کی بچی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے اور اس کے ارادے نہایت خطرناک ہیں وہ کسی قیمت پر آپ کی بچی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہے!“

”اب کیا ہوگا امام صاحب؟“ زنیہ کے ابو پریشانی سے بولے۔

”میری حد جتنی تھی اس کے مطابق میں نے یہ سب تفصیل معلوم کی ہے۔ وہ بہت طاقتور جن ہے اپنے مقصد کی راہ میں آنے والی ہر شے کو وہ نیست و نابود کرنے پر کمر بستہ ہے۔ آپ کی بہن اور بھانجا بھی اس کا شکار ہوئے۔ آپ نے کتنی بڑی غلطی کی جو اس جن کے ہوتے ہوئے بچی کے نکاح کا فیصلہ کیا۔ وہ جن اپنے ہوتے بھلا آپ کی بچی کا نکاح ہونے دے گا؟ آپ پہلے کسی سے معلوم تو کر لیتے شاید آپ کے بھانجے کی جان بچ جاتی۔“ امام صاحب نے بتایا۔

”تو اب پھر میں کیا کروں؟ میری بچی؟“ زنیہ کے ابو اتنا کہہ کر زور زور سے سکھنے لگے۔

”ہمت رکھئے جناب! اللہ بہت بڑا ہے! میرے جاننے والے ایک بہت بڑے اللہ والے ہیں ان سے بات کی ہے، وہ آپ کی مدد ضرور کریں گے۔“ امام صاحب نے کہا اور پھر انہیں تفصیل بتانے لگے۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں اللہ والے بزرگ کی پر نور شخصیت سے نور بکھرا ہوا تھا۔ ایسا نور ان کی شخصیت سے پھوٹ رہا تھا کہ بندہ اس میں کھو جائے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سفید داڑھی کے پیچھے سرخ و سفید نورانی چہرہ، سر جھکائے آنکھیں بند کئے ان کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے اور ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سر جھکائے ان کے منتظر تھے کہ وہ کچھ کہیں، کافی دیر گزر گئی پھر ایک دم ان کے ہونٹوں کی حرکت رک گئی اور تسبیح کے دانے بھی ٹھہر گئے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر نظریں گھمائیں پھر وہ کسی سے بنا کچھ کہے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ زنیہ کے ابو بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ زنیہ کے ابو نے ان کے پیچھے آنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ زنیہ کے ابو وہیں رک گئے۔

وہ بزرگ پہلی مرتبہ زنیہ کے گھر آئے تھے مگر وہ کسی سے راستہ پوچھے بغیر چلتے گئے۔ لائن سے تین



کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے تیسرا کمرہ زنیہ کا تھا۔ تینوں کمرے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی بزرگ نے وہاں قدم رکھا دھڑاک سے پہلے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا وہ آگے بڑھے تو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ پھر وہ زنیہ کے کمرے کے آگے پہنچے تو اس کے کمرے کا دروازہ دھماکے سے بند ہو گیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

بزرگ نے شہادت کی انگلی دروازے پر رکھی اور دروازہ اشارے سے کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا گھپ ہو رہا تھا۔ بزرگ نے اندر قدم رکھا تو ایک دم کمرے میں روشنی ہو گئی۔ سامنے بستر پر زنیہ دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سارے بال کھول کر آگے چہرے پر ڈالے ہوئے تھے جن سے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم کمرے میں موجود الماری میں لگا شیشہ دھماکے سے ٹوٹ کر چچی ہو کر زمین پر بکھر گیا۔ پھر ایک طرف رکھی ہوئی کرسی ہوا میں اڑتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جا کر ٹکرائی اور نیچے جا پڑی۔

”بند کر اپنی یہ شعبہ بازی!“ بزرگ نے رعب دار آواز سے کہا تو چند لمحوں کے لئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زنیہ کے منہ سے مردانہ قہقہے نکلنے لگے۔ پھر تو کمرے میں طوفان آ گیا ایک ایک کر کے کمرے میں موجود تمام چیزیں ہوا میں معلق ہو کر دھم سے نیچے گرتیں پھر اوپر اٹھتیں، پھر دوبارہ نیچے گرجاتیں۔ کمرے سے آتی آوازوں سے گھر والے ہول رہے تھے اور مسلسل دعائیں مانگ رہے تھے۔

بزرگ نے پڑھنا شروع کیا تو تمام کی تمام چیزیں آہستہ سے نیچے اپنی جگہ پر آ گئیں۔ زنیہ نے زور زور سے جھٹکنے لینے شروع کر دیئے۔ پھر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلنے لگا۔ زنیہ نے اپنی جگہ سے ہلنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ انج نہ بل سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے طاقتور زنجیروں سے جکڑ دیا ہو۔ پہلے تو وہ زور لگاتی رہی پھر اس کے منہ سے غراہٹ نکلنے لگی۔ پھر وہ زور سے دھاڑی۔ ”چھوڑ مجھے!“

مگر بزرگ اطمینان سے خاموش کھڑے رہے۔ ”میں کہتا ہوں چھوڑ، ورنہ پچھتائے گا!“ زنیہ نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔

”بکواس بند کر! اور چھوڑ دے اس بچی کو، کیوں پریشان کر رہا ہے اسے۔“ حضرت نے غصے سے کہا۔ ”یہ مجھے بہت اچھی لگی، اس کے مہکتے وجود نے مجھے اس پر عاشق ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب یہ صرف اور صرف میری ہے۔ میں اس کو حاصل کر کے رہوں گا۔“ زنیہ کے منہ سے بھاری سی آواز نکلی۔

”چھوڑنا تو اسے تجھے پڑے گا!“ بزرگ نے جواب میں کہا۔

”ناممکن ہے! یہ میری چیز ہے اور میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ جن نے غصے سے کہا۔

”یہ کوئی چیز نہیں جیتی جاگتی بچی ہے اور اس پر تیری کوئی مرضی نہیں چلے گی اور رہی بات لے جانے کی تو اسے تو کیا لے کر جائے گا پہلے اپنے جانے کی تو فکر کر۔“ بزرگ کا اتنا کہنا تھا کہ زنیہ کے منہ سے درد بھری چیخیں نکلنا شروع ہو گئیں۔

زنیہ نے سر پٹختا شروع کر دیا۔ ”چھوڑ دو مجھے!“ جن نے غراتے ہوئے کہا مگر بزرگ نے اپنی پڑھائی شروع کر دی تھی۔ ”میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے!“ بزرگ پڑھتے رہے۔ ”چھوڑ دو مجھے جانے دو!“ اب اس کی آواز میں اذیت تھی۔ ”جانے دو مجھے!“ اس نے گڑ گڑا کر کہا۔

”نکل گئے تیرے کس بل؟“ بزرگ نے کہا۔ ”میں چلا جاؤں گا یہاں سے، مجھے چھوڑ دو۔“ جن نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

”صرف اتنا نہیں کہ چلا جاؤں گا، وعدہ کر کے اس بچی کو یہیں چھوڑ کر جائے گا، تو پھر تیری بات پر غور ہو گا۔“ بزرگ نے پڑھائی روک کر کہا تو چند لمحے زنیہ خاموش رہی، پھر بزرگ نے پڑھائی شروع کر دی تو زنیہ کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ ”معاف کر دیں مجھے! مجھے منظور ہے، مجھے جانے دیں، میں اس لڑکی کو



چھوڑ دوں گا۔“ جن نے اذیت ناک انداز میں بلبلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے! بزرگ نے کہا اور پھر کچھ پڑھ کر زنیہ کی جانب پھونک ماری تو زنیہ کے جسم سے دھواں نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا اور زنیہ دھپ سے بستر پر گر پڑی اور بے سدھ ہو گئی۔ بزرگ کمرے سے نکل گئے اور واپس زنیہ کے گھر والوں کے پاس گئے اور زنیہ کی والدہ کو ایک تعویذ دیا اور بولے۔ ”لحم ضائع کئے بغیر یہ بچی کے گلے میں ڈال کر آؤ۔“

زنیہ کی امی نے تعویذ لیا اور دوڑتی ہوئی گئیں اور اسے زنیہ کے گلے میں ڈال دیا اور واپس آ گئیں۔ پھر بزرگ بولے۔ ”اس مردود سے بچی کی جان چھوٹ گئی ہے۔ مگر بھول کر بھی یہ تعویذ بچی کے گلے سے نہیں اترتا چاہئے کچھ بھی ہو جائے! جب تک یہ تعویذ بچی کے جسم سے لگا رہے گا، وہ مردود کبھی چاہ کر بھی اس کے قریب نہ آ پائے گا کیونکہ ایسے ضدی جن دوبارہ بھی قابض ہو جاتے ہیں۔ یہ تعویذ زندگی بھر اس بچی کے گلے میں رہنا چاہئے۔ اور پہلی فرصت میں آپ اس بچی کا نکاح کر دیں۔ شادی کے بعد بھی یہ تعویذ اترنا نہیں چاہئے۔“ یہ بول کر بزرگ خاموش ہو گئے۔

”میں آپ کا شکر یہ کس طرح ادا کروں!“ زنیہ کے والد نے روتے ہوئے حضرت کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔

”شکر میرا نہیں اس پاک ذات کا ادا کرو، جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ یہ تو میرے اللہ کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی آسانی کے لئے مجھے چنا ہے!“ بزرگ بولے۔

”اچھا حضرت مجھے میرے محسن کا نام تو بتادیتے۔“ زنیہ کے ابو بولے تو بزرگ مسکرا دیئے اور بولے۔ ”بندہ خدا“ اور ان سے رخصت لے کر چلے گئے۔ بعد میں زنیہ کے ابو کے بے حد اصرار پر امام صاحب نے حضرت کا نام انہیں بتایا۔ ”بزرگ اشرف شاہ۔“

☆.....☆.....☆

”زونی بیٹا ذرا ادھر تو آؤ اور ہاں میری ڈائری لیتی آتا۔“ زنیہ کی امی نے اسے آواز دی۔ زنیہ امی کی ڈائری لے کر آگئی اور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ امی نے ڈائری کے صفحے کھولے اور بولیں۔ ”زونی ذرا فون تو لگاؤ۔“

”کس کو امی؟“ زونی نے پوچھا۔ ”یہ لو! امی نے ڈائری زنیہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ زنیہ نے ڈائری پر نگاہ ڈالی تو وہاں نگہت آنٹی کا نمبر درج تھا وہ اس کی امی کی کالج فرینڈ تھیں اور ان دنوں اسلام آباد میں رہتی تھیں۔ زنیہ نے نمبر ڈائل کیا اور آواز دے کر امی کو بلا لیا۔ ”امی لیں! نیل جا رہی ہے۔“ زنیہ نے ریسپورس امی کو دیتے ہوئے کہا۔ تین بیلز کے بعد نگہت آنٹی نے خود فون ریسپو کیا۔ ”کیسی ہو نگہت؟“ زنیہ کی امی نے پوچھا۔

”میری چھوڑو تم نے آج کیسے یاد کر لیا بے وفا!“ نگہت آنٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں تم تو جیسے روز مجھے کال کرتی ہو، آخری بار میں نے ہی تمہیں کال کی تھی جب تم اپنی نند کی بیٹی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں، اس بات کو سال ہونے والا ہے۔“ زنیہ کی امی نے کہا۔

”ہاں بھئی وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا، خیر سب کیسے ہیں؟ بھائی صاحب، امی جان، زرارہ، زنیہ سب۔“ نگہت نے پوچھا۔

”سب خیریت سے ہیں اللہ کا شکر ہے! میں نے تمہیں انوائسٹ کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ کارڈ تو ایک، دو روز میں پہنچ جائے گا، مگر میں تمہیں پرستلی کہہ رہی ہوں۔ ستائیس ستمبر کو زرارہ اور زنیہ دونوں کی شادی ہے۔“ زنیہ کی امی نے کہا۔

”ارے بھئی بہت بہت مبارک ہو!“ نگہت آنٹی نے خوشی سے سرشار انداز سے کہا۔ ”تمہیں بھی مبارک ہو۔“ زنیہ کی امی نے کہا۔

”لڑکے کرتے کیا ہیں؟“ نگہت آنٹی نے پوچھا۔ ”بھئی زرارہ کا ہونے والا شوہر تو ڈاکٹر ہے، جبکہ



زونی کا ہونے والا شوہر اس کی دوست رائیل کا دیور ہے، ہی ایس ایس کیا ہوا ہے، آفیسر ہے۔

رشتے دونوں اچھے تھے تو میں نے سوچا کیوں نہ دونوں کے فرض سے ایک ساتھ ہی سبکدوش ہو جاؤں۔“ زنیہ کی امی نے بتایا۔

”بالکل ٹھیک کیا، تم فکر مت کرو میں ضرور آؤں گی۔“ گھٹ آنٹی نے کہا اور پھر دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

زنیہ کے والد ظہر کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے، زنیہ کی امی انہیں اس طرح دیکھ کر تشویش زدہ ہو گئیں اور آ کر بولیں۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں؟“

”ہاں بیگم طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے مگر.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئے۔

”مگر کیا؟“ زنیہ کی امی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

آج زارا اور زونی کی مایوں تھی۔ مسجد میں امام صاحب ملے تھے، انہوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ ”ہمارے محسن حکیم اشرف شاہ صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔“ جن کی بدولت آج ہم اپنی بیٹی کو اس کے گھر کا کر رہے ہیں۔“ انہوں نے افسردگی سے کہا تو زنیہ کی امی بے اختیار رونے لگیں۔ ”اللہ پاک یہ ایک ماں کے دل سے نکلی دعا ہے۔ تو اپنے اس نیک بندے کی چھوٹی سے چھوٹی خطا معاف فرما کر ان کو جنت میں اعلیٰ ترین مقام عطا کر (آمین) دونوں نے کہا۔

☆.....☆.....☆

”بیٹا کوشش کرنا کہ سارے کام پہلے ہی نمٹا لو ورنہ آخر تک کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے اور پھر رخصتی دیر سے کی جاتی ہے۔“ دادو نے کہا۔ ”جی بہتر! امی حضور!“

زنیہ کی امی نے کہا۔ دادو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ”سنئے! نہ جانے کیوں میرے دل میں خوف آ رہا ہے۔“

زنیہ کی امی بولیں۔

”نہیں بیگم یہ صرف وہم ہے جب تک یہ خبر آپ نے سنی نہیں تھی تو آپ مطمئن تھیں۔ ہمت سے کام لیں اور یاد ہے ناں شاہ صاحب نے وہ تعویذ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ مردود چاہ کر بھی ہماری بچی کے قریب نہیں آ سکے گا۔“ زنیہ کے ابو بولے۔ ”آپ دعا کریں کہ ہماری بیٹی خیریت سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی ہو جائے۔“

☆.....☆.....☆

وہ جن چھت پر ٹہل رہا تھا اس کی سبز چمکتی آنکھیں اندھیرے میں اور بھی خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ نیچے زارا اور زنیہ کے ہاتھوں میں مہندی لگ رہی تھی اور وہ بے تابی سے زنیہ کو دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھنے پر مجبور تھا، وہ بے بس نگاہوں سے اس کے خوب صورت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ چھت پر کسی کے آنے کی چاپ سن کر وہ چھلانگ لگا کر دوسری چھت پر چلا گیا۔

”زارا آپنی مجھے تمہارے سوٹ کا کلر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔“ زونی نے کہا۔

”چند ایہاں میں تمہیں اپنا سوٹ آفر نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ سسرال سے آیا ہوا میری شادی کا سوٹ ہے۔ میری ساس گھر میں قدم رکھتے ہی میرا بھرتہ بنادیں گی۔“ زارا نے مذاق کیا تو دونوں ہنسنے لگیں۔

دونوں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھیں اور بیوٹیشن انہیں تیار کرنے گھر آئی ہوئی تھی۔ ”بی بی یہ تعویذ آپ کے گلے سے نظر آئے گا۔“ بیوٹیشن نے زنیہ سے کہا۔

”آپ اسے پن سے میض کے اندر سیٹ کر دیں اور اس کو اتارنا میرے بس میں نہیں ہے!“ زنیہ نے صاف کہا تو بیوٹیشن چپ ہو گئی۔

”میں تو ہر دفعہ کی طرح آج بھی تم سے پہلے ریڈی ہو گئی ہوں زونی۔“ زارا نے کہا تو زنیہ مسکرانے لگی۔

”اچھا میں ذرا امی کے پاس ان کے روم میں جا رہی ہوں، میں ان کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی



ہوں، پھر تو میں چلی جاؤں گی۔“ زارا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے آپ! میرا بس ہیئر اسٹائل رہتا ہے، میں بھی وہاں آ جاؤں گی۔“ زائرہ نے کہا تو زارا گردن ہلانے لگی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ واپس آئی اور زائرہ کے گلے لگ گئی۔ ”جانے کیوں عجیب سا لگ رہا ہے زوئی! پھر ہم ملیں گے یا نہیں۔“ زارا نے بھرائے ہوئے انداز سے کہا تو زائرہ بھی رونے لگی پھر الگ ہٹ کر بولی۔ ”آپنی تم تو ایسے کر رہی ہو جیسے رخصت ہو کر یو ایس جا رہی ہو۔ چند گھنٹوں کی دوری پر گھر ہے اور سیکنڈ میں موبائل پر کال لگے گی۔ کیا ہو گیا!“ اس نے زارا سے کہا تو وہ روتے ہوئے بھی ہنسنے لگی۔

”میں بھی پاگل ہوں۔“ زارا نے کہا تو زائرہ جھٹ بولی۔ ”یہ تو بالکل سچ ہے اس بات میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ پھر زارا ہمتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ زائرہ چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

”یہ دن ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نروس ہو جاتا ہے!“ بیوٹیشن نے زارا کی کیفیت پر کہا تو زائرہ تائید کرنے لگی۔

پھر دادو زوئی کے پاس آئیں اور زوئی کی بلائیں لینے لگیں۔ ”کتنی حسین لگ رہی ہے میری بیٹی! اللہ نظر بد سے بچائے۔“ انہوں نے کہا تو زوئی نے مسکرا کر نظریں نیچی کر لیں دادو چلی گئیں اور بیوٹیشن نے زائرہ کے سنہرے بالوں کو ہاتھ میں پکڑا اور کنگھے سے بالوں کو تیزی سے سمیٹنے لگی۔ اوپر نیچے جاتے کنگھے میں اچانک ”تعویذ کی ڈوری انکی اور اس کی گرہ کھل گئی۔“ تعویذ کب زائرہ کے گلے سے نکل کر نیچے گرا اسے معلوم ہی نہ ہو سکا۔

بیوٹیشن اس سے پہلے کہ کچھ کرتی کمرے میں اندھیرا چھا گیا، پھر جب روشنی ہوئی تو بیوٹیشن بے ہوش پڑی تھی اور زائرہ دلہن بنی آئینے کے سامنے کھڑی تھی اس کے سنہرے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور اپنے اوپر اسپرے کر لیا۔

وہ اکیلی نہ تھی اس کے برابر میں ایک نوجوان کھڑا تھا، اس کی سبز آنکھیں زوئی پر ہی تھیں۔ ”تم صرف میری ہو! آج میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے جاؤں گا۔“ اس کے منہ سے آواز نکلی۔ زائرہ نے اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر وہ کہیں کھوتی چلی گئی۔

”زوئی دروازہ کھولو!“ زارا نے واپس آ کر دروازہ ٹاک کیا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ سیدھی امی کے پاس گئی انہوں نے دادو سے کہا پھر تو امی، ابو، دادو، سب زوئی کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ امی نے تو دروازے کو توڑ دینے والے انداز سے پیٹ ڈالا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ابو اور چچا نے مل کر دروازے کو توڑ دیا۔

سب اندر آ گئے وہاں ایک طرف بیوٹیشن بے ہوش پڑی تھی۔ مگر زائرہ کا کہیں نام و نشان نہ تھا، دادو نے ایچ ہاتھ میں جھانکا وہ بھی خالی تھا۔ سب نے بیوٹیشن کو اٹھایا تو اس نے بتایا کہ ”ایک دم لائٹ چلی گئی تھی پھر اسے کچھ یاد نہیں۔“

مگر سب حیران تھے کہ لائٹ تو گئی ہی نہیں! ایک دم دادو نے کمرے میں رچی پرفیوم کی خوشبو پر غور کیا تو انہوں نے اپنا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف کیا۔ وہاں ان کا استقبال پرفیوم کی کھلی ہوئی بوتل نے کیا۔ دادو نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو ان کے پیر کے نیچے کوئی چیز آ گئی۔ انہوں نے جھک کر اٹھا لیا وہ چیز کچھ اور نہیں۔ ”زوئی کے گلے میں پڑا بزرگ کا دیا ہوا تعویذ تھا۔“

اس ضدی جن نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔ ”یہ میری چیز ہے اور میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

بڑوں کی بات کو نظر انداز کر کے کبھی ہم بہت بڑی مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں! اگر بڑے کچھ سمجھائیں تو ہمیں سمجھنا چاہئے اسی میں ضرور ہماری بھلائی ہوگی۔







## تنہا مکان

ساحل ابڑو- ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

نوجوان کے سامنے کھڑے بوڑھے پر ایک دو تین چار بلکہ چھ گولیاں چلا دیں مگر بوڑھا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ، ساری گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو چکی تھیں مگر بوڑھا مسکرا رہا تھا، آخر کیوں؟

رگ و پے میں خوف و ہراس کی لہر گردش کرتی ہوئی خوفناک حیرت ناک دل شکستہ کہانی

تنہا مکان میں قیام کے دوران مجھے پیش آئے اور جن کی وجہ سے مجھے یہ منحوس دن دیکھنا پڑا ہے۔

گزشتہ سال موسم بہار کے شروع میں میرے مصائب کا آغاز اس منحوس دن ہوا۔ جب دلال نے فون پر ایک دیہی مکان کے بارے میں مجھے اطلاع دی۔ چار کمروں پر مشتمل یہ دو منزلہ مکان گاؤں کی آبادی سے نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں کئی

**دات** کا پچھلا پر ہے۔ میری زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ صبح ہوتے ہی مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ لوگ مجھے انتہائی خطرناک مجرم سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن میری ہر بات کو جھوٹ سمجھا گیا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ زندگی کے ان تمام واقعات کو مختصراً قلمبند کر دوں۔ جو گاؤں کے قریب ایک



دنوں سے کسی ایسے ہی مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ تاکہ شہر کے ہنگاموں سے دور چار چھ ماہ کے لئے کوئی پرسکون جگہ مل جائے اور میں اطمینان اور یکسوئی سے اپنے دوا دھورے ناول مکمل کر لوں۔ میں نے دلال کی فراہم کردہ معلومات پر فوراً ہی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے مکان کرائے پر حاصل کرنے کی ہدایت کر دی۔

سالہا سال خالی رہنے کے سبب اس مکان کی حالت خستہ ہو رہی تھی حتیٰ کہ تالے تک زنگ آلود ہو چکے تھے۔ نچلی منزل کے دو کمروں یعنی خواب گاہ اور نشست گاہ میں پرانا سامان ٹوٹا ہوا فرنیچر، کراکری اور کوڑا کباڑ ابھرا پڑا تھا ان دو کمروں سے ملحق باورچی خانہ اور سب سے آخر میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جب میں نے اس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ کھولا تو بدبو اور تعفن کے بھبھکوں سے میرا دماغ بھٹنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دروازہ کھلا رہنے دیا جس سے تعفن کم ہوا تو میں کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی تھی جس کے اوپر والے دو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور باقی تمام دیواروں کے ساتھ چھت تک اونچے شلفوں پر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی گرد آلود کتابوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہ کسی کباڑی کی اجڑی ہوئی دکان ہے۔ ان کتابوں میں سے اکثر کو دیمک نے چاٹ کر برباد کر دیا تھا۔ درودیوار پر لکڑی کے جالے اور بدبو سے کمرے کا اندرونی ماحول بڑا ہی پر اسرار اور انتہائی دہشت ناک ہو گیا تھا یہ غلیظ بدبو ایسی تھی جیسے گوشت کی سڑاؤ۔

مجھے خیال آیا کہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے راستے سے کوئی چھوٹا موٹا جانور کمرے میں داخل ہونے کے بعد باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور بھوک پیاس سے سسک سسک کر یہیں مر گیا ہے۔ جس کی لاش کے گلنے سڑنے سے تعفن پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے کمرے میں ہر طرف دیکھا لیکن کسی مردہ جانور کی لاش دکھائی نہ دی۔ اس اجڑے ہوئے مکان میں داخل ہونے کے بعد میں نے دو باتیں خاص طور پر نوٹ کیں۔ ”ایک تو یہ کہ میں آثار قدیمہ کے کسی گمشدہ مقبرے میں چلا آیا ہوں۔

اور یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ دوم یہ کہ مکان میں میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہے جو میری نگرانی کر رہا ہے۔ انجانی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔“ میں نے سوچا۔

لیکن یہاں قیام کرنے کے بعد بھی مجھے ہر وقت کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوتا رہا۔ مختصر یہ کہ مکان کسی بھی صورت میں رہائش کے قابل نہیں تھا۔ مجھے اس وقت دلال کی حماقت پر بہت غصہ آیا۔ لیکن اب میرے لئے اس مقبرہ نما مکان میں رات گزارنے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ گاؤں کے کسی بھی آدمی سے میری واقفیت نہ تھی۔ جس کے گھر رات بسر کرنے کے بعد صبح واپس شہر چلا جاتا۔ حیران تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ آخر مجبور ہو کر اوپر کی منزل پر آ گیا۔

آپ میری بات پر شاید یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اوپر کی منزل انتہائی صاف ستھری ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں رہائش کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ یہ تضاد یقیناً تعجب خیز تھا۔ دنوں کمروں میں نہایت اعلیٰ قسم کے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جدید فیشن کا سا گوانی فرنیچر اور خواب گاہ میں گدوں والا پلنگ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کھڑکیوں پر پھول دار پردے آویزاں تھے اور بلور کے منقش گلدانوں میں تازہ پھول دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی شخص مالک مکان کی اجازت کے بغیر یہاں رہائش پذیر ہے اور میری آمد سے باخبر ہونے پر چھپ گیا۔ ان کمروں سے ملحق باورچی خانہ اور سب سے آخر میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ دونوں منزلیں تعمیر کے اعتبار سے بالکل ٹھیک تھیں۔

دن بھر کے سفر کی تھکن کے باعث میں پلنگ پر پڑ گیا اور سو گیا۔ رات بڑے اطمینان سے گزری۔ صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے تو میں نے اپنے سامان کو نچلی منزل سے لا کر کمروں میں ترتیب دفرینے سے رکھا جو گزشتہ رات سے وہیں پڑا تھا اور پھر ناول لکھنے میں مصروف ہو گیا شام تک لکھتا رہا اس طرح اٹھارہ دنوں تک میرا یہی معمول رہا۔ حتیٰ کہ ناول



مکمل ہو گیا۔

اس دوران نہ تو میں گھر سے باہر نکلا اور نہ ہی گاؤں کا کوئی شخص مجھ سے ملنے آیا۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آتے وقت میں بند ڈبوں میں خور و نوش کی چیزیں وافر مقدار میں لیتا آیا تھا جو میرے لئے دو ڈھائی ماہ تک کے لئے کافی تھیں۔ اس لئے ان اٹھارہ دنوں میں ایک مرتبہ بھی مجھے گاؤں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میں اب بہت تھک چکا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ دوسرا ناول شروع کرنے سے پیشتر کچھ دن سیر کر لینا چاہئے اور گاؤں میں رہنے والے اپنے ہمسایوں سے بھی مل لوں۔

دوسرے دن بھی گاؤں جانے کے لئے پہلی مرتبہ گھر سے نکلا تو ایک آدمی کو بھاگ کر قریب ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپے دیکھا۔ وہ کون ہے۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہی آدمی ہو جو میری آمد سے پیشتر مکان میں مقیم تھا اور اب شاید نچلی منزل میں رہنے لگا ہے بہر حال کوئی بھی ہو مجھے اس سے کیا مطلب میرے لئے اوپر والی منزل کافی ہے۔

میں نے اس کو زیادہ داہمیت نہ دی اور گاؤں کی طرف چلا آیا۔ لیکن اب وہ میرا تعاقب کرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس سے تعرض کرنا مناسب نہ جانا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ البتہ گاؤں پہنچنے کے بعد لوگوں کے رویے سے مجھے سخت دکھ پہنچا۔ کسی نے بھی سلام کا جواب تک دینا گوارہ نہ کیا۔ میں جس طرف جاتا، لوگ حقارت سے منہ پھیر لیتے۔ آخر بہت دیر تک بے مقصد گھومنے کے بعد مجبور ہو کر میں نے گھر کی راہ لی۔

میں حیران تھا کہ گاؤں والے مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ ایک اجنبی ہونے کی حیثیت سے ان کی مجھ سے اس قدر شدید نفرت کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے پیشتر نہ میں نے انہیں دیکھا ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی شخص مجھ سے واقفیت رکھتا ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں جب میں گھر کے دروازے

کے نزدیک پہنچا تو میرا تعاقب کرنے والا بھاگتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہوا اس نوجوان کی اس نازیبا حرکت پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن حالات کے پیش نظر خاموش رہا۔ اس کی عمر پچیس برس تھی بلند قامت، چوڑے شانے، متناسب اور مضبوط بدن۔ میں نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس نے بڑے گستاخ بے میں کہا۔

”کیا آپ نے یہ مکان خریدا ہے؟“  
”نہیں۔“ میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر آپ ارشد ہیں۔ ڈاکٹر کے بھتیجے، جس کی وصیت کے مطابق یہ مکان آپ کو ملا ہے۔“ نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں خود ہی میرے متعلق رائے قائم کر دی۔

”نہیں۔ میں کسی ارشد سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی مرنے والے ڈاکٹر سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ میں نے یہ مکان چھ ماہ کے لئے کرائے پر حاصل کیا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر تم کون ہو اور مکان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“  
”آپ کے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گا۔“ نوجوان بولا۔

”پہلے یہ بتائیے کہ مکان میں قیام کے دوران آپ نے کوئی خلاف معمول بات تو محسوس نہیں کی یا کوئی عجیب و غریب واقعہ تو پیش نہیں آیا ہے۔“

”یہ جگہ تو اتنی اچھی اور پرسکون ہے کہ ساری عمر یہیں رہنے کو جی چاہتا ہے۔“ میں نے نوجوان کو بتایا۔  
”آپ بڑے خوش نصیب ہیں لیکن.....“

”لیکن کیا۔ کہو، خاموش کیوں ہو گئے.....“ میں نے نوجوان کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر پوچھا۔ کیونکہ میں خوش تھا کہ گاؤں کے ایک آدمی سے علیک سلیک تو ہوئی۔

”تم کون ہو؟ مجھ سے مکان خالی کرنے کے لئے کہنے والے۔“ میں نے نوجوان کی بات کو دھمکی سمجھ کر جیسے چیختے ہوئے کہا۔



”جناب..... آپ مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔“ نو جوان نے میری بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”آپ جب سے یہاں آئے ہیں ایک پل بھی میری نظروں سے اونچل نہیں رہے۔ میں نے چوری چھپے آپ کی تھوڑی سی تحریر بھی پڑھی ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ آپ کے مکان خالی کرنے سے مجھے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ڈرتا ہوں کہ آپ بے خبری میں کہیں مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔

مکان کا مالک ڈاکٹر شیطانی قوتوں کا حامل تھا۔ وہ خدا جانے یہاں کیا کچھ کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر کی موت کے چار سال بعد تک مکان خالی پڑا رہا ہے۔ ڈاکٹر کے بھتیجے نے پارہا اسے فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن گاؤں کا کوئی شخص بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوا۔ گزشتہ سال کچھ خطرناک واقعات رونما ہوئے تھے۔ اور گاؤں والے مکان کو جلا دینے کے درپے تھے۔ لیکن پولیس کی بروقت مداخلت سے بچ گیا۔ ان حالات میں اگر آپ یہاں رہنے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں تو مجھے یا کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھئے کہ گاؤں کا کوئی بھی فرد خوف زدہ ہونے کے سبب آپ کے قریب نہیں آئے گا اور آپ کے خلاف ان کی نفرت دن بدن شدت اختیار کرتی جائے گی۔“

”تو یہ بات ہے۔“ میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا..... ”مسٹر..... کیا نام ہے تمہارا.....“

”اکبر۔“

”ہاں تو اکبر۔ آؤ اندر چلیں۔ مکان دیکھ کر تم یقیناً اپنی رائے تبدیل کر لو گے۔“ میں نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھولتے ہوئے کہا۔

”میں اس منحوس مکان میں قدم نہیں رکھوں گا۔“

اکبر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور پھر گاؤں کی سمت چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

وقت گزرتا گیا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہونے کو آیا تھا۔ میں اس پرسکون ماحول میں

بڑا ہی خوش تھا۔ کہ ایک دن اچانک حالات تبدیل ہو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ دھند لکے رفتہ رفتہ گہری تاریکی میں بدلتے جا رہے تھے کہ میری طبیعت بے چین ہو گئی اور لمحہ بہ لمحہ ذہنی الجھن اور انتشار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھا کہ زیادہ کام کرنے سے اعصاب تھک گئے ہیں۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے کاغذ سمیٹے اور لباس تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں۔ آخر بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس دن خلاف معمول گرمی کچھ زیادہ ہی تھی اور کھڑکیوں کے دروازے بند ہونے کے سبب کمرے میں جس کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی سو چا شاید گرمی شدت کام کی تھکن اور جس ہی طبیعت میں اضطراب کا سبب ہیں۔

میں نے دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ اور ایک کھڑکی کے پاس کھڑا پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگل کے دیو قامت درختوں کو دیکھے لگا۔

چاندنی رات کا منظر بڑا ہی خوب صورت تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے خوف آ رہا تھا درختوں کی اوٹ سے چاند بلند ہو رہا تھا۔ اور درختوں کے لمبو ترے سائے سمٹتے چلے جا رہے تھے تھوڑی دیر بعد مکان کی نچلی منزل سے آوازیں سنائی دیں بہت ہی خوف ناک اور بلند۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

خدا جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا۔ اور مجھ پر کیا بتی۔ لیکن جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو پلنگ پر لیٹا ہوا پایا۔ ایک آدمی کھڑکی کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سر سے پیر تک سفید چادر میں ملبوس تھا۔ جیسے کفن پوش مردہ قبر کی گہرائیوں سے نکل آیا ہو۔ اس کی کمرکمان کی طرح جھکی ہوئی تھی جس سے اسکی پیرانہ سالی کا پتہ چلتا تھا۔ میں نے اسے پکارنا چاہا کہ اس نے خود میری طرف پلٹ کر دیکھا۔

”اوہ خدایا۔“ میں خوف سے کانپ اٹھا۔ اس



## کام کے بعد

ایک شخص ایک وقت میں بیس روٹیاں کھا سکتا ہے، سرکس والوں کو پتہ چلا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

پہلے شو میں بیس روٹی کھانے پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہونے والے شو میں وہ پھر بیس روٹیاں کھا گیا اور گھنٹے بعد ہونے والے تیسرے شو سے پہلے غائب ہو گیا۔

مالک نے ڈھونڈا تو ایک ہوٹل پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ مالک کے ڈانٹنے پر معصومیت سے بولا۔

سارا دن کام کے بعد کیا میں روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔

(ہمارے لیے - کراچی)

ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دلدوز انسانی چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ علم نہیں۔ البتہ صبح جب بیدار ہوا تو اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ ”آخر یہ سب کیا ہے۔ کیا میں نے کوئی بھیا نک خواب دیکھا ہے؟“ میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر اپنے شکوک کی تصدیق کے لئے نچلی منزل پر کتابوں والے چھوٹے کمرے میں گیا۔ سب الماریاں دیواروں کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے معمولی سی بھی نہیں سرکی ہوئی دکھائی دی۔ البتہ فرش پر دھول کی موٹی تہہ پر میرے جوتوں کے تازہ اور واضح نشانات ایک الماری کے سامنے موجود تھے۔ اب مجھے اپنے شکوک کی صداقت پر یقین آ گیا اور مزید اطمینان کی خاطر میں نے الماری کو سرکایا تو زیریں میں خفیہ تہہ خانے کا دروازہ دکھائی دیا۔ میں نے الماری کو مزید سرکا کر دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن افسوس

بوڑھے کا چہرہ انتہائی مکروہ اور بھیا نک تھا دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی سے کود کر چاندنی رات کی وسعتوں میں تحلیل ہو گیا اور میں حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

مکان کے اندر سے بلند ہونے والی بھیا نک آواز اب سرور میں ڈوبی ہوئی موسیقی کا روپ دھار چکی تھی۔ جی چاہا کہ ساری رات سنتا رہوں۔ لیکن نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ بہت جلد نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔

صبح خلاف معمول بہت دیر تک سوتا رہا اور بیدار ہونے پر سب سے پہلے میری نظر کھڑکیوں پر پڑی۔ دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ ایک ایک کر کے رات کے واقعات یاد آنے لگے لیکن۔ یہ سب خواب و خیال کی باتیں تھیں زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وقت کی رفتار میں یکسانیت برقرار رہی۔

اور پھر ایک رات میری آنکھ کھل گئی۔ نچلی منزل کے ویرانوں میں کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ رات کے دو بجے ہیں۔ اکبر کے علاوہ میرا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور یہ بوڑھی نحیف آواز یقیناً اکبر کی نہیں ہو سکتی۔“ میں سوچنے لگا۔

میرے کانوں سے بار بار کسی کے بلانے کی آواز ٹکراتی رہی اور پھر میں کمرے سے نکل کر سیڑھیوں سے اترتا ہوا نچلی منزل پر جا پہنچا۔

میری حالت اس شخص جیسی تھی جیسے کوئی نیند میں چلا کرتا ہے اور اسے اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں ہوتا۔ مجھے بھی اس وقت اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ میرے قدم خود بخود کتابوں والے چھوٹے کمرے کی طرف اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ کمرے میں کتابوں کی ایک الماری اپنی جگہ سے سرکی ہوئی تھی جس کے پیچھے دروازہ تھا۔ میں اس خفیہ دروازے سے گزرتا ہوا تہہ خانے میں جا پہنچا۔

یہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔ جس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس جگہ اتنا تعفن تھا کہ میرے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر دیکھا ہر طرف جانوروں اور انسانوں کے پنجر اور



دروازہ اندر سے بند تھا۔ تہہ خانہ کا سر بستہ رازیوں ہی رہا۔

☆.....☆.....☆

مجھے یہاں آئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران میں نے صرف ایک خط شہر اپنے دکاندار کو لکھا جس کے جواب میں اس نے مجھے ڈبوں میں بند خوردونوش کی مطلوبہ اشیاء بھیج دیں ورنہ اس کے علاوہ بیرونی دنیا سے میرا تعلق عملی طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ گاؤں والے تو میری مشکل دیکھنے سے بیزار تھے۔ مجھے بھی ان کی پروا نہیں تھی بلکہ میں خوش تھا کہ اس پرسکون ماحول میں میرا دوسرا ناول بھی مکمل ہونے والا تھا۔

ایک دن جب صبح بیدار ہوا تو شب خوابی کے لباس کی بجائے خود کو سوٹ میں ملبوس پا کر حیران رہ گیا۔ میں نے سوٹ کب پہنا تھا اور اس پر خون کہاں سے لگا ہے۔ میں ابھی اسی گوگلو کے عالم میں تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ہوئی۔

میرا دل یکلخت زور سے اچھلا گویا سینے سے باہر آنے والا ہے۔ خوف سے پسینہ چھوٹ گیا دستک کی آواز لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ ڈر تھا کہ دروازہ نہ کھولا تو دستک دینے والا دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہونے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں نے فوراً ہی سوٹ اتار کر بستر کے نیچے چھپا دیا۔ اور شب خوابی کا لباس پہن کر خون آلودہ ہاتھ دھونے کے بعد آنکھیں ملتا ہوا دروازہ کھولا تو سامنے آدمیوں کا ہجوم کھڑا پایا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے گاؤں والوں نے میرے گھر کا محاصرہ کر رکھا ہو۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے اپنے متحمل حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ہم اپنی بکری لینے آئے ہیں۔“ ہجوم میں سے ایک آواز ابھری۔

”کیسی بکری؟“ میں نے پوچھا۔

”تم گزشتہ رات چوری کر کے لائے ہو۔“

ایک نے کہا۔

”میں اور چوری۔“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

مگر میری بات پر یقین نہیں تو اندر آ کر دیکھ لیں۔ کوئی ماچس کی ڈبیہ تو ہے نہیں۔ جسے میں جیب میں رکھ لوں گا۔“ میں نے دروازے سے ایک طرف ہنستے ہوئے انہیں اندر آ کر دیکھنے کی پیشکش کی۔ ہجوم میں ٹھس پھس ہونے لگی، کوئی بھی شخص اس آسیب زدہ مکان میں داخل ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سب ہی ڈر رہے تھے۔ مبادا کسی ناگہانی آفت کا شکار نہ ہو جائیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے قہقہہ لگایا اور سب خاموش ہو گئے۔ جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میرا قہقہہ ان کی غیرت کے لئے کھلا چیلنج تھا۔

اکبر ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا اور مکان میں داخل ہو گیا۔ اس کی جرأت و بے باکی سے دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور آٹھ دس آدمی اکبر کے پیچھے مکان میں داخل ہو گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ تاکہ میرے متعلق ان کو کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ سب کو مایوس ہونا پڑا۔ کچھ ہوتا تو ملتا۔

سب اپنا منہ لئے واپس چلے گئے۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے میرا بستر اٹھا کر خون آلود سوٹ نہیں دیکھا ورنہ میرے لئے ان کے لئے سیدھے سوالات کا جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ مجھے بکری کے ساتھ ہلاکت کا مجرم بھی ٹھہرایا جاتا۔ میں خود بھی پریشان تھا کہ میرے ہاتھوں اور سوٹ پر خون کہاں سے لگا ہے؟ کہیں مجھے نیند میں چلنے کا مرض تو لاحق نہیں ہو گیا۔ ممکن ہے اسی دوران میں جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ مجھے تہہ خانے میں بوڑھے کا خیال آیا شاید اسی نے ایسا کیا ہو۔

اس واقعہ کے بعد میں ڈر گیا کہ کسی دن کوئی شخص مشتعل ہو کر مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ اسی ڈر سے میں نے شام کے وقت چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔

بس یہ سمجھئے کہ لوگوں نے مجھے میرے ہی گھر میں قید کر دیا تھا۔ اس احتیاط کے باوجود میری مصیبت ختم نہ ہوئی۔



اور جذباتی ہو گئے ہیں۔ ہر اندوہناک واقعہ کو مکان سے منسوب کر کے ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں۔“

اگر پولیس مجھے گرفتاری کا بہانہ کر کے پولیس اسٹیشن نہ لے آتی تو مشتعل ہجوم کے ہاتھوں میری ہلاکت کا خطرہ تھا۔ آخر میں انسپکٹر نے مجھے مکان چھوڑ کر یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ انسپکٹر کا مشورہ بالکل صحیح تھا۔ کاش! میں انسپکٹر کے مشورے پر عمل کرتا۔

☆.....☆.....☆

اس واقعہ سے حقیقت میں مجھے بے حد صدمہ ہوا اور میں نے مجرم کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ بچے کو ہلاک کرنے والا مجرم بوڑھا تہہ خانے میں چھپا ہوا ہے وہ یقیناً پاگل ہے۔ جو کسی دن مجھے بھی ہلاک کر دے گا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی پستول میں گولیاں بھریں اور مارچ لے کر تہہ خانے میں گیا۔ اندر اس قدر تعفن تھا کہ کسی بھی انسان کا یہاں رہنا۔ ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میرے لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اندر جاتے ہی میرے پاؤں کی ٹھوکریاں ایک انسانی کھوپڑی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی کسی پنجرے سے جا ٹکرائی۔

میرا دل کانپ اٹھا اور میں حواس باختہ کھڑا اپنی حماقت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ پولیس کو صحیح حالت سے باخبر کر دیتا۔ اور پولیس خود مجرم کو گرفتار کر لیتی میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ مکروہ چہرہ والا بوڑھا اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے چھپائے زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ اب بھی سر سے پاؤں تک سفید چادر اپنے بدن کے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔ جیسے کفن پہن رکھا ہو۔ مگر اس کے چہرے کی رنگت اب یرقان کے مریض کی طرح زرد تھی۔ بلکہ انار کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور جھریوں کی لکیریں بھی پہلے کی نسبت بہت مدہم تھیں۔ اس کے شانے بھی کمان کی طرح جھکے ہوئے نہیں تھے۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ لوگوں نے ایک بار پھر میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اس مرتبہ پولیس بھی ان کے ساتھ تھی۔ گاؤں کے چوکیدار نے مجھ پر بڑے ہی گھناؤنے جرم کا مرتکب ہونے کا الزام لگایا تھا کہ آدھی رات کے وقت اس نے مجھے ایک بچے کو کندھے پر اٹھائے گھر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ بچہ مر چکا تھا۔ اور اس کی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ سر نیچے کو جھول رہا تھا۔ چوکیدار نے اپنی بزدلی کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ خوف زدہ ہونے کے باعث وہ مجھے پکڑنے کی جرأت نہیں کر سکا۔ چوکیدار کے اس بے ہودہ الزام پر پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی تھی۔ کچھ سپاہی مکان کی تلاشی لینے کے لئے وہیں رک گئے اور دو سپاہی مجھے تھانہ لے گئے۔

اس تازہ افتاد سے میں بے حد پریشان ہوا۔ اگر پولیس زیر زمین خفیہ تہہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تو میرے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔

تہہ خانہ میں انسانوں اور جانوروں کے پنجرے اور ہڈیاں مجھے پھانسی کی سزا دلانے کے لئے سب سے بڑا ثبوت تھیں۔

گزشتہ رات میں نے بھی بچے کی دلدوز چیخیں سنی تھیں۔ یہ اس مکروہ بوڑھے ہی کی کارستانی ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی لاش اب تک تہہ خانہ پڑی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ بچے کی موت تہہ خانہ میں آنے کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن بچہ وہاں کیسے پہنچا۔

پولیس انسپکٹر ڈیڑھ دو گھنٹے مجھ سے سوالات کرتا رہا۔ اور میں ہر سوال کے جواب میں اسے صحیح معلومات فراہم کرتا رہا۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے جرم تھوڑا ہی کیا تھا اور بحیثیت ناول نگار کے میری شہرت بھی میرے بے داغ کردار کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

انسپکٹر بھی میری صاف گوئی اور شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے مجھے بتایا کہ ”گاؤں کے لوگ اس مکان کے بارے میں بڑے حساس



وہ میرے سامنے پہلوان کی طرح سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس قوی ہیکل بوڑھے کو دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے گولی چلا دی جس سے اس کے سفید لباس میں دوسرا رخ ہو گئے۔ لیکن وہ پہلے ہی کی طرح سینہ تانے کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ گولی چلائی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دو گولیاں اس کے سینے اور ایک پیٹ میں لگی تھیں۔

میں اس کو مطمئن دیکھ کر ڈر گیا اور تہہ خانے سے بھاگ نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے موقع کی تاک میں کھڑے ہیں۔ میں مسلح تھا۔ اور بوڑھے کو قد و قامت اور قوت کے اعتبار سے مجھ پر برتری حاصل تھی۔ لیکن مجھے حیرت ہے تو صرف اس بات پر کہ ”وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے چھپائے کیوں چیخ رہا ہے۔“

”طویل مدت تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں روشنی میں چندھیا جاتی ہیں اور وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔“ یہ خیال آتے ہی میں نے مارچ کا رخ براہ راست اس کی آنکھوں پر کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔

وہ چیختا چلاتا تہہ خانے کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

ایک ماہ مزید گزر گیا۔ اس دوران میں بوڑھے کا تہہ خانے سے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن مقصد پورا نہ ہوا۔ ان حالات میں پولیس کو اطلاع دینا میرے لئے بھی مجرم گردانا جاتا۔ خونی بوڑھے کے نہ پکڑے جانے کی صورت میں میرے لئے خطرناک تھا۔ جس کے ثبوت میں تہہ خانے میں پڑی ہوئی انسانی ہڈیاں اور بنجر موجود تھے۔ بچے کی لاش کا کچھ بچا ہوا حصہ بھی اب تک تہہ خانے میں موجود تھا۔

☆.....☆.....☆

وقت کے تیور بدلے اور پھر ایک دن حالات نے رخ تبدیل کیا اس مرتبہ ایک نیم مردہ بکرے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔ جس کی گردن شدید زخمی تھی۔

پولیس نے میرے خلاف ارتکاب جرم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ کسی بھوکے جنگلی جانور نے حملہ کر کے بکرے کو زخمی کر دیا ہے لیکن اس طرح آخر تک جرم چھپا رہ سکتا ہے۔

گاؤں والوں نے میری نگرانی کی خاطر مسلح نوجوان پر مشتمل دو گروپ ترتیب دیئے۔ ان میں سے پانچ آدمیوں کا ایک گروپ دن کے وقت نگرانی کرتا اور دوسرا گروپ رات کو ڈیوٹی پر متعین ہوتا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد آخر کار ان کو محنت کا پھل مل گیا یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے اصل مجرم کی بجائے مجھے پکڑ کر مجرم ٹھہرا دیا، وہ رات بڑی ہی بھیانک اور اداس تھی۔

اچانک میری طبیعت بے چین ہو گئی اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے آج رات کچھ ہونے والا ہے۔ نیند نہیں آرہی تھی بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر چہل قدمی کے لئے آیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ بندوق سے مسلح اکبر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گیا۔ سوچا کہ وہ شاید بوڑھے مجرم کو پکڑنے آیا ہے اسے بھی کسی نہ کسی طرح تہہ خانے کا علم ہو گیا ہے۔

میرے دل میں آئی کہ اکبر کو صحیح حالات سے آگاہ کر دینا چاہئے اس میں میری اپنی بہتری ہے۔

میں نے اکبر کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ میری باتیں بڑے انہماک سے سن رہا تھا اس کے بعد کیا ہوا۔

میں نے خود کو جیل کی کوٹھری میں پایا۔

مجھ پر الزام ہے کہ میں اکبر کا قاتل ہوں۔ اکبر کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔

حالانکہ میں خود نہیں جانتا کہ اکبر کو کس نے قتل کیا اور اگر میں یہ خیال ظاہر کر بھی دوں کہ قتل اسی بوڑھے خبیث نے کیا ہے جو تہہ خانے میں موجود ہے تو کون مانے گا؟







## عجیب و غریب

فلک زاہد - لاہور

نوجوان جب کائونٹر پر آیا تو اچنبھے میں پڑ گیا کیونکہ کائونٹر پر کوئی موجود نہ تھا لیکن ہر کام بخیر و خوبی انجام پا رہا تھا۔ کائونٹر سے جب نوجوان فارغ ہوا تو اس کا بریف کیس خود بخود ہوا میں معلق آگے کو بڑھنے لگا کہ اچانک.....

ماورائی قوت کی تحیر انگیز اور ورطہ حیرت میں ڈالتی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین کہانی

کھڑے تھے، آسمان پر چاند اور ستاروں کا نام و نشان نہیں تھا، ہر چیز یوں خاموش تھی جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہو، مارلن نے بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ہر طرف سناٹا خاموشی..... اندھیرا..... سناٹا اور ویرانی ہی ویرانی تھی۔

مارلن نے جب اپنے سامنے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، سامنے ایک بہت بڑی اونچی عمارت تھی اس پر بڑا

**بس** اسٹاپ پر بس آ کر رکی گہری خاموشی اور سناٹا ہر سو مسلط تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا مے پینٹ کوٹ کے اوپر لانگ کوٹ ڈالے اور سر پر فلیٹ ہیٹ پہنے مارلن رولنڈ (Marlun Roland) بس سے نیچے اترے۔ بس کا دروازہ آٹومینک طریقے سے کھلا اور بس اپنے اگلے مسافروں کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ سڑکیں دور دور تک ویران تھیں، درخت چپ چاپ سر جھکائے



ساعمارت کا نام لکھا تھا۔ ”ہوٹل کیلی فورنیا۔“

اس اندھیرے اور ویران علاقے میں بہت کم لوگوں کا آنا جاتا تھا، دن میں بھی یہ جگہ بہت کم ہی آمدورفت کے لئے استعمال ہوتی تھی اس جگہ یہ ہوٹل ابھی نیا بنا تھا مگر بہت جلد لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر گیا تھا وجہ اس ہوٹل کی آٹومینک سروس تھی سب کچھ اپنے آپ ہوتا تھا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کا نام شہر شہر گاؤں گاؤں پہنچ چکا تھا اس بارے میں مارلن نے بھی اپنے دوستوں اور دوسرے بے شمار لوگوں سے اس ہوٹل کی بہت تعریفیں سن رکھی تھیں مثال کے طور پر ”ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس بہت اچھی ہے یہاں سب کچھ آٹومینک ہے ہر چیز ٹائم پر ملتی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

لوگوں اور اپنے دوستوں کی زبانی ہوٹل کیلی فورنیا کی بے انتہا تعریفیں سن کر مارلن کے دل میں بھی اس ہوٹل کو دیکھنے کی خواہش جاگی اور یہ خواہش اتنی پروان چڑھی کہ آج اس کا یہ شوق اسے یہاں تک لے آیا۔ مارلن چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر شخص تھا وہ نیویارک سے کام کے سلسلے میں کیلی فورنیا آیا تھا دن بھر کی مصروفیت کے بعد مارلن کو اب رات گزارنے کے لئے ایک چھت درکار تھی جو اسے ہوٹل کیلی فورنیا کی صورت میں مل گئی تھی۔

یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں آٹومینک ہوٹل اور ریسٹورنٹس کوئی نئی بات نہیں، آئے دن یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے واقعات عام ہیں۔ مارلن نے گہری سانس لی اور ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ ہوٹل جدید طرز کا خوبصورت ہوٹل تھا روزانہ دور دور سے سیاح اسے دیکھنے کے لئے آتے، غیر ملکی یا پھر دوسرے شہر سے آیا ہوا کوئی بھی شخص جب کیلی فورنیا آتا تو ہوٹل کیلی فورنیا کا دورہ کرنا نہ بھولتا ہوٹل سے واپسی پر سب کے چہروں پر خوشی اور زبان پر تعریفیں ہوتیں۔ ہوٹل کیلی فورنیا کی طویل سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مارلن جب اس کے صدر دروازے پر پہنچا تو دروازہ اپنے آپ کھل

گیا مارلن نے ہوٹل کے اندر قدم رکھ دیا۔

مارلن کے اندر قدم رکھتے ہی کہیں سے لاؤڈ اسپیکر پر ایک نسوانی آواز مارلن کی سماعت سے ٹکرائی ”ویلم ٹوڈا ہوٹل کیلی فورنیا سر۔“ مارلن نے آواز کے تعاقب میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تاکہ یہ جان سکے کہ آواز کہاں سے آئی مگر مارلن کو کہیں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ پورا ہوٹل مدہم روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، اتنا وسیع و عریض اور شاندار ہوٹل مارلن نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ہوٹل جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ پہلی ہی نظر میں یہ ایک معیاری اور مہنگا ہوٹل معلوم ہوتا تھا۔

مارلن نے کئی ہوٹل روشنیوں سے جگمگاتے دیکھے تھے مگر یہ پہلا ہوٹل تھا جس کی مدہم روشنیوں نے اس کے ماحول کو خوبصورت اور رومانوی بنا دیا تھا ہوٹل کیلی فورنیا سب سے منفرد اور دل فریب ہوٹل تھا جو سب کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لیتا تھا یہ ہوٹل مارلن کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ ”مہربانی فرما کر اپنی شناخت سامنے کاؤنٹر پر پڑے رجسٹر پر درج فرمائیں۔“ لاؤڈ اسپیکر سے آئی ہوئی نسوانی آواز ایک بار پھر ابھری۔ اس بار آواز کی سمت کا تعاقب کرنے کی بجائے مارلن سیدھا چلتا ہوا سامنے کاؤنٹر پر آیا۔ جہاں پیچھے کوئی نہیں تھا۔ پورا ہوٹل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا اور خالی معلوم ہوتا تھا۔

مارلن کو بالکل حیرت نہیں تھی کیونکہ یہاں آنے سے پہلے وہ اپنے دوستوں اور باقی لوگوں سے یہ سب سن چکا تھا کہ ہوٹل کیلی فورنیا کی مدہم روشنیاں خاموشی اور آٹومینک سروس ہی اس کی خاصیت ہے۔ مارلن نے کاؤنٹر پر پہنچ کر دوبارنیل بجائی جس کے جواب میں کاؤنٹر پر پڑا رجسٹر اپنے آپ کھلتا چلا گیا۔

مارلن نے گھبرا کر اپنے گرد و نواح میں نظریں دوڑائیں تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ ہوٹل کا کنٹرول روم کدھر ہے مگر مارلن کو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آیا، بے شک مارلن جانتا تھا کہ یہاں آکر اسے ان تمام چیزوں کا سامنا کرنا ہوگا جسے انسانی سوچ قبول نہیں کرتی مگر اب جبکہ اس کے ساتھ یہ ذاتی طور پر ہو رہا تھا وہ کچھ سہم گیا تھا اس نے



میں چلے گئے۔ جس کے فوراً بعد دراز بند ہو گیا اور لاؤڈ اسپیکر سے لڑکی کی آواز ابھری۔ ”شکریہ۔“ اس ناقابل یقین منظر کو مارلن نے اپنے مکمل ہوش و حواس میں جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا یہ عقل کو حیران کر دینے والا منظر اس کے لئے حیرت و بے یقینی سے بالکل کم نہیں تھا۔ یکا یک کاؤنٹر پر کہیں سے ایک چابی نمودار ہوئی جس کے ساتھ روم نمبر کا (Tag) بھی لگا ہوا تھا۔ مارلن کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جس کے ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر سے آتی ہوئی لڑکی کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

”روم نمبر 89 اب آپ کا ہوا۔ اسے اپنا ہی جانیے شکریہ۔“

مارلن نے کاؤنٹر پر پڑی چابی اٹھائی ہی تھی کہ معا اس کے ہاتھ میں جھولتا بریف کیس اپنے آپ اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ مارلن نے بے اختیار اپنے بریف کیس کو دیکھا جو کہ اب آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلے تو مارلن کچھ سمجھ نہ سکا مگر جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ بریف کیس آٹومیٹک اسے اپنے کمرے کی جانب لے جا رہا ہے۔ یہ سوچ آتے ہی مارلن خود بھی اپنے بریف کیس کے پیچھے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ بریف کیس ایک ایلیویٹر (Elevator) کے سامنے آ کر رکھا جس کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ بریف کیس لفٹ کے اندر داخل ہوا مارلن نے بھی اس کی تقلید کی اور لفٹ کے اندر چلا گیا۔ اپنے آپ دوسرے فلور کا بٹن پیش ہوا اور لفٹ ایک جھٹکا کھا کر اوپر کو چلنے لگی۔ مارلن لفٹ کے اندر کھڑا بڑے غور سے اپنے بریف کیس کو دیکھ رہا تھا جو بدستور ہوا میں معلق تھا۔

دوسرے فلور پر پہنچ کر لفٹ کا دروازہ آٹومیٹک کھل گیا اور بریف کیس سمیت مارلن بھی لفٹ سے باہر آ گیا۔ دوسرے فلور پر بھی خاموشی کا راج تھا اور یہ بھی خالی معلوم ہوتا تھا، چلتے چلتے مارلن کی نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا۔ ”NO Noise“ مارلن کو ہوٹل میں اس قسم کی عبارت پڑھ کر بے حد حیرانی

ریسٹورنٹس میں انسانوں کی جگہ روبوٹ کام کرتے دیکھے تھے جو لوگوں میں کھانا تقسیم کرتے تھے اور بدلے میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے تھے اس کے علاوہ اس نے برطانیہ کے ریسٹورنٹس میں ہوا میں اڑتی ٹرے بھی دیکھی تھی جن پر کھانا رکھ کر لوگوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور انہیں کنٹرول روم میں بیٹھے لوگ کمپیوٹر کی مدد سے کنٹرول کرتے ہیں وہ سب تو قابل قبول ہے مگر یہاں تو ہر چیز آٹومیٹک تھی جس کا تصور ہی ناممکن ہے۔

”Identification please“ لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی لڑکی کی آواز نے مارلن کو چونکا دیا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا مارلن کے سامنے رجسٹر کھلا ہوا تھا اور اس کے اوپر پین (Pen) موجود تھا۔ مارلن نے نا سمجھنے کے سے انداز میں پین اٹھایا اور نام کی جگہ ”مارلن رولنڈ“ درج کیا اور Stay کے خانے میں ایک رات لکھ کر پین واپس رکھ دیا۔

”Confirmed“ لاؤڈ اسپیکر سے لڑکی کی آواز آئی۔ مارلن نے ایک بار پھر ہوٹل کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں یہ دیکھنے کے لئے کہ کیمرے یہاں لگے ہیں مگر اسے ایک کیمرہ بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ مارلن نے خود ہی اپنی سوچ کو فضول سمجھ کر جھٹک دیا یہ سوچ کر کے کیمرے محفوظ جگہوں پر لگائے جاتے ہیں جنہیں انسانی آنکھ بہ آسانی تلاش نہیں کر سکتی۔ پورا ہوٹل خالی معلوم ہو رہا تھا جس وجہ سے مارلن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس وسیع و عریض ہوٹل میں اکیلا ہے۔ خیر مارلن نے اس معاملے پر زیادہ غور نہیں کیا اور اگلی آواز آنے کا انتظار کرنے لگا اس کی توقع کے عین مطابق لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی لڑکی کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”برائے مہربانی ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ تین ہزار ڈالر جمع فرمائیے۔“

مارلن نے لڑکی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنے والٹ میں سے تین ہزار ڈالر کے نئے نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ کاؤنٹر کا دراز اپنے آپ کھلا اور تین ہزار ڈالر ہوا میں اڑتے ہوئے اپنے آپ دراز



ہوئی۔ کیونکہ جہاں تک اس کا خیال تھا تو یہ عبارت عموماً لائبریریز میں استعمال ہوتی تھی ایسی جگہوں پر تو ”NO Smoking“ کا لفظ زیادہ عام تھا مگر یہاں تو سلسلہ ہی کچھ الٹ تھا۔ خیر مارلن نے زیادہ نہ سوچا اور چلتا رہا چلتے چلتے بریف کیس اور مارلن راہ داری میں آئے اور روم نمبر 89 کے سامنے آ کر رک گئے۔ بھورے رنگ کے دروازے پر 89 نمبر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مارلن کے ہاتھ سے چابی اپنے آپ اڑتی ہوئی کی ہول میں پوسٹ ہو گئی اور دروازہ اپنے آپ اندر کھل گیا۔ مارلن کی حالت کو کوئی مخصوص لفظ نہیں دیا جاسکتا تھا یہ سب دیکھ کر وہ حیران تھا..... الجھن میں تھا..... بھروسہ نہیں کر پاتا تھا یا پھر سمجھ نہیں پاتا تھا..... ان میں سے الفاظ اس کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتے تھے وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔

بریف کیس ہوا میں اڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ مارلن بھی اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔ کمرہ بہت خوبصورت اور جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کمرے کے فرش پر نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں بہت بڑا بیڈ موجود تھا جس کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبلز پڑے تھے۔ اور ان پر ٹیبل لیپ نہایت عمدگی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایچ واش روم کے ساتھ لکڑی کا بہت بڑا ڈریننگ ٹیبل بھی موجود تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں بڑے بڑے گلدان کھڑے تھے جن کے اندر سفید رنگ کے آرٹیفیشل پھول بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ایک بڑی سی ایل سی ڈی بھی دیوار پر نصب تھی جس کے ساتھ ہی گرمیوں کے لئے ایرکنڈیشنڈ اور سردیوں کے لئے ہیٹر بھی موجود تھا۔

مارلن کو کمرہ بہت پسند آیا اس نے اپنے بریف کیس کی طرف دیکھا جو کہ اب ایک طرف بے جان کھڑا تھا۔ مارلن نے کی ہول میں سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور فریش ہونے کے لئے واش روم بھی چلا گیا، ہاتھ روم نیلی ٹائلز کا بنا بہت اچھا

لگ رہا تھا ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ مارلن نے شاور لینے کا فیصلہ کیا اور بریف کیس میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلا گیا تقریباً کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد مارلن شاور لے کر آیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سامنے بیڈ پر ٹرے پڑی تھی جس پر چائے کی بھاپ اڑاتی پیالی کے ساتھ گرما گرم کھانا بھی موجود تھا۔ مارلن نے حیرت سے دروازے کی جانب دیکھا جو ہنوز اسی طرح بند تھا جس طرح مارلن چھوڑ کر گیا تھا۔

مارلن نے سوچا یہاں ہر چیز آٹومٹک ہے تو ہوٹل کے کنٹرولز نے دروازہ بھی اپنے آپ کھول کر یہ کھانا پہنچا دیا ہوگا اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے زیادہ نہ سوچتے ہوئے۔

مارلن تویہ سے اپنے بال اور بدن کو خشک کرنے لگا اس کی حیرت ختم ہو چکی تھی مگر جو بات اسے پسند نہیں آئی تھی وہ یہ تھی کہ یہاں کسی قسم کی پرائیویسی نہیں تھی۔ ہوٹل کا عملہ ہر پل اپنے گاہکوں پر نظر رکھے ہوئے تھا جو اس کھانے کی وجہ سے ثابت ہو گیا تھا اور یہ اخلاقی طور پر ایک غلط حرکت تھی۔ ”کوئی بھی شخص اپنے کمرے میں کسی بھی حالت میں ہو سکتا ہے۔“ یہ سب سوچتے ہوئے مارلن خود کو بے سکون محسوس کرنے لگا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے میں ڈالی مگر اسے خفیہ کیمرے کہیں نظر نہیں آئے۔

مارلن نے نائٹ ڈریس پہن کر ہیٹر آن کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس نے مارلن کو بالکل بھی اس قدر متاثر نہیں کیا تھا جس قدر اس کے دوست اور باقی لوگ تعریفوں کے پل باندھتے تھے ان کے منہ سے ہوٹل کیلی فورنیا کی باتیں سن کر اس کا تجسس اسے یہاں کھینچ تولایا تھا مگر اب اس کا تجسس جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ اسے یہ سب ایک دم فضول لگ رہا تھا۔

مارلن پرانے خیالات کا آدمی تھا اسے اس طرح کی جدید ٹیکنالوجی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ کھانا بہت



مزید ارتھا مارلن نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس نے خالی برتنوں کو ایک طرف رکھ کر بیٹر بند کیا اور کمرے کی لائٹیں آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تھکان کی وجہ سے پلک جھپکتے ہی مارلن میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔ نجانے وہ کتنی دیر سویا ہوگا کہ۔

رات کے کسی پہ مارلن کی آنکھ کھل گئی کچھ دیر تو وہ یونہی لیٹا دو بارہ سونے کی کوشش کرتا رہا مگر نیند اب اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی، مارلن کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی کیونکہ جتنا وہ تھکا ہوا تھا اسے مد نظر رکھتے ہوئے تو اسے گہری نیند میں ہونا چاہئے تھا۔

کروٹیں بدل بدل کر جب مارلن تنگ آ گیا تو وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور وال کلاک کی جانب نظریں اٹھائیں جو آدھی رات کے تین بج رہی تھی، گہری خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک سر پر تھوڑے برسائی معلوم ہو رہی تھی، مارلن خالی الذہن ٹک ٹک لگائے گھڑی کو گھور رہا تھا جب ہی باہر سے اسے کوئی آہٹ سنائی دی۔

مارلن نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا دروازے کے نیچے کسی کا سایہ پڑ رہا تھا مارلن بیڈ سے اٹھا اور بے پاؤں چلتا ہوا دروازے تک آیا۔

باہر سے مسلسل ہلکی پھلکی آوازیں آرہی تھیں۔

مارلن دروازے سے کان لگا کر باہر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آوازیں اب کچھ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ دو لوگ محو گفتگو تھے ایک نسوانی آواز تھی اور دوسری مردانہ "شاید ہوٹل میں کوئی جوڑا آیا ہے۔" مارلن نے سوچ کر آہستگی سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ہلکا سا دروازہ کھول کر ایک آنکھ کے ذریعے باہر جھانکا، باہر واقعی ایک لڑکی اور ایک لڑکا اپنے کمرے کے سامنے بانہوں میں بانہیں ڈال کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ان کا کمرہ مارلن کے سامنے والے کمرے سے دو تین کمرے چھوڑ کر تھا ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں شاید ان کا سامان آٹو میٹنگی ترتیب سے رکھا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں کمرے سے آوازیں آنا بند ہو گئیں اور دونوں لڑکا لڑکی ہنستے مسکراتے کمرے میں چلے گئے اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ مارلن بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند ہی کرنے جا رہا تھا کہ۔

اچانک ایک قد آور پینٹ کوٹ میں ملبوس کالے بالوں والا لڑکا ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھا مارلن کے کمرے کے سامنے سے گزرا اس کی پشت مارلن کی طرف تھی جس وجہ سے مارلن اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا وہ لڑکا چلتا ہوا اس جوڑے کے کمرے کے باہر آیا اور کمرے کے دروازے کے اندر سے بغیر کسی رکاوٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر مارلن کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ دروازہ جیسے اس لڑکے کی راہ میں حائل ہی نہیں تھا جیسی تو وہ ٹرے سمیت بہ آسانی اندر داخل ہو گیا تھا۔

مارلن نے فوراً سے پیشتر بنا آواز پیدا کئے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر ہراساں نگاہوں سے دروازے کو دیکھنے لگا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لڑکا اس کا دروازہ بھی پار کر کے آجائے گا مارلن نے حیرت و خوف سے اپنے گال پر چٹکی بھری یہ جاننے کے لئے کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا..... لیکن نہیں..... اس نے جو دیکھا تھا حقیقت میں دیکھا تھا۔

مارلن کا خوف مزید بڑھ گیا وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑتا ہوا اپنے بیڈ پر آیا اور اپنے اوپر لحاف اوڑھ کر اس میں خود کو اچھی طرح چھپالیا۔ اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا وہ عمر کے اس حصے میں تھا جس میں عموماً لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں مگر مارلن مضبوط اعصاب کا مالک ثابت ہوا تھا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کا راز بے نقاب ہو چکا تھا۔ ہوٹل آتے آتے اور یہاں پہنچنے کے بعد بھی مارلن کو مختلف سوچوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور اب اس کے ہر سوال کا جواب اس کو مل چکا تھا۔ سائنس جیسے جدید دور میں بھی ان تمام چیزوں کا اپنے آپ کام کرنا جسے انسانی سوچ قبول نہیں کرتی آج بھی ممکن نہیں یہی سب



مارلن کا ذہن بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔  
ہوٹل کیلی فورنیا کوئی آٹومینک ہوٹل نہیں بلکہ جن  
بھوتوں کا بنایا ایک آسیب زدہ ہوٹل تھا۔  
جن بھوتوں کے متعلق مارلن نے بہت کچھ سن  
رکھا تھا مگر ان کی دنیا میں موجودگی کا یقین اسے آج  
ہو گیا تھا۔

مارلن اس دن کو کوئے لگا جس دن ہوٹل کیلی  
فورنیا دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں جا گئی تھی۔ وہ  
دل ہی دل میں اپنے دوستوں اور دوسرے لوگوں کو برا  
بھلا کہنے لگا جو بڑے شوق سے ہوٹل کیلی فورنیا کی  
تعریفیں کرتے تھے۔  
تھوڑی بہت نیند جو مارلن کو آئی تھی وہ بھی یہ  
سوچ کر اڑ گئی تھی کہ وہ محفوظ جگہ نہیں بلکہ جنات  
اور بھوتوں وغیرہ کے قبضے میں ہے جو کسی بھی وقت اس  
کی جان لے سکتے ہیں۔

مارلن کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا اسے سمجھ نہیں  
آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے بھاگ جائے یہاں سے مگر کیسے  
اس سے آگے مارلن کا دماغ ریڈنگل دے دیتا۔  
ایک عجیب سی شش و پنج میں وہ مبتلا تھا جس سے  
نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مارلن کا دماغ یہ  
سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا تھا کہ وہ لڑکا وہ جن اسے ہی  
کیوں نظر آیا؟ کیا اس جوڑے کو بھی وہ لڑکا دروازے  
سے اندر داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا ہوگا؟ ”نہیں.....“ مارلن  
نے خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی کیونکہ اگر وہ لڑکا اس  
جوڑے کو دکھائی دیا ہوتا تو ممکن ہے لڑکا نہ سہی مگر وہ لڑکی  
ضرور چیخ اٹھتی اور یہاں سے نکلنے کے لئے خوب دادیلا  
کرتی مگر ایسا کچھ سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

ہوٹل میں بدستور خاموشی کا راج تھا یعنی وہ لڑکا  
اس جوڑے کو دکھائی نہیں دیا صرف انہیں ہوا میں متعلق  
وہ کھانے کی ٹرے دکھائی دے گئی، مارلن سوچتا رہا مگر  
اپنے اس سوال کا جواب وہ کسی بھی طرح حاصل نہ کر سکا  
کہ وہ لڑکا اسے ہی کیوں دکھائی دیا؟ جس طرح ہوٹل  
میں آتے ہوئے اسے سب آٹومینک نظر آ رہا تھا تو انہیں

سب کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے بھی صرف کھانے کی  
ٹرے دکھائی دینی چاہئے تھی مگر اسے تو ٹرے کو سنبھالنے  
والا بھی نظر آیا تھا جس وجہ سے اس پر روح فرساراز کا  
انکشاف ہوا تھا۔

”کیوں؟ آخر کیوں اسے ہی وہ جن زادہ  
نظر کیوں آیا؟“

بہت کوشش کے باوجود بھی مارلن اس سوال کا  
جواب حاصل نہ کر سکا۔

”رات کا نصف پہر جب سب انسان نیند کی  
وادیوں میں چلے جاتے ہیں تب ایسی مخلوقات جاگ اٹھتی  
ہیں اور دن کی روشنی میں جب انسان جاگ جاتا ہے  
تو ایسی مخلوقات سو جاتی ہیں یا پھر کہیں روپوش ہو جاتی ہیں۔  
شاید اسی لئے وہ جن زادہ رات کے اس پہر مجھے نظر آیا؟“  
مارلن نے سوچا مگر یہ بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔

مارلن سوچتا رہا مگر اس کا ذہن ماؤف ہوتا  
جا رہا تھا اس نے یہ سوچ کر اس بارے میں زیادہ نہ سوچا  
کہ ممکن ہے وہ لڑکا جن زادہ نہ جانتا ہوگا کہ کسی نے اسے  
دیوار کے اندر سے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے کیونکہ وہ اپنی  
ہی دھن میں ناک کی سیدھ میں جا رہا تھا اور اس کا مجھے  
نظر آ جانا اتفاق سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا اگر اسے اس  
بات کا علم ہوتا تو وہ ابھی آ کر اس کا گلا گھونٹ دیتا، مارلن  
نے ایسا سوچ تو لیا مگر پھر بھی اس کی تسلی نہ ہو سکی یہی  
سوچ سوچ کر اس کی جان نکلتی جا رہی تھی کہ وہ بھوتوں  
اور جنات سے بھری بلکہ یوں کہا جائے تو مناسب ہوگا  
کہ ان کے علاقے میں اکیلا آدم زاد ہے۔ کیا پتہ کون  
کہاں سے اسے دیکھ رہا ہو؟ کیا پتہ اس کے آس پاس  
ہی کوئی ہو؟ نجانے کب کیا کر دے؟ اسی طرح کے  
دیگر سوالات نے مارلن کا سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا  
اس کی تھکان اس کی نیند گویا ختم ہو گئی تھی یہی سوچ سوچ  
کر وہ دہشت زدہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا بریف کیس ہوا  
میں معلق نہیں تھا بلکہ ایک جن زادہ نے پہلے فلور سے  
دوسرے فلور تک اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔

مارلن کو بے چینی سے صبح کا انتظار تھا، وہ یہاں



صرف ایک رات گزارنے کے لئے آیا تھا اس لئے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اور پلٹ کر یہاں آنا تو درکنار یہاں کے بارے میں خیال بھی نہ کرنے کا خود سے عہد کر چکا تھا، مارلن کا بدن بدستور خوف سے کانپ رہا تھا اور ذہن مختلف سوچوں کی زد میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ہر وہ شخص جو یہاں رہ کر گیا ہے، اس جن زادے کا دیوار کے اندر سے گزر جانے والا منظر دیکھ لیتا تو یقیناً وہ ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریفیں نہ کرتا، نہ ہی کبھی کسی کو یہاں آنے کا مشورہ دیتا۔

مارلن خود سے عہد کر چکا تھا کہ وہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا کیونکہ امریکہ کے علاوہ دیگر ملکوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوٹل کیلی فورنیا کی گرویدہ تھی ایسے میں اس اکیلے کی کون سنے گا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریف کرے گا بلکہ وہ نہ صرف اس کو نا پسندیدہ قرار دے گا اور یہاں آنے سے ان سب کو روکنے کی کوشش کرے گا جو اس سے ہوٹل کیلی فورنیا میں رات گزارنے کے تجربے کے بارے میں پوچھیں گے یا پھر وہ وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے۔

اصل حقیقت وہ ہرگز نہیں بتائے گا بس اتنا کہہ دے گا کہ اسے جدید ٹیکنالوجی پسند نہیں آئی اور نہ ہی کبھی وہ اس طرح کا تجربہ دوبارہ کرنا پسند کرے گا لہذا میرا مشورہ تم سب کو یہی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں بھی عام ہوٹلوں کا انتخاب کرو تو بہتر ہے۔

مارلن کی سمجھ میں اب ساری بات آگئی تھی کہ کیوں ہوٹل کیلی فورنیا کی روشنیاں مدہم تھیں کیونکہ یہ تمام جن زادے اندھیرے اور ویرانوں میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے سورج کی روشنی یا پھر کسی بھی طرح کی تیز روشنی یہ سب برداشت نہیں کر سکتے جس طرح ایک آدم زاد اندھیرا اور ویرانہ برداشت نہیں کر سکتا۔

”NO Noise“ کی عبارت بھی اب مارلن کی سمجھ میں آگئی تھی جہاں آدم زاد سناٹا اور خاموشی برداشت نہیں کر سکتا وہیں یہ آتش زاد شور شراب برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بھی ہوٹل کیلی فورنیا سیاسی لوگوں اور نئے نئے شادی

شدہ جوڑوں کی پہلی ترجیح تھا کیونکہ سیاسی لوگوں کو اپنے دفتری کام کے لئے اور شادی شدہ جوڑوں کو نئی مومن منانے کے لئے ایک پرسکون ماحول میسر ہوتا تھا جو انہیں صرف ہوٹل کیلی فورنیا کی ہی صورت میں مل سکتا تھا۔

مارلن مسلسل سوچتا رہا مگر پھر بھی یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ سب جنات ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ سب نقصان پہنچانا چاہتے ہیں؟ نہیں اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اب تک جتنے لوگ یہاں سے ہنسی خوشی رہ کر گئے ہیں زندہ سلامت واپس نہ جاتے، یہ سوچ آتے ہی مارلن نے اپنی ہی سوچ کی نفی کر دی۔ تو پھر ان کا کیا مقصد ہے؟ مارلن اپنے ذہن پر زور دیتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

کیا یہ سب ہم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں؟ اس بھری دنیا میں ہماری خدمت کر کے اپنے لئے تھوڑی سی جگہ چاہتے ہیں؟ کیا پتہ ہمارا بھروسہ جیت کر ہمیں دھوکہ ہی دینا چاہتے ہوں؟ مارلن سوچتا رہا مگر کوئی بھی تسلی بخش جواب حاصل نہ کر سکا۔ مارلن بدستور لحاف کے اندر منہ چھپائے سوچے جا رہا تھا کہ جتنے بھی لوگ یہاں رہ کر گئے ہیں کیا وہ اس بارے میں جانتے ہوں گے جس کا انکشاف اس پر ہوا ہے؟ ممکن ہے نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کوئی نہ تعریف کرتا نہ ہی کسی آدم زاد کو یہاں آنے کا مشورہ دیتا۔

مارلن نے ڈر ڈر کر آہستہ آہستہ اپنے اوپر سے لحاف کھینچا اور ہر اسان نگاہوں سے کمرے کے چاروں کونوں میں نظریں دوڑائیں سب کچھ پرسکون تھا۔ مارلن نے فوراً سے پہلے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی، کمرے کے روشن ہوتے ہی مارلن کو کچھ ڈھارس ہوئی وہ واپس اپنے بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور غور غور سے دروازے کو گھورتا رہا۔ ایک عجیب سی خواہش نے مارلن کے دل میں سراٹھایا کہ کیوں نہ وہ باہر جا کر اس جوڑے کا دروازہ کھٹکھٹائے یہ جاننے کے لئے کہ وہ خیریت سے ہیں یا پھر مر گئے؟ کیونکہ سناٹا بدستور چاروں طرف اپنے پر پھیلانے ہوئے تھا پتے کے ہلنے کے برابر بھی آواز نہیں تھی۔



مارلن اپنے سانس لینے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ مگر مارلن نے خود ہی اپنے دل میں آئی اس خواہش کو فضول سمجھ کر جھٹک دیا۔ باہر جانے کے نام سے ہی اس کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مارلن نے لائٹ جلتی رہنے دی اور دوبارہ بیڈ پر لیٹ کر اپنے اوپر لحاف اوڑھ لیا کافی دیر یونہی گزر گئی کچھ دیر بعد مارلن نے لحاف ہٹا کر آنکھوں پر سے سر کا کرگھڑی کی جانب دیکھا جو صبح کے چار بج رہی تھی، صبح ہونے میں ابھی بھی دو گھنٹے باقی تھے مگر یہ دو گھنٹے دو صدیوں کے برابر تھے۔

مارلن سونا نہیں چاہتا تھا اسی خوف سے کہ نجانے صبح کا سورج وہ دیکھ بھی سکے گا یا نہیں مگر نیند نجانے کہاں سے اس پر بری طرح غلبہ پانے لگی تھی اس کی پلکیں جڑنے لگی تھیں، مارلن نے خود کو جگائے رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا نیند اس پر غلبہ پاتی پاتی آخر اس کو خوابوں کی دنیا میں پہنچانے میں کامیاب ہو گئی نجانے نیند کا سلسلہ کب تک رہا۔

مارلن کی جب آنکھ کھلی تو سیدھی سامنے لگی وال کلاک پر چلی گئی صبح کے آٹھ بج رہے تھے مارلن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سو رہا تھا اور اب وہ زندہ ہے۔

مارلن نے حیرانی سے اپنے آپ کو دیکھا وہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے؟ اس کا یقین کرنے کے لئے مارلن نے اپنے بازوؤں پر زور کی چٹکی لگائی ہلکی سی درد نے اس کو یقین دلایا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا، مارلن کی حیرت ہنوز اپنی جگہ قائم تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ میں زندہ ہے۔

گزشتہ رات مارلن نے نہ سونے کی بہت ناکام کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا تھا لیکن اب نہ ہی وہ سو کر زندہ اٹھا تھا بلکہ صبح سلامت بھی تھا جس پر وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

گزشتہ رات کا تمام واقعہ اسے اچھی طرح یاد تھا اس لئے اپنی جگہ اس کی حیرت ٹھیک بھی تھی اور دو چاند بھی مارلن جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اس نے

جھٹ سے اپنے اوپر سے لحاف اتارا اور بریف کیس میں سے کپڑے نکال کر شاور لینے کے لئے چلا گیا چند منٹ بعد جب وہ شاور لے کر باہر آیا تو اس کے قدم وہیں منجمد ہو گئے اور آنکھیں حیرت و خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے مارلن کے بیڈ پر ناشتے کی ٹرے پڑی تھی جس پر گرم گرم انڈہ سلاکس اور چائے کا کپ موجود تھا ناشتے کے پہلو میں سرخ گلابوں کے پھولوں کا گلدستہ بھی پڑا تھا۔ جس کے ساتھ ایک خط بھی موجود تھا۔

مارلن نے حیرت و خوف سے پورے کمرے میں یوں نگاہ دوڑائی گویا ناشتہ دے کر جانے والا ادھر ہی کہیں موجود ہو۔ مگر پورا کمرہ خالی اور پرسکون تھا مارلن چلتا ہوا بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا، ناشتے اور پھولوں کے گلدستے کو نظر انداز کر کے خط اٹھا لیا سفید رنگ کا کاغذ فولڈ تھا جسے کھول کر مارلن پڑھنے لگا۔

”پیارے دوست مارلن رولنڈ۔

ہم جانتے ہیں کہ کچھلی رات تم پر کس قدر اذیت بن کر گزری جس کے لئے ہم خلوص دل سے معذرت خواہ ہیں مگر ایسا کرنا ضرور تھا جی ہاں جناب! حیران نہ ہوں ہم آپ کو سب بتاتے ہیں دراصل تم اکیلے نہیں ہو جس پر یہ قیامت گزری تم سے پہلے جتنے بھی لوگ یہاں رہ کر گئے ہیں ان سب کے ساتھ بھی ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑتا کہ تم سب ہماری حقیقت جان سکو کہ ہم کون ہیں اگر یقین نہ آئے تو بے شک اپنے کسی دوست سے پوچھ لینا جو ہوٹل کیلے فورنیا میں رات گزار کر گیا ہو۔

یہاں سے جانے والا اسی ڈر سے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کرنا کہ آیا گلا اس بات پر یقین کرے بھی کہ نہیں؟ تم پہلے نہیں ہو جسے ہم یہ خط لکھ رہے ہیں ہم ہر اس شخص کو اپنی اصلیت دکھا کر اسے خط لکھتے ہیں جو یہاں رات گزار کر جانے لگتا ہے۔ تم انسانوں کا ہم کوئی نقصان نہیں چاہتے صرف اور صرف تم آدم زادوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں تاکہ صدیوں سے چلتی اس مٹی اور آتش کی جنگ کا خاتمہ کر سکیں اور تم انسانوں کے ذہن میں بنی اپنی غلط تصویر کو بدل سکیں۔



تم انسانوں کی طرح ہم میں بھی اچھے برے جن موجود ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ پورا جن قبیلہ ہی برا ہو، امید ہے کہ تم ہماری باتوں کو سمجھو گے اب یہ تم پر ہے کہ تم ہماری دوستی قبول کرتے ہو یا اس کو ٹھکراتے ہو۔ ہماری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں۔ فقط تمہارے دوست، ہوٹل کیلی فورنیا۔“

مارلن کے ہاتھوں سے کاغذ لرز کر زمین پر گر گیا سب کچھ دیکھ لینے اور اب یہ خط پڑھ لینے کے باوجود مارلن کو یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی اس نے اپنی زندگی کا ناقابل فراموش تجربہ ایک ہی رات میں دیکھ لیا تھا جس کے بعد یہ خط، اس کا یقین پختہ، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

دفعاً باہر سے بے شمار لوگوں کی ادھر سے ادھر چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں مارلن کو سنائی دینے لگیں مارلن نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا اور چلتا ہوا دروازے تک آیا اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ لوگوں کی بڑی تعداد ہوٹل کیلی فورنیا میں ٹھہرنے کے لئے آئی تھی۔ تمام لوگ خوشی سے ادھر سے ادھر گھومتے پھر رہے تھے ان کا سامان ہوا میں اپنے آپ کمروں میں ترتیب سے رکھا جا رہا تھا کافی گہما گہمی تھی۔ گزشتہ رات ہوٹل میں چھائی وحشت زدہ خاموشی اس وقت اس کی نفی کر رہی تھی، اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر مارلن کے دل کو حد درجہ تسلی ہوئی وہ ابھی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا سب کو دیکھ ہی رہا تھا جب ہی اس کی نظر اس جوڑے پر پڑی جو گزشتہ رات ہی ہوٹل کیلی فورنیا میں آیا تھا، پچھلی رات کی طرح اب بھی ان دونوں کے چہرے خوشی سے متمتع رہے تھے۔

مارلن کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”شاید یہ لوگ یہاں دیر تک ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہاں سے جانے سے ایک رات پہلے ان پر بھی مجھ جیسی قیامت گزری ہوگی۔“ مارلن نے سوچا اور دروازہ بند کر کے بیڈ پر براجمان ہو گیا اور ناشتہ کرنے لگا اس نے ناشتہ کے دوران بہت کچھ سوچ لیا تھا ہر شخص کو ہنستا مسکراتا دیکھ

کر اور یہاں سے صحیح سلامت جاتے دیکھ کر مارلن بھی خوش اور مطمئن ہو چکا تھا کیونکہ وہ خود بھی ہوٹل کیلی فورنیا سے صحیح سلامت واپس جا رہا تھا۔

مارلن بھی اب باقی لوگوں کی طرح اس ہوٹل کیلی فورنیا کا گرویدہ ہو گیا تھا جو نہ صرف لوگوں سے ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریف کرے گا بلکہ انہیں یہاں آنے کا مشورہ بھی دے گا مارلن ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس اور پھولوں کا گلہ دستہ سنبھالا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ چلتا ہوا لفٹ تک آیا جس کے ذریعے وہ نچلے فلور پر آ گیا۔ لوگوں کی بڑی تعداد ہوٹل کے داخلی دروازے سے آ جا رہی تھی مارلن کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی وہ چلتا ہوا ایک کاؤنٹر تک آیا تقریباً سب ہی کاؤنٹرز پر لوگوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ مارلن بھی ان میں شامل ہو گیا اور اپنی باری آنے پر مارلن نے چابی واپس کاؤنٹر پر رکھ دی جس کے بدلے اس کے سامنے نجانے کہاں سے دوبارہ سفید رنگ کا ایک کاغذ نمودار ہوا، مارلن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور اس نے وہ کاغذ اٹھالیا اس کا رخ باہر جانے والے دروازے کی جانب تھا وہ ابھی صدر دروازہ عبور کرنے ہی والا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی نسوانی آواز مارلن کی سماعت سے ٹکرائی۔

”ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس استعمال کرنے کا بہت بہت شکریہ سر۔“ اس کے ساتھ ہی مارلن ہوٹل کیلی فورنیا سے باہر آ گیا۔ سورج کی چھن چھن کرتی کرنیں زمین پر پڑ رہی تھیں خاصا خوش گوار دن تھا۔ مارلن ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سفید کاغذ پڑھنے لگا جس میں کچھ یوں درج تھا۔

”ہماری دوستی قبول کرنے کا بہت شکریہ ہمارے دوست۔ امید ہے تمہیں ہماری مہمان نوازی پسند آئی ہوگی۔ ہمیں اس دن کا شدت سے انتظار ہے جب تم ادھر کا دوبارہ رخ کرو گے، ہمیں تمہاری خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا۔ ہوٹل کیلی فورنیا۔“ مارلن کے لبوں پر چھائی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔





وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

## گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب رولوکا اپنے آبائی گاؤں میں تھا، روحانیت میں کمال حاصل کر چکا تھا اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق پریشان حال لوگوں کے مسائل حل کر دیا کرتا تھا، ایک روز رولوکا اپنے آستانے میں بیٹھا تھا اور چند لوگ اس کے سامنے موجود تھے کہ اچانک ایک جوان عورت آئی اور رولوکا کے سامنے بیٹھتے ہی زار و قطار رونے لگی، رولوکا نے جلدی سے ٹھنڈا پانی منگایا اور عورت کو پلا دیا، پانی پینے کے بعد عورت کے حواس بحال ہوئے تو رولوکا کے پوچھنے پر عورت گویا ہوئی۔ ”محترم وچ ڈاکٹر میرا نام لوری ہے اور اب میں مسز نارمن ہوں اور پھر اس عورت نے اپنی پوری روداد سنا دی، پھر گویا ہوئی۔ محترم وچ ڈاکٹر..... میں نے اپنی پوری روداد سنا ڈالی، مگر اب آئے دن جننے کی روح میرے خواب یا پھر جاگنے پر جب میں تنہا ہوتی ہوں تو میرے پاس آتی ہے اور مجھے طرح طرح کی باتوں سے پریشان کرتی ہے، آپ خود ہی اندازہ کریں کہ ایک روح جب آئے دن کسی زندہ آدمی کے پاس آ کر اپنی باتیں کرے تو وہ زندہ شخص کس اذیت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ پلیز! آپ جننے کی روح سے میرا پیچھا چھڑا دیں، میں تا حیات آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی، آپ کو خداوند کا واسطہ..... پلیز! میری مدد کریں تاکہ میں سکھ کا سانس لے سکوں۔“ اور پھر مسز نارمن خاموش ہو گئی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے ہی رولوکا نے جننے کی روح کو حاضر کیا اور اس سے دریافت کیا کہ تم نے مسز نارمن کو کیوں پریشان کر رکھا ہے تو جننے کی روح بولی۔ ”گریٹ وچ ڈاکٹر۔ دراصل مسز نارمن مجھے اچھی لگتی ہے اور میں مر کر بھی اسے چاہتی ہوں۔ خیر آپ کی مداخلت سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے بہت دور چلی جاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی اس کے قریب نہیں آؤں گی۔ خیر رولوکا نے جننے کی روح سے مسز نارمن کا پیچھا چھڑا دیا۔ رولوکا کی بات مان کر جننے کی روح نے آئندہ مسز نارمن کو تنگ کرنے یا اس کے خواب میں آنے سے بھی انکار کر دیا، مسز نارمن خوشی سے بھولے نہ سار ہی تھی۔ مسز نارمن نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور تا حیات دعائیں دینے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

(اب آگے پڑھیں)

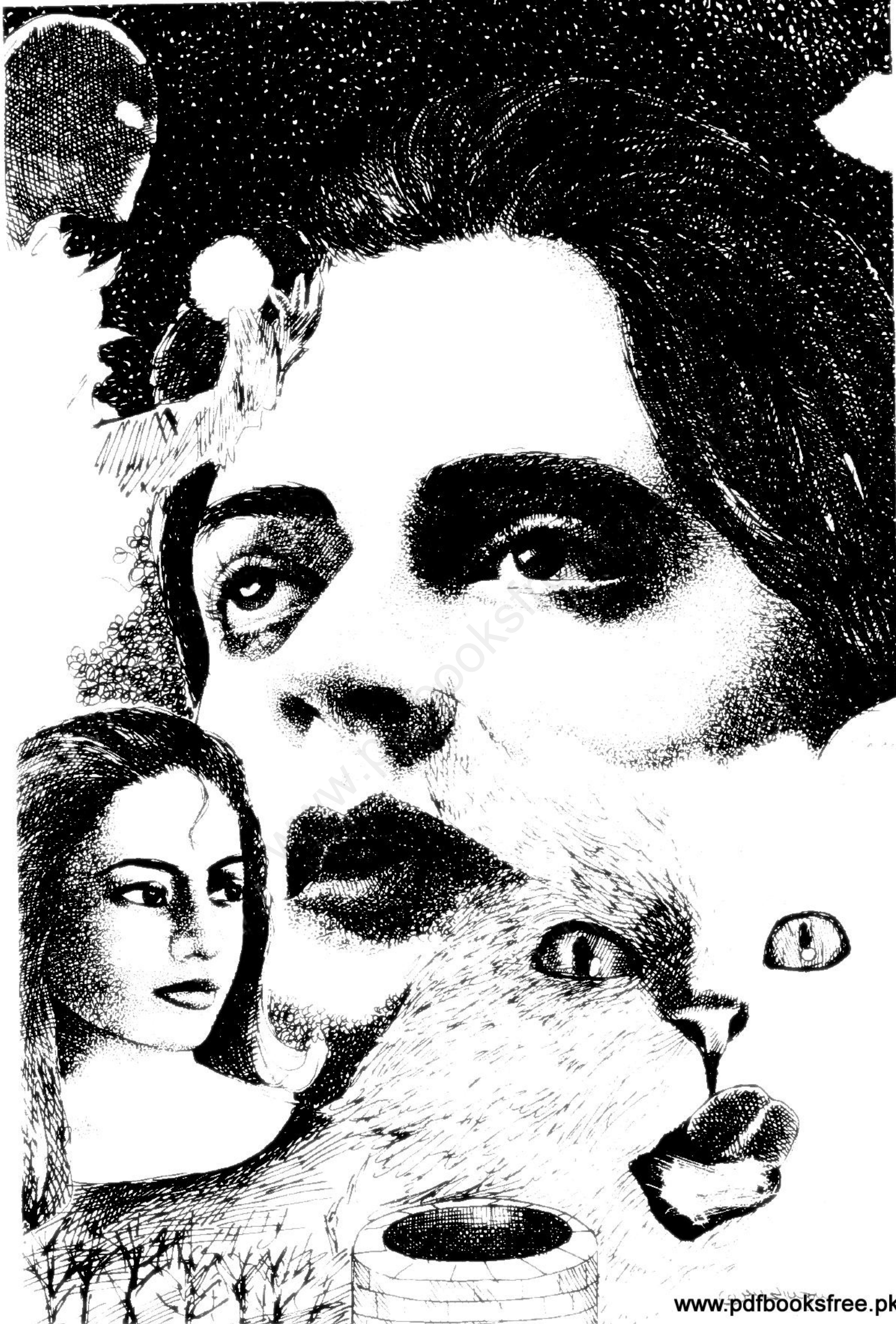
افریقہ میں ریت رواج صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ جو بھی روحانیت میں کمال حاصل کر لیتا ہے یا پھر تھوڑا بہت بھی روحانیت سے روشناس ہو جاتا ہے اسے ”وچ ڈاکٹر“ کہا جاتا ہے۔

استاد نے رولوکا کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا تمہارے قبضے میں بے شمار نادیدہ قوتیں آگئی ہیں اور اگر تم نے مزید محنت کی تو مزید طاقتیں تمہارے زیر اثر آ جائیں گی، کبھی اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کرنا، ہمیشہ اپنے آپ کو اعلیٰ کے بجائے ادنیٰ ہی سمجھنا، اپنی طاقت

**رولوکا** روحانیت میں کمال حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی قصبے میں آ کر ضرورت مندوں کے مسائل حل کرنے لگا، استاد نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ کسی بھی ضرورت مند سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا اور تمہاری ضرورتوں کے لئے اوپر والا تمہیں کہاں سے روزی دے گا یہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور پھر رولوکا نے استاد محترم کی بات گرہ میں باندھ لی۔

ایک روز استاد نے فرمایا۔ ”بیٹا اب تم میری نظر میں وچ ڈاکٹر بن چکے ہو۔“







سے بڑھ کر کبھی کسی طاقتور سے نہ ٹکرانا۔

اور اگر کبھی ایسا وقت آن پڑے، تمہارے مد مقابل کوئی تم سے طاقت میں زیادہ ہو، وہ تمہاری بات کسی صورت نہ مانے تو خفیہ طور پر اپنے بڑوں سے رابطہ کرنا، تمہارے بڑے تمہاری مدد کو فوراً حاضر ہوں گے یا پھر تمہیں اپنے مد مقابل سے مدد کے لئے کوئی خاص عمل یا طریقہ اخذ کر دیں گے اور ہاں ایک اور بات یاد رکھنا کبھی لالچ کو دل میں جگہ نہیں دینا۔

پھر ایک اور اہم بات جس کے لئے مرد اپنے آپ کو روک نہیں سکتا وہ ہے خوبصورت عورتوں کا دام فریب، عورتیں بڑے بڑے مفتی پرہیزگار لوگوں کو راہ سے بھٹکا دیتی ہیں اور جب کوئی مرد جو کہ مفتی ہی کیوں نہ ہو جب وہ عورت کے فریب میں آ جاتا ہے تو اپنی عاقبت تک خراب کر لیتا ہے عورت کو کبھی نہ کھلونا بنانا اور نہ ہی کبھی کسی عورت کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا، ان باتوں پر تم اگر قائم رہو گے تو کامیابی و شہرت تمہارے قدم چومے گی۔“

رولوکا نے استاد کی باتوں پر ہمیشہ قائم رہنے کے لئے وعدہ کیا، اور استاد کی اجازت سے اپنے قصبے میں آ کر پریشان حال لوگوں کے مسئلے حل کرنے لگا۔

صبح ایک مخصوص وقت پر رولوکا اپنے آستانے پر آ کر بیٹھ جاتا اور پھر ضرورت مندوں کی لائن لگ جاتی، اور پھر شام کا بھی ایک وقت مقرر تھا۔

مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد کوئی ضرورت مند نہیں آتا بلکہ قصبے کے چند دوست آ جاتے جو کہ روحانیت میں دلچسپی لیتے، وہ آستانے میں بیٹھ کر رولوکا سے روحانیت کے متعلق باتیں کرتے انہی دنوں رولوکا کے چند شاگرد بن گئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ رولوکا انہیں روحانیت سے روشناس کرائے۔

ایک دن ایک شاگرد نے پوچھا۔ ”استاد محترم روحانی علوم حاصل کرنے کے دوران کوئی ایسا بھی واقعہ آپ کے ساتھ رونما ہوا، جس کی وجہ سے آپ ناقابل بیان حالات سے دوچار ہوئے یعنی آپ نے بہت زیادہ ڈر محسوس کیا ہو؟“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”عزیز ساتھیو! عمل سیکھنا

حقیقت میں لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے میرے ساتھ بے شمار ڈراؤنے خوف ناک اور ناقابل بیان واقعات رونما ہوئے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں حصار قائم کر کے عمل میں مصروف تھا کہ مجھے لگا کہ میں جنگل میں بیٹھا ہوں اور جب میرے ہوش بحال ہوئے تو میں خوف زدہ ہو گیا کہ میں جنگل میں کیسے پہنچ گیا کہ اتنے میں ایک شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی تو میں دہل کر رہ گیا پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ شیر اپنی قہر برساتی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر غرائے لگا۔

پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک ساتھ کوئی درجن بھر شیر قریب آ گئے اور سب نے دھاڑنا شروع کر دیا ان شیروں کو دیکھ کر میری کھلھی بندھ گئی میرا گلہ خشک ہونے لگا میرے جسم میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔

اور پھر ایسا ہوا کہ تمام شیر یک بیک دھاڑتے ہوئے مجھے چیر پھاڑنے کے لئے مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اپنی جگہ اوندھے منہ پڑ گیا۔ مگر میں محفوظ تھا میرے جب حواس بحال ہوئے تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تمام شیر اپنی اپنی جگہ پڑے تھے اور وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔

میری چیخ اتنی بلند تھی کہ میں کیا بتاؤں پھر میں نے دیکھا کہ میرے استاد میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اور آواز سے بتایا کہ یہ سب نظروں کا دھوکہ تھا تم اپنا عمل جاری رکھو پھر میری جان میں جان آئی۔“

اتنے میں رولوکا کی نظر ایک شاگرد کے ہاتھ پر پڑی۔ شاگرد نے اپنے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر رولوکا بولا۔ ”بھئی یہ کون سی کتاب ہے؟“ شاگرد بولا۔ ”استاد یہ بہت اچھی کہانی کی کتاب ہے۔“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”چلو ذرا مجھے بھی سناؤ کہ کیسی



کہانی ہے۔“

رولو کا کی بات سن کر شاگرد نے کتاب کھولی اور گویا ہوا۔

رائٹر لکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میری اس بات سے اختلاف ہو کہ دنیا میں خونخوار بھیڑیوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ایسی ہے جو درندگی، وحشت اور بربریت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی لیکن اس معاملے میں آپ کو مجھ سے یقیناً اتفاق ہوگا کہ اس جاندار کا نام عورت ہے۔ عورت جو کبھی تو پھول کی پنکھڑی سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور کبھی کبھی چٹان سے زیادہ سخت ہو جاتی ہے کبھی شمع بن کر پروانوں کو جلا کر رکھ کر دیتی ہے تو کبھی آسمانوں پر کھڑکنے والی بجلی کی مانند جہاں گرتی ہے تو مرد کا نام و نشان تک مٹا دیتی ہے۔

اب میں آپ کی آتش شوق کو زیادہ ہوا نہیں دوں گا اور اصل داستان کی طرف آؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اور بہت سے دوسرے قارئین کی طرح آپ بھی یہ سب جاننے کے لئے بے قرار اور بے چین ہوں گے کہ آخر میں نے عورت کے متعلق ایسی رائے کیوں قائم کی تو میرا خیال ہے کہ پہلے وہ واقعہ میں آپ کو سنا چلوں جس کی وجہ سے میں آج تک قانون کی نظروں سے خود کو چھپائے پھرتا ہوں۔ قانون اور معاشرے کی نگاہوں میں میری حیثیت چاہے ایک مغرور قاتل کی ہی سہی لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور اگر کسی کو قتل بھی کیا ہے تو کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ کیونکہ میری نظر میں کسی درندے کو ہلاک کر دینے سے بہتوں کا بھلا تو ہو سکتا ہے ان کی اچھائی اور بہتری کا پہلو تو نکل سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ اسے قتل کا نام دے سکیں۔ ہو سکتا ہے یہ واقعہ جان کر بھی آپ مجھے ہی مورد الزام ٹھہرائیں اور ایک قاتل ہی سمجھیں لیکن میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہوں گا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس وقت قانون کو میری ضرورت ہے۔ مجھے قانون کی نہیں۔“

میری زندگی کی سب سے حسین رات وہ تھی جب میری ملاقات ایک کیفے ٹیریا میں انگریز سے ہوئی۔ انگریز ایک سویڈش لڑکی تھی۔ ارب پتی باپ کی اکلوتی لڑکی اور حسن و جمال میں یکتا ہونے کے علاوہ بلا کی ذہین اور پروقار بھی تھی میں ان دنوں ایک سروے کمپنی میں اچھی پوزیشن پر ملازم تھا اور کسی ضروری کام سے میڈرڈ (اسپین) گیا ہوا تھا۔ اسپین کی سرزمین مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا بے حد حسین اور خوبصورت سنگم ہے اور آپ میں سے جو لوگ اسپین گئے ہوں گے انہیں وہاں کی فراخ دل عورتیں اور خوب رو حسیناؤں کے جھرمٹ یقیناً پسند آئے ہوں گے۔ اسپین کی دوشیزائیں زندگی سے بھرپور آگ کی لہر کی طرح ہوتی ہیں۔ یہاں میری ملاقات از ایلا، جولیانہ اور کئی اور لڑکیوں سے ہوئی لیکن میں غیر معمولی حسن سے ہی متاثر ہوا کرتا ہوں۔ میڈرڈ کے ایک کیفے ٹیریا میں جہاں میں ایک کروڑ پتی ہسپانوی تاجر کا مہمان تھا اور اس کی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ میں نے پہلی بار انگریز کو دیکھا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے وہ اگر مجھے نہ مل سکی تو میں اسپین سے زندہ کبھی واپس امریکہ نہیں جاسکوں گا۔

میرے میزبان نے میری توجہ کھانے کی لمبی چوڑی میز پر سجے ہوئے سات قسم کے خوش ذائقہ بھنے ہوئے روایتی گوشت کی طرف کرائی۔ میں نے دیکھا کہ تلی ہوئی مچھلی کے خوشبودار مصالحے میں رچی ہوئی پارچوں کے علاوہ میز پر بھنے ہوئے مرغ، تیتھر، مرغابی، ہرن، گائے، بکری اور بھیڑ کا گوشت بھی موجود تھا۔ اسی طرح سات قسم کے مختلف ذائقوں والے پھل اور پھر سات ملکوں سے منگوائی ہوئی بیش قیمت شراہیں جن کو کیفے ٹیریا کی حسین گلبدن دوشیزائیں میرے سامنے پیش کرنے آئیں بھی جو اس مرغن اور لذیذ کھانے کا ایک حصہ تھیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک میں نے اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے ذرائع آمدنی اگر لامحدود نہیں تو اتنے بھی محدود نہیں تھے اور میرے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ میں زمین کے کسی بھی خطے کو محض سوئگھ



کرتیل کی موجودگی کا پتہ چلا لیا کرتا ہوں اور یہ کوئی معمولی صلاحیت نہیں ہوتی۔

سروے کے ضمن میں اس اضافی خوبی اور خداداد قابلیت نے مجھے ایک مختصر سے عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں ایک بہت بڑی امریکی تیل کمپنی میں چیف سروے آفیسر تھا اور میری تنخواہ کا یہ حال تھا کہ اس وقت میں میڈرڈ کے سب سے مہنگے ہوٹل یعنی میڈرڈ ٹرٹن میں مقیم تھا اور مجھے پانچ سو ڈالر روزانہ محض تفریحی الاؤنس مل رہا تھا جبکہ مجھے میڈرڈ میں ابھی کم از کم دو ہفتے قیام کرنا تھا اور ٹھیک دو روز بعد میری سیٹ پان امریکن کی جینو افلائٹ کے لئے بک کرادی گئی تھی۔

نیویارک سے مجھے براہ راست میڈرڈ بھجوا دیا گیا تھا اور یورپ کے اس دورے کے لئے میرے لئے ایک لاکھ ڈالر کی رقم مخصوص کر دی گئی تھی جبکہ یہ دورہ صرف دو ماہ کے عرصے میں مکمل ہونا تھا۔ اور یہ رقم محض مجھے تفریحی الاؤنس کے بونس کے طور پر اس لئے دی گئی تھی کیونکہ گزشتہ دو برسوں سے میں نے کوئی چھٹی نہیں لی تھی اور اب یہ دورہ تفریحی سے زیادہ تجارتی رنگ اختیار کر گیا تھا۔

مجھے میڈرڈ آئے ابھی مشکل تمام 36 گھنٹے گزرے تھے۔ گزشتہ شب میں سے از ایلا کے فلیٹ پر گزاری تھی لیکن وہ اپنی والدہ کی بیماری کے باعث کچھ بجھی بجھی سی رہی تھی اور مجھے اس کی رفاقت میں اس کے قرب میں بھی ایک دوری اور فاصلے کا احساس باقی رہا۔ میں سمندر میں جا کر بھی تشنگی سے نجات نہیں پاسکا تھا، اور نصف شب تک کسی جانور کی طرح از ایلا کو بھنبھونے کے بعد میں نے رات کے پچھلے پہر جولیا نا کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ہسپانوی زبان میں اول فول بکتی ہوئی دروازے تک آئی۔

مجھے گھر کے دروازے پر دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے نیند اڑن چھو ہو گئی اور حیرت و تجسس کی تصویر بن کر دروازے کے فریم میں کھڑی کی کھڑی رہ

گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے اس کے شانے تھپتھپائے اور اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ وہ اس غیر متوقع اقدام کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں تھی اس نے کسماتے ہوئے خود کو میری گرفت سے آزاد کر لیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر کا ریڈر کی طرف جانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے فرہ اور دلفریب کو لبے بے حد ہیجان انگیز اور جنون خیز انداز میں دائیں بائیں بل رہے تھے اور ان کے تھرکنے کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

میں نے برق رفتاری سے دروازے کی چٹنی لگائی اور کسی چپتے کی مانند اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ ایک ٹھوس اور بے حد صحت مند لڑکی تھی لیکن اس وقت مجھ میں کوئی ایسی طاقت سمائی ہوئی تھی کہ میں خود بھی اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا میں اسے لئے ہوئے کاریڈور کے پختہ فرش پر گر پڑا اور ہم دونوں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے شفاف اور چکنے فرش پر دوڑتے پھسلتے چلے گئے ملاقات کا یہ انداز بڑا عجیب و غریب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی یا اٹھ سکتی میں نے بڑی برق رفتاری سے اسے زیر کر لیا تھا۔ اور وہ پوری طرح صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں بری طرح بوکھلا گئی تھی میں نے اسے بے بس کر دیا تھا اور جب اس نے مجھے بعد میں پوچھا کہ آخر یہ کیا حرکت تھی تو میں نے اسے بتایا کہ دراصل میں جذبات کی یلغار کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا اور اسی وجہ سے میں نے ایسی حرکت کی تھی! وہ مسکرائی شاید اتنی دلفریب رات میں نے پہلے کبھی نہیں گزاری تھی۔ صبح میں بہت دیر سے اٹھا لیکن میں تازہ دم تھا۔

اگلے دن بلکہ اگلی رات میں پھر از ایلا کے فلیٹ پر جا پہنچا اس وقت وہ اپنے فلیٹ میں موجود نہیں تھی۔ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کے بیڈروم میں بیٹھا اس کی البم کی ورق گرانی کرتا رہا۔ شاید از ایلا اپنے کسی دوست کے ہمراہ کہیں رات گزارنے چلی گئی تھی۔ اس



کی غیر موجودگی میں اس کی ذاتی ملازمہ اولیویا میرے لئے سیاہ کافی بنا کر لائی اور مجھے آرام کرنے کی تلقین کرتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ میں نے بھرپور نظروں سے اولیویا کے بدن کا جائزہ لیا وہ گدرائے ہوئے بدن کی ایک سانولی سی دو شیرہ تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے سانولے رنگ میں بے پناہ کشش تھی اور اس کا بھرا بھرا بدن بے پناہ جنسی کشش رکھتا تھا اور اس کے بالائی ہونٹ کے قریب ایک ننھا سا اور بے حد خوبصورت تل تھا جو اس قدر ہیجان خیز تھا کہ میں نے خود کو بڑی مشکلوں سے قابو میں رکھا۔ اولیویا اس وقت کچن میں تھی اور میرے لئے گوشت کے پارچے تل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک ٹرے میں گوشت کے پارچے لئے نمودار ہوئی اور اس نے پلیٹ میں چند ٹکڑے ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ وہ کسی کام سے میری میز کے قریب آئی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کھینچا لیکن وہ کسمسا کر علیحدہ ہو گئی۔

وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ اگر اس کی مالکہ یعنی از ایلا آگئی تو کیا ہوگا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ساری صورت حال کو سنبھال لوں گا لیکن وہ بہت ہراساں تھی اس نے کہا۔ ”آپ نے ابھی تک از ایلا کا ایک ہی روپ دیکھا ہے غصے میں وہ کسی بھری ہوئی شیرنی یا پھنکارتی تاگن سے کم نہیں ہوتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا لباس درست کر رہی تھی کہ باہر آہٹ ہوئی اور اچانک صدر دروازے میں تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ہی از ایلا دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی اور اب اپنے بیڈروم کی طرف آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے اولیویا کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور خود بیڈ پر لیٹ گیا۔

از ایلا نے آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ میری آنکھوں پر رکھ دیئے اور آہستہ سے بولی۔ ”تم کب آئے اور ہاں وہ الیویا کہاں ہے؟ کیا تم نے کسی کام سے کہیں بھیجا ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ”اوہ۔ اولیویا۔ دراصل وہ

پڑوس میں گئی ہے۔ خیر چھوڑو اسے۔ تم ایسا کرو کہ نہا کر تازہ دم ہو جاؤ پھر ہم دونوں آج رات شیرٹن میں کھانا کھائیں گے اور اوپیراد کھنے چلیں گے۔“

از ایلا خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ یوں بھی اچھے ہوٹلوں میں جانے کی شدت سے آرزو مند معلوم ہوتی تھی سیدھی غسل خانے میں جا گھسی۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی اولیویا برق رفتاری سے بیڈ کے نیچے سے نکلی اور باہر چلی گئی۔

”اولیویا۔ اولیویا۔ تم کہاں ہو؟“ از ایلا کی آواز بیڈروم میں گونجی، شاید وہ کسی چیز کی تلاش میں پھر رہی تھی۔ ”کرمس ڈارلنگ تم کہاں چلے گئے، کہاں ہو تم؟“ پھر اس نے مجھے پکارا۔ میں نے جلدی سے چٹخنی کھولی اور تقریباً بھاگتا ہوا بیڈروم میں آیا۔ ”اوہ کچھ نہیں۔ میں ذرا کچن تک گیا تھا۔ اولیویا واپس آگئی ہے اور کچن میں ہے۔“ میں نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ از ایلا اپنے حسین بدن کے ارد گرد ایک بڑا سا گلابی تولیہ لپیٹے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اولیویا کے چہرے پر جس قسم کے جذبات اور تاثرات ابھرے تھے بالکل اسی قسم کے حجاب آلود جذبات اس وقت از ایلا کے چہرے سے بھی عیاں تھے۔ پھر وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو چکی تھی۔ میں نے حسرت سے اولیویا کی طرف دیکھا۔ اولیویا نے ایک ہوائی بوسہ میری طرف اچھالا اور میں اور از ایلا کار کی طرف بڑھے۔

میں اور از ایلا شیرٹن کی حسین شام گزارنے جب ہوٹل کی لابی میں گئے تو میری نظر انگریز کی ہم شکل ایک لڑکی پر پڑی اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے جلد از جلد انگریز کو تلاش کرنا ہوگا اس سے ملنا ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر میں جی نہیں سکوں گا! جانے وہ مجھے کیوں اس قدر یاد آرہی تھی اور میں اس کی یاد اور فرقت سے بے چین ہونے لگا۔ میں نے اپنے بازو کی گرفت از ایلا کی کلائی پر سخت کر دی۔ میری انگلیاں اس کے نرم



و نازک ہاتھ میں گڑی جارہی تھیں۔ وہ آہستہ سے چیخی۔ ”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کیرس؟“ اس نے محبت سے میرے نام کی تحفیف کرتے ہوئے کہا۔

کھانے کے دوران وہ اپنے ملائم اور ریشمی پاؤں سے میز کے نیچے سے میری پنڈلی پر طلسمی انداز سے گدگدی کرتی رہی میرے اعصاب کو خاصا سکون مل رہا تھا اور میں خوش ذائقہ کھانوں کی لذت سے زیادہ اس کے لمس میں لطف محسوس کر رہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہم دونوں ایک شاندار اوپیرا دیکھنے چلے گئے۔ ہسپانوی نوجوان دوشیزائیں بڑی بیجانی انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ دف اور آرکسٹرا کی ملی جلی آوازیں نیم تاریک ماحول کو اور زیادہ رومان پرور اور جذبات انگیز بنا رہی تھیں اور ازابیلا میرے سینے پر سر رکھے مجھ سے بالکل لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ برائن کی زبردست مہک اس کے خوبصورت بالوں سے آرہی تھی جو اس کے دلکش شانوں پر بکھرے ہوئے تھے پھر اس نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی مخروطی صراحی دار گردن کی تل کوئیں نے چوم لیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اوپیرا سے واپس سٹریٹ میں لوٹ آئے۔

جانے کیا بات تھی ازابیلا سے دو ملاقاتوں کے بعد اور ایلویا سے نیم ملاقات کے بعد میری طبیعت میں ایک عجیب و غریب قسم کی تشنگی پیدا ہو گئی تھی اور میرا جی بار بار انگریز کو ملنے کو ترس رہا تھا۔ آخر میرے دل کی تڑپ رنگ لا کر رہی اس روز سہ پہر کے وقت میں نے انگریز کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک ڈائریکٹری سے تلاش کیا۔ اس ڈائریکٹری میں اسپین کے سرکردہ افراد کے نمبر درج تھے لیکن جب میں نے ہوٹل سے انگریز کو فون کیا تو اس کی ذاتی ملازمہ ایمرلڈ نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی سو رہی تھی اور شام 5 بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوگی اس نے میرا نمبر لکھ لیا تھا۔ اب مجھے دو گھنٹے گزارنے دو بھر ہو گئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وقت پر لگا کر اڑ

جائے اور میں اسے دوبارہ فون کر سکوں۔ دراصل اس دن یعنی پہلے دن کیفے ٹیریا میں اس کے ملکوتی حسن سے اس قدر مرعوب ہوا کہ کوئی بات ہی نہیں کر سکا تھا اور جب وہ چلی گئی تو میں اپنے اوسان بھی کھو بیٹھا اور یہ احساس مجھے اور بھی زیادہ اذیت میں مبتلا کر گیا تھا کہ میں کھل کر اس سے اپنے دل کی بات ہی نہیں کر سکا تھا۔ ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر جب میں واش بیسن کے پاس کھڑا برش کر رہا تھا میرے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے مدہم ہو کر ڈونے لگی تھی اور میری نبضیں بھی آہستہ آہستہ جیسے رک سی گئی تھیں۔

”ہیلو۔۔۔!“ دوسری جانب ایک بے حد دلکش اور حسین آواز نے میرے کانوں میں شہد چٹکایا۔

”ہیلو۔ کون ہے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”میں انگریز ہوں کیا یہ تم ہو کر کس؟“

میں نے خوشی سے ریسور کو چوم لیا اور بولا۔ ”آہ میری زندگی، کیا یہ تم ہی ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم ہو! میں تمہاری حالت کو سمجھتا ہوں۔“ اس کی دلکش آواز مجھے بے خود کرنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم تیار رہنا میں خود تمہیں لینے آؤں گی، وقت یاد رکھنا ٹھیک آٹھ بجے شب لیکن کیا تم واقعی مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہو؟“

میں نے فوراً کہا۔ ”میرے صبر کو اور نہ آزماد۔“

کارایک عالی شان محل نما عمارت کے پورچ میں جا کر رک گئی اور انگریز مجھے ہمراہ لئے ہوئے جیسے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک بڑے سے ہال سے گزر کر ساگوانی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالائی منزل کی طرف چل دی راہداری کے آخری سرے پر جا کر وہ رک گئی اور مجھے ایک کمرے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میرے کانوں میں جیسے شائیں شائیں ہونے لگا۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ میرے لئے قہر آلود قیامت اور صدیاں بن کر گزر رہا تھا! میں کمرے کی دیواروں پر



آویزاں بے حد عریاں تصاویر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ قد آدم تصویریں اس قدر ہیجان انگیز اور اشتعال انگیز تھیں کہ میرے بدن کے رونگٹے فرط جذبات سے گنگنا نے لگے چند لمحوں بعد اس کمرے کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ شاید یہ دروازہ انگرڈ کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ پھر انگرڈ کی آواز نے میرے کانوں میں شیرینی پکائی۔ ”اب تم اندر آ سکتے ہو۔“ یہ سن کر میں کمرے میں داخل ہوا اور ٹوٹل کر دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کر دیا۔ پورا کمرہ ہلکی سبز روشنی میں نہا گیا۔ وہ میرے سامنے تھی۔

میں نے نظریں اٹھائیں سبز روشنی میں نہائی ہوئی انگرڈ کا عریاں بدن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی سرقد مجسمہ تھی جسے اکائی سے تراشا گیا تھا اس کا بدن اس قدر متناسب اور گداز تھا کہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اگر زیادہ دیر تک اسے دیکھا تو میں خود اپنے جذبات کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤں گا اس کا بدن کسی ستار کی مانند تھاتا ہوا جو مضراب کے لئے بے قرار ہو۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر سحر انگیز بدن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بدن میں ایک سینٹی میٹر بھی فالتو گوشت کی تہہ نہیں تھی۔ وہ مائیکل ۶ نجلو کے کسی خوبصورت تراشے ہوئے مجسمے کی مانند حسین تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں وینس کے زندہ مجسمے کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اس کے لبوں پر ایک طلسمی مسکراہٹ رقصاں تھیں۔

اس نے اپنے دونوں بازو دوائے اور میں اس کے حسن کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ وہ کسی بھوکے شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی اور اس سے پہلے کہ اس کی اس حرکت یا ادا کو سمجھنے کی کوشش کرتا وہ مجھے اپنے وزن تلے دبائے قالین پر لوٹ رہی تھی اس نے اپنے تیز اور لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ لہو لہان کر دیا۔ میرا لباس تار تار کر دیا میں حیران تھا کہ آخر کیا ہو گیا تھا۔ اس کو وہ کسی جنگلی اور وحشی مادہ چیتے کی

طرح بار بار مجھے زمین پر گرا کر مجھ پر حملے کر رہی تھی اور ہر بار میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے حملوں میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے کسی بھری ہوئی شیرنی کی مانند بھنبھوڑنا شروع کر دیا میرے شانوں، رانوں ہاتھوں اور سینے کے علاوہ اس نے میری گردن پر جگہ جگہ کاٹ لیا۔ پھر اس نے میرے ہونٹ اپنے دانتوں میں دبائے اور انہیں کاٹ ڈالا۔ درد اور تکلیف کی شدت سے میرا برا حال ہو گیا تھا خون کا تلخ اور نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہو رہا تھا۔

وہ کسی درندے کی مانند مجھ سے کھیل رہی تھی۔ لذت وصال کا ہر تصور یہاں بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ میرے بدن سے نکل کر بہنے والے خون کو بڑی رغبت سے کسی خون آشام جڑیل یا ڈائن کی طرح چاٹ رہی تھی۔

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں اب زندہ یہاں سے نہیں نکل سکوں گا۔ میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا، اب میز کی دراز سے ایک بڑا سا پھل دار چاقو لے کر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ہولناک شیطانی مسکراہٹ چل رہی تھی۔

میں نے تیزی سے کروٹ لی اور اچھل کر ایک فلائنگ کلک اس کے سینے پر ماری تو وہ تیورا کر دور جا گری۔ میں نے چاقو اٹھایا اور دستے تک اس کے دل کے مقام پر پیوست کر دیا۔ پھر میں پھرتی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کرتا ہوا تیزی سے راہداری سے بھاگتا ہوا اس محل نما عمارت سے باہر آ گیا۔

اب میں ایک قاتل تھا۔ ایک خونی درندہ جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی اور جو ہمہ وقت اپنی جان بچانے کے لئے ادھر سے ادھر پناہ کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے وہاں سے آتے ہی انگرڈ کی لاش دستیاب ہو چکی ہوگی اور اب پورے میڈرڈ کی پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہوگی۔ میں لوہے کے پائپ کے ذریعے کسی ملی کی مانند اپنے ہوٹل کے سویٹ میں داخل ہوا اور اپنے سامان کا بیگ کمرے سے باندھ کر پھر اسی راستے سے نیچے اتر کر میڈرڈ کے ایک قبوہ خانے میں پناہ لی۔



اب مجھے میڈرڈ سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کرنا تھی اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے اپنی گھنی اور خوبصورت داڑھی منڈوا دی۔ اپنا امریکن پاسپورٹ پھاڑ کر ایک گٹر میں پھینک دیا اور اب میں ایک ہسپانوی گڈریئے کا روپ اختیار کر چکا تھا، اگلی صبح میں نے ایک قریبی قصبے میں ایک اسٹال پر میڈرڈ ٹائمز میں پہلے صفحے پر انگریز کی تصویر دیکھی۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی اور میں اسے دیکھے بغیر ہی اس کے پاس سے فرار ہو گیا تھا۔

وہ قیمتی قالین پر بالکل چاروں شانے چت گری ہوئی تھی اس کی آنکھیں ہولناک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ پھل دار چاقو دستے تک اس کے سینے کے ابھاروں کے عین درمیان دل کے مقام پر ڈھنسن گیا تھا اور اس کے قریب قالین پر خون کا ایک بڑا سادھبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری تصویر میں اس کی لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور پورٹ میں درج تھا کہ ہسپانوی پولیس ایک امریکی باشندے کی تلاش میں ہے جو ایلن میکائے کے نام سے میڈرڈ کے شرٹن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور حادثے یعنی اس قتل کی واردات کے بعد سے مفروضہ ہے۔

خبر میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ آخری بار انگریز کو کچھ لوگوں نے اسی امریکی باشندے کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ دونوں قتل کی رات کو بھی اکٹھے دیکھے گئے تھے۔

خیر میں اس جردا ہے کی مدد سے میڈرڈ سے فرار ہوا اور پیرس چلا آیا۔ پیرس میں میں خود کو میڈرڈ کے مقابلے میں بہت زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔

پیرس میں میری ملاقات مائیکل سے ہوئی۔ مائیکل ایک بہترین آرٹسٹ تھا اور وہ میرا ایک بہت اچھا دوست ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے مل کر میرا جعلی پاسپورٹ بنوا دیا اور میں راتوں رات فرانس کی سرحدوں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرانس کی سرحدوں کے قریب ایک ہیلی کاپٹر سردس سے میں

نے اٹلی کا رخ کیا اور پھر روم میں اپنے دوست انطونی سے کچھ رقم حاصل کی اور واپس نیویارک جانے کی بجائے الاسکا کا فضائی سفر اختیار کیا۔ اب میں ایک فرانسیسی پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا۔ میری امریکی شہریت ختم ہو چکی تھی اور میں یہ بھول جانے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کبھی میں بھی نیویارک کا ایک مہذب باشندہ تھا۔

اور اس طرح میں فرانس سے فرار ہو کر الاسکا چلا آیا۔ قیمتی اور پرانی شراہیں، خوبصورت اور نوجوان عورتیں یعنی شراب اور شباب ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہیں، الاسکا میں مجھے یہ دونوں چیزیں میری مرضی کے عین مطابق دستیاب ہو رہی تھیں اور میں بڑے سکون سے اپنا وقت گزار رہا تھا یہاں میں کینیڈا اور امریکہ کی حکومتوں کی سیاسی پناہ میں تھا اور مجھے کسی قسم کا خوف دامن گیر نہیں تھا۔ ہاں اب بھی یہ ضرور تھا کہ انگریز پول (بین الاقوامی پولیس) اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس شکاری کتوں کی طرح دنیا بھر کے ملکوں میں میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور ابھی تک اس بات کا یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ مجھے تلاش کر رہی لیں گے۔ میں نے اپنا حلیہ اب مکمل طور پر تبدیل کر لیا تھا اور اب میں ایک فرانسیسی باشندے کے روپ میں تھا جو اپنی گھنی داڑھی اور شکار کھیلنے کی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اس علاقے میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔

الاسکا میں، میں نے ایک بہت بڑی کمپنی میں جو برف صاف کرنے کا کام کرتی تھی بلڈوزر اور ہیوی مشینری چلانے کے لئے ملازمت کر لی اور اس جگہ مجھے ایک ہزار ڈالر ہفتے کی آمدنی ہونے لگی۔ میں نے یہاں ایک چھوٹا سا کینچ خرید لیا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے لوگوں میں اپنے بہترین نشانے اور زبردست طاقت کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ میں شکار کا بے حد شوقین ہو گیا تھا اور جب بھی مجھے موقع ملتا تھا میں اپنے شوق کی تکمیل کے لئے شکار کھیلنے نکل کھڑا ہوتا۔

مجھے الاسکا کے موٹے اور تندرست بھیڑیوں کو ہلاک کر کے بے حد خوشی حاصل ہوتی تھی۔ انہیں



دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ انگریز کی یاد بری طرح ستانے لگی تھی۔ آہ وہ بھی کیا رات تھی جب اس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا اور اس قدر تھکا دیا تھا کہ آخر میں اسے ہلاک کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بظاہر تو میں اس کے جذبات کے آتش فشاں کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اگر میں اسے اپنی مدافعت میں ہلاک نہ کرتا تو شاید میں زندہ نہ رہتا۔

خیر جو ہوا سو ہوا اب اس کا تذکرہ بے مقصد ہے، اب میں نوم کے علاقے میں اپنے چھوٹے سے کانچ میں رہتا تھا اور کچھ عرصہ ہماری مشینوں والی کمپنی میں کام کرنے کے بعد میں نے بہت سے شکاری کتوں اور برفانی گاڑیوں کو کھینچنے والے کتوں کا ایک فارم کھول لیا تھا۔ اب میں زیادہ وقت شکار کھیلنے اور ٹین کے ذخائر تلاش کرنے میں صرف کرتا تھا اور الاسکا میں مجھے اپنی برق رفتاری اور زبردست ذہانت کی وجہ سے کرسمس کی بجائے اب وہاں کے لوگ مجھے ”ٹائیگر“ کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

میں اب جیسے خطروں سے کھیلنے کا عادی ہو گیا تھا اور ہر مشکل کام کرنے میں مجھے بے حد لطف آتا تھا۔ واقعی زندگی رسک کے بغیر کس قدر بے رس اور بے کیف ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک شام میں اپنے فارم کے پاس کانچ کے برآمدے میں بیٹھا تازہ امپورٹ کی گئی وسکی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے روسی نسل کے ایشین ٹوئی نے آہستہ سے غرا کر مجھے فارم کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس دلایا۔

میں نے آہستہ سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور فارم کے صدر دروازے تک گیا۔ میں نے دیکھا دروازے کے قریب ایک بے حد خوبصورت اور صحت مند عورت کھڑی تھی اس کی عمر تقریباً بائیس سال تھی اور وہ شکل و صورت سے کسی بہت کھاتے پیتے گھرانے کی فرد معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ہیروں کے قیمتی آویزے تھے اور اس کی کلائی پر ایک بیش قیمت گھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا لباس گہرا نیلا، نفاست سے سلا ہوا اور بے داغ تھا اس کی جلد ریشم کی

طرح ملائم اور گلاب کے گہرے سرخ خون کے رنگ کی طرح لال تھی اور اس کے گلے میں ایک بے حد بیش قیمت ہیروں کا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ شام کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ کسی آگ کی طرح روشن تھا۔

یہ عورت واقعی شاداب اور سیلے بدن کی مالک تھی اور ایک ہی نظر میں، میں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ بڑی مرد مار اور دھڑلے دار عورت تھی اس کا نام جین تھا۔

جین کمنگز۔ کمنگز اس کے شوہر کا نام تھا جو گزشتہ ایک ہفتے سے لاپتہ تھا اس کے بال گہرے سیاہ تھے اور اس کی نیلی آنکھیں مجھے۔ جی ہاں انگریز کی یاد دل رہی تھیں میں نے اس کے دلکش اور حسین خدوخال کو اور اس کے پرکشش بدن کے جنون خیز نشیب و فراز کو ٹکلی باندھ کر دیکھنا شروع کیا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی اور اپنے گاون کے اوپری حصے کا بٹن بند کر کے کوٹ کے کالر رخساروں تک اوپر کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم ٹائیگر ہو؟“

میں نے ایک قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔ ”مجھے کرسمس بھی کہتے ہیں لیکن تمہاری زبان سے بھی ٹائیگر کا لفظ سن کر مجھے بہت اچھا لگا ہے کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ جانے کیوں نو جوان اور نوخیز دوشیزاؤں کو دیکھتے ہی میرے دل میں محبت کے جذبات اور ہمدردی ابھر آتی ہے۔ شاید میں بہت نرم یا کمزور دل واقع ہوا ہوں، وہ کسی گڑیا کی طرح حسین اور طر حدار تھی۔

اس کے بدن سے پھونتی ہوئی مشک نافذ کی خوشبو مجھے بے قرار کئے دے رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس کے دونوں رخساروں میں گڑھے سے پڑ گئے۔ وہ ایک خوبصورت ڈمپل گرل تھی۔ میں نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے خیال سے وسکی کا جام اٹھا کر غٹا غٹ چڑھ لیا۔ اس کی خوبصورت آواز جیسے مجھے دور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ”مسٹر ٹائیگر۔ اور مسٹر کرسمس یہاں کے لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھے اوپر، ان پہاڑوں کے پیچھے کلیشروں کی وادی میں لے جاسکتے ہیں۔“ وہ تم سے آپ پر آگئی تھی اب اس کے لہجے میں روانی یا بے تکلفی



نہیں تھی بلکہ خالص کاروباری پن جھلک رہا تھا۔

میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو بھی کہتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ اچھی طرح دیکھ رہی ہیں کہ درجہ حرارت رات ہونے سے پہلے ہی نقطہ انجماد سے کئی درجے نیچے گر جاتا ہے۔ ابھی آپ نے برف کے وہ ہولناک طوفان دیکھے ہی نہیں ہوں گے جب انسانی خون رگوں میں منجمد ہو جایا کرتا ہے اور ہونٹ، ہاتھ پاؤں سردی کی تیغ بستہ شدت سے کٹنے لگتے ہیں اور چہرے پر آنکھوں کے سوا کسی اور شے کے وجود کا احساس تک کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ نے غلط دروازے پر دستک دی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

میں نے یہ بات بہت جرات پیدا کر کے کہی تھی اور اس دوران میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا تھا۔ اس نے میری بات کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا اور سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ”میری طرف دیکھو۔ ذرا خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔ میں اپنے شوہر کو ہر قیمت پر تلاش کرنے کی خواہش مند ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم یقیناً میری مدد کر سکتے ہو اور میرا دل کہتا ہے کہ تم انکار کر ہی نہیں سکتے۔ میں جانتی ہوں تمہیں اس مہم میں بہت سے خطرات پیش آ سکتے ہیں لیکن میں خود تمہارے ساتھ چلوں گی اور تمہیں اس کا باقاعدہ طور پر معاوضہ بھی ادا کروں گی۔“ اس نے کڑکڑاتے ہوئے بالکل نئے ڈالروں کے دس پیکٹ اپنے بیگ سے نکال کر میرے سامنے رکھی ہوئی پتائی پر ڈال دیئے۔ ”ایک لاکھ ڈالر۔“ میرا خیال ہے یہ بہت کافی ہیں لیکن اگر تم اس مہم میں کامیاب رہے تو میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر مزید دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“ اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور وعدہ کی پختگی کے اظہار کے لئے اپنا نرم و ملائم ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس وقت تک اس کی ریشمی رانوں اور گوشت سے بھرپور کولہوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو بے حد جان انگیز اور پرکشش تھے۔

میں نے ہڑبڑا کر اس کا ہاتھ اپنے کھر درے

اور مضبوط ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میرے بدن کی رگوں میں خون گردش کرنے لگا اور میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ جس کام یا جس مہم کے لئے وہ ذہنی طور پر مجھے آمادہ کر رہی تھی اس کے مقابلے میں یہ رقم بہت زیادہ بلکہ کہیں زیادہ تھی لیکن میرے دل میں سوئے ہوئے لالچی اور ہوس کے غلام ”ٹائیگر“ نے پھر انگڑائی لی اور مجھے اس مہم کے لئے تیار کر لیا۔ میں نے حامی بھر لی اور اس سے کہا کہ ”کل صبح وہ میرے پاس آ جائے۔“

میں نے اس شام علاقے کے بہت سے مضبوط اور فولادی بدن والے مزدوروں سے اس مہم پر جانے کے لئے پوچھ گچھ کی۔ لیکن سوائے کلائین کے کوئی شخص بھی کسی طرح میرے ہمراہ جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے خراب موسم میں اس مہم پر جانا گویا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور وہ کسی قیمت پر کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے انہیں بزدل، ڈرپوک، چوہا اور نجبانے کیا کیا کہا لیکن وہ تھے کہ اس سفر کے متعلق سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگے لیکن کلائین جو اس علاقے کا بہت چھٹا ہوا بدمعاش تھا محض پندرہ ہزار ڈالر کے عوض اس مہم پر ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ میں نہیں خوب رو اور خوش بدن جین تھی۔

اب میں نے جلدی جلدی تین بڑی برف گاڑیوں کا انتظام کیا اور دو کتے فالتو بھی ہمراہ لے لئے۔ ان تین گاڑیوں کو کھینچنے کے لئے میں نے چھ بے حد طاقتور اور مضبوط کتوں کا انتخاب کیا۔ الاسکا کے اس علاقے میں ان کتوں سے زیادہ توانا جانور اور کسی کے پاس نہیں تھے۔ ایک برف گاڑی (سلیج) میں، میں نے چھ ہفتوں کے لئے کھانے پینے کا سامان رکھ لیا اور یہ انتظام اس لئے کیا تھا کیونکہ جس جگہ سے ہم نے سفر شروع کرنا تھا وہاں سے شیلٹن تقریباً چھ سو میل دور تھا اور اس جگہ تک جانے کے لئے چھ ہفتوں سے کم وقت کا درکار نہیں تھا پھر راستے میں جگہ جگہ رک کر جین کے شوہر کی تلاش لازمی تھی جو اس مہم کی بنیادی شرط اور وجہ تھی۔



اگلی صبح ہماری تینوں برف گاڑیاں بالکل تیار تھیں۔ ایک گاڑی میں، میں خود سوار ہوا دوسری میں کلائین موجود تھا اور کھانے پینے کا سامان بھی تھا جبکہ تیسری گاڑی میں جین کے لئے مخصوص کردی تھی۔ برفانی طوفان سے مقابلہ کرنا کوئی آسام کام نہیں ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ جین کے لئے یہ سفر جان جو کھم ہوگا۔ اس لئے اس کو بتائے بغیر میں نے اپنی برف گاڑی میں ایک زبردست قسم کا گرم کمر بھی رکھ لیا تھا۔

جین کی آنکھوں میں میرے لئے جو پیغام تھا وہ کلائین نہیں پڑھ سکا تھا ویسے بھی اس مہم میں، میں نے اس بات کا پہلے سے ہی انتظام کر رکھا تھا کہ اس قافلے کی پہلی برف گاڑی جو سب سے آگے تھی وہ کلائین کی تھی۔ میں نے اس شام یعنی سفر شروع کرنے سے ایک دن پہلے رقم اپنے ایک بے حد قریبی دوست میگوائر کے یہاں رکھوا دی تھی اور چونکہ برف گاڑیوں کا انتظام میگوائر نے ہی کیا تھا اس لئے میں نے جین سے کہہ کر اسے تیس ہزار ڈالر علیحدہ دلوادے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ کلائین اس قسم کی مہمات کے سلسلے میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک تجربہ کار مہم جو تھا اور اس سے پہلے بھی اس قسم کے کاموں میں بڑی مہارت اور کامیابی سے اپنا کردار ادا کر چکا تھا۔ میں نے اپنے کتوں کو کبھی نہیں مارا تھا لیکن اس برفانی موسم میں مجھے یہ احساس بڑا اذیت ناک لگا کہ سفر کے آغاز ہی میں مجھے والرس مچھلی کا تین فٹ لمبا چابک استعمال کرنا پڑا لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے یہ بے زبان دوست جلد ہی میری آہٹ اور میری حرکات و سکنات کا اندازہ لگانے کے عادی ہو گئے تھے اور پھر جب بھی چابک ہوا میں گھماتا وہ اس کی سرسراہٹ سن کر ہی تیزی سے آگے بڑھنے لگتے تھے، برف آہستہ آہستہ گر رہی تھی اور ہمارا یہ تین آدمیوں پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔ سفر کا پہلا دن خاصا خوشگوار گزرا لیکن شام کے

وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ جین کی برف گاڑی ایک ٹھوس برف کی چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جین بچ گئی تھی۔ اسے معمولی خراشیں آئی تھیں لیکن برف گاڑی بری طرح تباہ ہو چکی تھی اب میں نے دونوں باقی برف گاڑیوں میں چار چار کتے جوت دیئے اور جین کو اپنی برف گاڑی میں اپنے ساتھ بیٹھا لیا تھا۔ رات ہوتے ہی برف کے طوفان کا زور بڑھنے لگا تھا اور میں نے کلائین سے کہا کہ ”ہمیں کمپ لگانا چاہئے۔“

ہم نے ایک برفانی چٹان کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اپنے اپنے بستر وہاں لگا دیئے۔ جین نے سارے راستے میرا دماغ چاٹ لیا تھا اور جس وقت سے وہ میری برف گاڑی میں آئی تھی اس نے اپنا دکھڑا سناٹے سناٹے میرے کان کھائے تھے، بد قسمتی سے میں نے اس سے یہ پوچھ لیا تھا کہ اس کا شوہر کمنگر کیا کرتا تھا۔

بس پھر کیا تھا وہ تو کسی کیسٹ کے ٹیپ کی طرح شروع ہو گئی اور جانے کہاں کہاں کے قصے کہانیاں سنانے لگی۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ جب وہ بات کرتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دلش لبوں سے پھول جھڑ رہے ہوں اور اسی لئے میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتی ہی رہے اور میں سنتا رہوں۔

میں جانتا تھا کہ کلائین خوب جل بھن رہا تھا اور میں خود بھی اس کو جانے کے لئے خوب قہقہے لگا رہا تھا اور میری فلک شکاف قہقہوں کی گونج میں جین کے دلکش اور نفرتی قہقہے بھی شامل تھے اور یہ جلتی پرتیل کا کام کر رہے تھے۔ کلائین ہم دونوں سے الگ تھلگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے کھانا بنانے میں مصروف تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں کلائین جیسے بد خصلت انسان پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں اس کی کڑی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔

ہم انسانی تہذیب و تمدن سے اس وقت پچاس میل دور آگئے تھے اور خلاف توقع کتوں نے ہمارا بے حد ساتھ دیا تھا جس وقت کھانا لگا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور جلدی جلدی کھانے لگے۔ کھانے کی طرف سے اچھی



طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ کلائن نے کھانے میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے کھانا اور جین کا کھانا ایک چھوٹی سی ٹرے میں لگایا اور اس کے پاس لے آیا جین کھانا کھاتے ہوئے بار بار محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی ایک شاندار پرکشش اور پرشباب عورت تھی۔

جین نے مجھے بتایا کہ اس کا تعلق ریاست مشی گن سے تھا اور اس کی شادی ایونٹاٹے کے ایک ماہر ارضیات سے ہوئی تھی وہ شکاگو یونیورسٹی میں ارضیات کا پروفیسر تھا لیکن بعد میں جب جین اور اس کی شادی ہو گئی تو وہ جین کے ساتھ مشی گن چلا آیا تھا اور اس نے یہاں کی یونیورسٹی میں ملازمت کر لی تھی جین اس وقت اٹھارہ برس کی ایک نوخیز کلتھی جب اس 42 سال کے ادھیڑ عمر پروفیسر کے عشق میں مبتلا ہو کر وہ محبت کی شادی کرنے کی حماقت کر بیٹھی تھی اور اس کا نتیجہ صاف ظاہر تھا پروفیسر کننگز کو اپنی ارضیات کی ضخیم کتابوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور جین کسی پاگل ہرنی کی طرح پریشان پریشان اور بوکھلائی ہوئی پھرا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر نے امریکی بحریہ میں ملازمت کر لی اور جین کو لے کر الاسکا چلا آیا تھا اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی بڑی دل پھینک اور فلرٹ واقع ہوئی تھی اور پھر ازدواجی زندگی کے گزشتہ چار سال کچھ ایسے خوشگوار بھی نہیں تھے جو جین یا کننگز کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلاتے یا دھنک کے رنگ بکھیرتے۔ جلد ہی جین اور اس کا شوہر ایک دوسرے کی رفاقت سے بیزار ہو چکے تھے۔ جین کسی طور پر مطمئن نہیں تھی اور پروفیسر کا خیال تھا کہ وہ اس منہ زور گھوڑی کو زیادہ دیر تک لگام ڈال کر نہیں رکھ سکتا تھا، جین کے خرے بھی بہت تھے اور وہ اس قدر خوش شکل تھی کہ ایک عام آدمی کے لئے اس کی ناز براداریاں کسی طور بھی ممکن نہیں تھیں، ویسے خوبصورتی بہت بری چیز ہوتی ہے اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھیں۔ جین کا باپ خود ایک ارب پتی تھا اور پھر پروفیسر نے بھی زندگی کے رنگین وقت دولت

کمانے میں گزار دیئے تھے اور اس وقت اس کے پاس کم وبیش پانچ کروڑاڑ تھے جو ایک خطیر رقم تھی۔ اس نے یہ رقم جین کے نام سے جمع کرا دی تھی اور یہ رقم اس رقم کے علاوہ تھی جو پروفیسر کی موت کی صورت میں جین کو ملنے والی تھی گویا کننگز کی موت اس قدر قیمتی تھی کہ اس کے مرتے ہی جین کو ایک مشیت دس کروڑاڑ مل جاتے۔

جین کے نازخروں کا یہ عالم تھا کہ اس کو محض انڈا ابلانے کے لئے چھ ملازموں کی ضرورت تھی اور مزید تین آدمی یہ ابلا ہوا انڈا پیش کرنے کے لئے درکار تھے اس کا ننھا سادل جس بات کی بھی خواہش کرتا پروفیسر اس کے لبوں سے بات نکلتے ہی اسے پورا کرنے کی کوشش شروع کر دیتا لیکن یہ تو حقیقت ہے تاکہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتی۔ اور اسی لئے جین کو اب دولت کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔

جب چینی کنگ میں کھولتی ہوئی کافی اور تلے ہوئے پارچے میں نے اسے دیئے تو اس نے بڑی چاہت سے مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا وہ بہت زور زور سے ہنس رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ ریچھ نما کلائن کا دل جلانے کے لئے ایسا کر رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ بڑھ چڑھ کر بات چیت کر رہا تھا۔

جین اس وقت اپنے شوہر کے لئے خاصی فکر مند تھی۔ وہ رات ہم لوگوں نے جاگ کر گزاری اور ہم آگ جلا کر دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے لیکن اس دوران کلائن برفانی ریچھ کی طرح خراٹے لیتا رہا۔

دوسری شب ہم دن بھر سفر کر کے نڈھال ہو چکے تھے اور تقریباً نوے میل سفر کر چکے تھے۔ جب ہم نے کیمپ لگایا تو کھانے سے فارغ ہو کر میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔

جین نے کہا۔ ”میرا موڈ ابھی سونے کا نہیں ہے تم سو جاؤ۔ میں کچھ دیر یہاں آگ کے پاس بیٹھ کر اس برفانی موسم سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔“ ہم کافی پی چکے تھے اور کلائن سو گیا تھا۔ جین کے منہ سے بھاپ



نکل رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”جین میرا خیال ہے کہ اب تمہیں سو جانا چاہئے کیونکہ کل صبح ہم نے بہت جلدی یہاں سے نکلنا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں جلد از جلد اس مہم کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟“ میں چاہتا تھا کہ وہ آرام کر کے تازہ دم ہو جائے۔

وہ پھٹ پڑی۔ ”خدا کے واسطے کرمس، تمہیں کیا ہو گیا ہے یہ ضروری تو نہیں کہ اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو میں بھی سو جاؤں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“

میں اس کی بات سن کر اپنے بستر میں جا گھسا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کمبل سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آگ کے قریب بیٹھی تھی اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کے رخساروں پر جھول رہی تھی۔ فضا کی خاموشی میں برف گرنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی اور کلائین کے خراٹوں سے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے انگرڈ بیٹھی تھی۔

میں نے اپنے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آگ کے شعلوں کا عکس جین کے رخساروں پر پڑ رہا تھا اور وہ کسی حسین سرخ گلاب کی مانند دکھائی دے رہی تھی ایسے میں مجھے آگ میں پھول والی تشبیہ یاد آ گئی۔ جین نے اچانک مڑ کر میری طرف دیکھا پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کا غلبہ آہستہ آہستہ حاوی ہوتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قریب آ کر کوئی بیٹھ گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، جین مجھ سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اس نے میری داڑھی میں انگلیاں پھیریں جو گزشتہ کئی ہفتوں سے بہت گھنی ہو گئی تھیں، مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں حیران ہوں کہ یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے، رات آتے ہی تم مرد لوگ آخر کیوں خرگوش کی طرح آنکھیں بند کئے خرخر کرنے لگتے ہو۔ میں تو بور ہو کر رہ گئی ہوں۔“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”میں خرگوش نہیں، آدمی ہوں بلکہ مرد ہوں، سمجھتی کیا ہو تم اپنے آپ کو؟“

میں نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنے ساتھ

لٹالیا۔ وہ میرے پہلو میں گر کر کسمسانے لگی۔ میں نے کہا تم جانتی ہو ایک بار کیا ہوا۔ ایک مرتبہ میری ہی طرح ایک گائیڈ تم جیسی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ایک جنگل میں سفر کر رہا تھا اچانک اس لڑکی کے کچھ اور چاہنے والے ادھر آنکے پھر جانتی ہو کیا ہوا۔ ایک گولی آئی اور گائیڈ کی کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی اور یوں اس حسین سفر کا اس قدر المناک انجام ہوا۔“

وہ ہنس دی۔ ”اور تم۔“ تم اس قدر بزل ہو کہ۔“ میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور اس کے یا قوتی ہونٹوں کو اپنے لبوں سے سی دیا۔ میں نے جلدی سے برف گاڑی سے اپنا قیمتی کمبل نکالا اور اپنے اوپر بلکہ ہم دونوں کے اوپر ڈال لیا۔ وہ کچھ سردی سی محسوس کر رہی تھی، اس نے مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا اس کا بدن لذتوں اور حلاوتوں سے بھرپور تھا اور ہم دونوں اس وقت اسکی سوبا شندوں کی طرح بڑے روایتی انداز میں ایک جان دو قالب ہو گئے تھے۔

لیکن اگلی صبح جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ رات کو بد خصلت اور بدنیت کلائین سویا نہیں تھا وہ حرام زادہ جاگ رہا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ ہم نے صبح جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ میں اگر چاہتا تو چابک سے اس کی کھال ادھیڑ سکتا تھا اس کی ٹانگیں توڑ سکتا تھا اس کی کھوپڑی میں اپنی رائفل سے کئی سوراخ کر سکتا تھا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی طنزیہ مسکراہٹ پھیلی جا رہی تھی اور اس کے چہرے کا احاطہ کرتی چلی جا رہی تھی لیکن میں ایسے معاملات میں بڑے ٹھنڈے دماغ اور مستقل مزاجی سے کام لینے کا عادی ہوں اور اس لئے میں نے یہ سوچ کر کہ ابھی ہمیں کلائین کی ضرورت تھی اس کی اس طنزیہ مسکراہٹ کو بالکل نظر انداز کر دیا اس پر قطعی توجہ نہیں دی اور یوں بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

جین بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں اس قدر خاموش اور اکھڑا کھڑا کیوں تھا لیکن میں نے اسے نال دیا۔ میں اسے بھلا کیا جواب دیتا کہ اصل بات کیا



تھی۔ یہ معاملہ صرف میرے اور کلائین کے درمیان تھا۔ میں اسے تکون نہیں بنانا چاہتا تھا۔

”کرمس۔ کیا بات ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔

یہ ہمارے سفر کا تیسرا دن تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے برف کا طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے جین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، دوپہر کے وقت ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جس کے متعلق میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ برف میں ایک ٹوٹی ہوئی برف گاڑی، دھنسی ہوئی تھی۔ ہمارے کتے تیزی سے دوڑ رہے تھے ہم اس ٹوٹی ہوئی برف گاڑی کے قریب جا کر رک گئے۔ برف میں جمے ہوئے خون کا دھبہ جمع ہوا واضح نظر آ رہا تھا اور کتوں کی کھال کے نیچے پھیلے ہوئے ٹکڑے بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کسی آدمی کی ٹوٹی چبائی ہوئی کھوپڑی برف میں دھنسی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پھٹے ہوئے لباس کے چھتھرے بکھرے تھے۔ خون خوار برفانی بھیڑیوں نے لاش کا کوئی نام و نشان تک باقی نہیں چھوڑا تھا۔

جین سہم کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی۔ پروفیسر کمنگز اس کا شوہر اب اس دنیا سے دور بہت دور بھی واپس نہ آنے کے لئے جا چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں یا جین کچھ کہتے کلائین نے جس کا چہرہ اس وقت موت کے خوف سے سیاہ ہو گیا تھا چیخ کر چابک ہوا میں لہرایا اور اس کی گاڑی کو کتے کھینچتے ہوئے تیزی سے واپس لے چلے، اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتے تھے۔ جین کی آنکھیں فرط خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کا بدن بید مجنوں کی طرح لرزاں تھا اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ کتوں کی غراہٹ اور برف پر نیچے گھسیٹنے کی آوازیں بتدریج بڑھ رہی تھیں اور کلائین کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے خوف کو دیکھ کر میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ہم خونخوار وحشی بھیڑیوں کے نرغے میں تھے اور موت ہماری منتظر تھی۔

سرد اور خوفناک موت۔

جین نے ایک سسکی لی اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جیسے اس کی زبان پرتالے پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرز رہے تھے۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی پھر اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ”ک۔۔۔۔۔ کیا کمنگز۔۔۔۔۔؟“ میں نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”ہاں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بھیڑیوں نے اسے ہلاک کر ڈالا اور اس کے بدن کی ایک ایک ہڈی چبا گئے۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنا چابک لہرایا۔ کتے برق رفتاری سے مڑے اور جلدی جلدی فاصلہ طے کرنے لگے۔ کلائین برق گاڑی تیزی بھگائے جا رہا تھا اسے ہماری کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن ہم اس کی پرواہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ ہمارا تمام راشن اس کی برف گاڑی میں لدا ہوا تھا اور ہم راشن کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

کتے ہانپ رہے تھے لیکن وہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ برف گاڑی بار بار ہچکولے کھا رہی تھی اور اس وقت کلائین اور میں دونوں ہی واپسی کے لئے کوئی مختصر ترین راستہ تلاش کرنے میں مصروف تھے تاکہ شام ہونے سے پیشتر کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکیں۔

اچانک مجھے کلائین کی خوفناک چیخ سنائی دی اس کی برف گاڑی ٹوٹی ہوئی برف میں دھنسی رہی تھی اور وہ مدد کے لئے چلا رہا تھا میں تیزی سے اس کے قریب جا پہنچا۔ برف میں شکاف پڑ رہا تھا اور برف گاڑی اس برف کے ہولناک گڑھے میں گرتی جا رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کلائین کو اس میں ہی زندہ دفن کر دوں اسے مر جانے دوں لیکن پھر اس خیال کے آتے ہی کہ اگر بھیڑیوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو میں اکیلا کہاں تک ان عفریتوں کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور برف گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ وہ برف کی چکنی سطح پر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ پھر میں کتوں کی طرف متوجہ ہوا وہ برف گاڑی کو باہر کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے جلدی جلدی اپنی برف گاڑی سے کتوں



کو کھولا اور انہیں دوسری برف گاڑی والے کتوں کے ساتھ باندھ دیا اور چابک فضا میں لہرایا۔ کلائمن بچ گیا تھا۔ ہمارے کتوں نے بقایا چار کتوں کے ساتھ مل کر برف گاڑی کو باہر کھینچ لیا تھا لیکن اس افراتفری میں راشن کا ایک بڑا سا پیکٹ برف کے شگاف میں گرتا چلا گیا اور جلدی نظروں سے اوجھل ہو گیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آخر ہم لوگ کچھ راشن اور برف گاڑی بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے ورنہ شاید ہماری مصیبت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

ہم نے اس بار پھر برق رفتاری سے اپنا واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ہم کمنگز کا انجام دیکھ چکے تھے اور ہمیں جلد از جلد ان بھیا تک درندوں کے مسکن سے دور چلے جانے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ کتے کافی تھک کر ہانپنے لگے تھے اور ہم تینوں بھی بری طرح نڈھال ہو چکے تھے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب کتے برف پر دوڑنے کی بجائے گھسنے لگے تھے اور ہم ان بے زبان جانوروں پر مزید ظلم نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے دونوں برف گاڑیاں روک دیں۔

دھچکوں اور ہچکولوں کی وجہ سے جین کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا بات ہے تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ آخر اس افراتفری کا کیا مطلب ہے پھر اس نے بڑے پر مطمئن لہجے میں کہا۔“

میں جانتی ہوں کہ اب میرا خاوند مر چکا ہے اور اسے بھیڑیوں نے ہلاک کر دیا ہے لیکن وہاں تو کوئی بھیڑیاں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں وہاں پا کر ڈر کر بھاگ گئے تھے پھر اس افراتفری کا کیا فائدہ؟“ اس کے لہجے میں تجسس اور حیرت نمایاں تھی۔ میں نے غمگین نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

”دیکھو! تم زیادہ عقلمند بننے کی کوشش مت کرو اور اپنی زبان بند رکھو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم صرف اپنی خوبصورت آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں جانتی کہ وہاں واقعی اس وقت کوئی بھیڑیا موجود نہیں تھا ورنہ ہم اس وقت تک ان کے معدوں کی نذر ہو چکے ہوتے۔ وہ سب ایک غول کی شکل میں اکٹھے

ہو کر حملہ آور ہوں گے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے بدن کی بوپا کر ہمارے کتوں کے پاؤں کے نشانات کو سونگھتے ہوئے ہمارا تعاقب کر رہے ہوں گے اس لئے کہ مسٹر کمنگز کے بعد اب ہماری باری ہے۔“

اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے گانا شروع کر دیا۔ ”بھیڑیے سے کون ڈرتا ہے جی۔“ میں اس کی دلیری اور جرأت پر حیران رہ گیا اور میں نے اسے اس رویے پر سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”حیرت ہے تمہارا شوہر مر گیا ہے اسے بھیڑیوں نے چٹ کر لیا ہے اور تم گارہی ہو۔“

اس نے جواب میں حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”اور تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں رونا شروع کر دوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی مجھے اس سے کوئی محبت و ہمت نہیں تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی میں سمجھتی ہوں کہ اس کا جو حشر بھی ہوا بہتر اور بے حد مناسب ہے۔ جب میں نے گزشتہ دنوں اس سے کہا کہ میں طلاق لینا چاہتی ہوں تو اس کا ہونق اور بے رونق چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ عجیب گھامڑ اور چغند شوہر تھا۔ میں نے ایسا بوم آدمی نہیں دیکھا۔ کم بخت کو جس لطافت یا حس مزاج چھو کر نہیں گزری تھی۔ میں صرف یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ واقعی مر چکا ہے اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے۔“

میرا جی چاہا کہ اس بد بخت عورت کے منہ پر اس قدر زناٹے دار تھپڑ رسید کروں کہ وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گرے۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب اس منحوس کے کہنے پر میں دولت کے لالچ میں پھنس گیا تھا اور میں نے یہ جان لیا سفر شروع کر دیا تھا۔

وہ میرے قریب آئی اور میری داڑھی سے کھیلتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔ ”چھوڑو بھی یہ تم نے کیا بکواس لگا رکھی ہے آؤ پروفیسر کمنگز کی موت کا جشن منائیں۔“ میں نے اسے اپنے جسم سے دھکیلتے ہوئے اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”دور ہو جاؤ ہٹ جاؤ میرے پاس سے۔ خدا معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں تم سے ملا تھا۔“



شام کے سائے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے اور ہم نے ایک چھوٹی سی برفانی چٹان کے پاس اپنا خیمہ لگالیا تھا۔ بہت سی لکڑیاں جو ہم نے یہاں جاتے وقت جمع کی تھیں انہیں برف سے کھود کر ہم نے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگادی پھر ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگے بھوک ختم ہوتے ہی گندم کے خمار نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے بستر میں جا گھسا۔ تھکن کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ جسمانی تھکن کے علاوہ اعصابی تھکن بھی مجھے نڈھال کئے دے رہی تھی۔

اچانک میری چھٹی حس نے مجھے کسی ناگہانی خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے خبردار کیا۔ چاند کی روشنی میں سامنے کا منظر بہت صاف اور واضح نظر آ رہا تھا۔ جین دوسری طرف کروٹ لئے لیٹی تھی اور اس کا چہرہ کبل سے باہر تھا لیکن پھر اچانک میری نظر کلائین پر پڑی جو دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چابک سنبھالا ہنر کلائین کے ناک کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ وہ رک گیا اور خونخوار نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ادھر تو خونخوار بھیڑیے ہمارا تعاقب کر رہے تھے اور ادھر اب میرے ہی کمپ میں ایک اور ہولناک درندہ میرے لئے درد سربن گیا تھا۔ ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کلائین نے آہستہ سے سر ہلایا اور میری طرف دیکھتا ہوا واپس اپنے بستر میں جا کر لیٹ گیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں بھیگی تھی کہ میری طبیعت کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ میں نے جلدی جلدی جین کو بیدار کیا اور کتوں کو واپس برف گاڑی میں جوت دیا۔ ابھی ہم لوگ اپنا سفر بھی کرنے نہ پائے تھے کہ فضا میں بھیڑیوں کی خون خوار آواز گونجی۔ بھیڑیوں کے رونے اور چلانے کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ خطرہ لحظہ بہ لحظہ، لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اب ہمارا وہاں سے بھاگنا یا کہیں جانا بے سود

تھا۔ ہمیں اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر کبھی بھاگ جانے کو ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ میں ہمیشہ موت سے پنچہ آزمائی کرنے کا قائل رہا ہوں اور فرار ہونے پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ اب میں نے اس مرحلہ پر باقاعدہ طور پر جنگ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ مجھے مورچہ بندی کرنی تھی تاکہ ایک قابل مل منصوبے کے تحت اپنا کام کر سکوں۔ میں جانتا تھا کہ اب قضا ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں لیکن میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ایک باہر کی طرف نکلی ہوئی برفانی چٹان کے قریب اپنا کمپ لگایا۔ یہاں مجھے کچھ لکڑیاں اور بھی مل گئی تھیں۔ میں نے یہاں ایک بہت بڑا لاؤ جلا یا۔ اب ہماری پشت پر برف کی دیوار تھی اور سامنے کی طرف برف کا وسیع و عریض میدان نظر آ رہا تھا اور حد نظر تک برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی دونوں کلباڑیاں سنبھالیں اور چٹان کے عقبی حصے کی طرف اگی ہوئی خود درجنگلی جھاڑیاں کاٹنے لگا۔ مجھے اپنی ان دونوں کلباڑیوں سے لکڑی کاٹنے کا اس قدر تجربہ ہو چکا تھا کہ میں نے چشم زدن میں تمام جھاڑیاں کاٹ کر ایک بڑا سا ڈھیر لاؤ کے پاس لگا دیا۔

کلائن اور جین بڑی حیرت بھری نظروں سے میری برق رفتار کار کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں ان دونوں پر بھی یہ بات ہر حالت میں ثابت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آسانی سے موت سے ہار ماننے یا حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ جلد ہی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے ارد گرد کی برف چٹخنے اور پگھلنے لگی۔ جلد ہی جین کو حالات کی سنگینی کا علم ہو گیا بھیڑیوں کی آوازیں اب زیادہ بلند اور واضح ہوتی جا رہی تھیں۔

جونہی برف کے کہر میں پہلے بھیڑیے کا منحوس چہرہ نمودار ہوا جین نے ایک دلخراش چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ خوف کے مارے اس کا برا حال تھا اور اس وقت سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ موت کے خوف سے اس



کے بدن پر لرزہ طاری تھا اور گھگھکی بندھی ہوئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔ اور اس کا چہرہ کفن کے لٹھے کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دلا سہ دیا مگر وہ کانپتی رہی، لرزتی رہی۔

یہ وہ بھیڑیے نہیں تھے جو محض چڑیا گھروں میں بند رکھے جاتے ہیں یا جنہیں دیکھ کر بچے تالیاں بجانے لگتے ہیں یہ الاسکا کے قوی ہیکل ڈھائی تین سو پونڈ وزنی بھیڑیے تھے جن کے خونی جڑوں سے ان کے تیز اور نوکیلے دانت کسی ڈریکولا کے دانتوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے ان کی سرخ زبانیں باہر نکل رہی تھیں۔ وہ وحشی اور خون آشام درندے تھے جو غول کی صورت میں مل کر کسی انسان کی تو کیا شیر جیسے بہادر جانور کی بھی تکا بولی کر سکتے تھے۔

وہ ایک ایک کر کے کافی فاصلے پر اکٹھے ہو رہے تھے، سفید، بھورے، سرمئی اور براؤن رنگ کے خونخوار بھیڑیے جن کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ وہ ہم سے تقریباً ڈھائی سو فٹ دور آ کر بیٹھ گئے وہ ہانپ رہے تھے اور ان کے حلق سے آہستہ آہستہ غرائے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرے آنکھوں کتوں کی آنکھوں سے خوف عیاں تھا۔ بھیڑیے کافی فاصلے پر نیم دائرے کی صورت میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ہماری اعصابی دورے کے منتظر تھے۔ وہ بڑے سکون اور صبر سے ہمارے بدن کا گوشت نوچنے کی تیاری میں مصروف تھے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں بھیڑیے سے زیادہ صبر کرنے والے جانور اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ میں نے سامان ٹولا اور اپنی قابل اعتماد ون چیئر رائل نکالی۔ میرے پاس اس وقت پندرہ رائونڈ تھے۔ میں نے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک آگ جل رہی تھی اور جس وقت تک یہ خوف ناک ہتھیار ہمارے پاس تھا وہ ہمارے قریب آنے کی جرات نہیں کریں گے۔

ہم نے حیرانی سے دیکھا کہ جونہی ایک بھیڑیے کے گولی لگی اور وہ چکرا کر گرا۔ اس کے ساتھ ہی بھیڑیے چیل کی طرح اس پر حملہ آور ہوئے اور زخمی بھیڑیے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

چند سیکنڈ میں وہاں ٹوٹی ہوئی ایک کھوپڑی اور چند ہڈیوں کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ابھی تک وہ بھیڑیے اپنے ساتھی کا خون چاٹ رہے تھے اور اس کی آنتوں اور او جھڑی کے لئے کتوں کی طرح آپس میں لڑ رہے تھے ان کی خونخوار غراہٹ اور چیخنے کی آوازیں بڑی خوف ناک تھیں اور ان میں سے کئی تو برف میں دور تک لڑھکتے چلے گئے تھے چند لمحوں بعد وہاں کھال بھی باقی نہیں تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک عرصے سے مردہ گوشت کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اب وہ اس بات کے منتظر تھے کہ میں اور بھیڑیوں کو ہلاک کروں۔ میں نے یکے بعد دیگرے دس بار فائر کئے اور دیکھا کہ ان کی تعداد میں رفتہ رفتہ کمی ہو رہی تھی لیکن انہوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سوچا۔ ”کیا یہ حرام زادے میرا اسلحہ ختم ہو جانے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن میرا اندازہ غلط تھا وہ صرف اس بات کے منتظر تھے کہ میں اور بھیڑیوں کو زخمی کرتا رہوں تاکہ وہ اپنے ساتھی درندوں کا خون اور گوشت اڑا سکیں۔ ہر بار جب میری رائفل شعلہ انگشتی اور کوئی نہ کوئی بھیڑیا زخمی ہو کر برف پر تڑپنے لگتا تو تمام بھیڑیے اس کے نیم مردہ جسم کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور اس کے آپریشن یا پوسٹ مارٹم میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے، یہی ان کا شغل بن گیا تھا۔

وہ سب اپنی اپنی پسند کے مطابق اس کے بدن سے اپنی مرضی کے حصے نکالتے اور دور جا کر کھانے لگتے۔ ان کی غراہٹ اور ہٹ دھرمی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سچ ہے کہ ہر کمزور کو طاقت ور کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی ہوتے ہیں۔ ”ٹائیگر۔ ٹائیگر۔ وہ اب ہم پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“ جین نے سسکی لی اور میرا بازو پکڑ کر جیسے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، میں نے مڑ کر اس



طرف دیکھا جہاں ایک سرمئی رنگ کا بڑا سا گدھے کی جسامت والا بھیڑیا کافی دیر سے بڑے ٹھل اور صبر سے بیٹھا ہوا میری حرکات کا یوں جائزہ لے رہا تھا جیسے وہ میرے اعصاب کے تھک جانے کا انتظار کر رہا ہو اور واقعی یہ بات صحیح بھی تھی، وہ بڑی منصوبہ بندی سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ سلور گرے رنگ کا بڑا سا بھیڑیا جوان تینوں بھیڑیوں کے آگے آگے چل رہا تھا اب میری طرف آ رہا تھا میں اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ جین نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپالیا تھا اور سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میں نے رائفل ایک طرف پھینک دی اور اپنی مضبوط کلہاڑی سنبھال لی۔ اس سے پہلے کہ وہ بھیڑیے مجھ پر حملہ آور ہوتے میں نے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے آگے بڑھنے والے درندے کی کمر توڑ دی پھر جیسے مجھ پر دیوانگی کا سادورہ پڑ گیا۔ میں پاگلوں کی طرح کلہاڑی گھمانے لگا اور باقی تمام بھیڑیے چیختے ہوئے واپس بھاگے۔ وہ سب پسپا ہو رہے تھے شاید ان کا سرغنہ مارا گیا تھا۔

بھیڑیے وقتی طور پر پسپا ضرور ہو گئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ پھر آئیں گے، میں نے اپنے بچے کچھے اسلحہ کا جائزہ لیا میرے پاس صرف پانچ کارتوس باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ اس بار زیادہ تعداد میں آئے تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہر حالت میں ہم تینوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ میں دل دہی دل میں کلین کو کونسنے لگا جس کے بے احتیاطی کی وجہ سے ہمارا اسلحہ اور کارتوس ضائع ہو گئے تھے۔

اسی اثناء میں جین نے کافی تیار کر لی تھی اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے کافی کاٹک میری طرف بڑھایا اور کہنے لگی۔ ”ٹائیگر میں چاہتی ہوں کہ جب تم دیکھو کہ مقابلہ بیکار ہے تو اپنے ہاتھ سے مجھے گولی مار دینا ایک کارتوس میرے لئے ضرور بچالینا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔ وہ بولی۔ ”آہ میں جانتی ہوں کہ یہ میری آخری خواہش ہے لیکن مجھے

یقین ہے کہ تم اسے ضرور پورا کرو گے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا اور کافی کی چسکیاں لینے لگا، اس وقت موت کے دہانے پر کھڑے ہو کر بھی کافی کا تلخ ذائقہ مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اب میں اپنے دشمنوں کا منتظر تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پھر کافی فاصلے پر بہت سے بھیڑیے نمودار ہوئے ان کی مکروہ آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں اور جلد ہی وہ کہر کی چادر کو چیرتے ہوئے سامنے آگئے۔ دھندلی روشنی میں ان کی آنکھیں دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بے حد تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ انسانی گوشت اور خون کی تیز بو اور طلب انہیں یہاں کسی مقناطیس کی طرح کھینچ لائی تھی اور اب وہ اپنے صبر کا پھل چکھنے کے لئے بے قرار تھے، ان میں کچھ پرانے بھیڑیے بھی تھے اور اب تازہ دم مک انہیں مل چکی تھی۔ میں نے دیکھا بھیڑیے بھی تعداد میں کم و بیش 25 یا تیس رہے ہوں گے۔

بھیڑیوں کا یہ غول بھی پہلے کی طرح ہم سے تقریباً دوسوٹ کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بار وہ آہستہ آہستہ فاصلہ کم کر رہے تھے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ اس آگ کے عادی ہو چکے تھے اور انتقامی جذبہ انہیں ہماری طرف دھکیل رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کا گوشت کھا کھا کر اکتا چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آگ آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی تھی اور اب بھیڑیوں کے معدوں میں بھوک کی آگ بھڑک رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ بھیڑیے اپنی خونخوار سرخ زبانیں نکالے ہمارے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے بھوک نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے بھی ٹک کر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جلد ہی وہ ہم پر تیر کی طرح حملہ آور ہوں گے وہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھ کر صبر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے انتظار کی حد ختم ہونے کو بھی اب انہیں آگ کا خوف بھی ہم سے دور نہیں رکھ سکتا تھا۔

موت کے خیال سے مجھے جھرجھری آنے لگی اب ہمارے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ہم ایک ٹوٹی ہوئی



چٹان کے نیچے کھڑے تھے جس کے اطراف میں ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں اور سامنے بھیڑیوں کا یہ غول ہمارے اعصاب کے تھک کر چور ہو جانے کا منتظر تھا۔ دوسرے الفاظ میں موت ہماری منتظر تھی۔

میں نے سنا گاڑی کھینچنے والے آٹھوں کتے آہستہ آہستہ غرار ہے تھے وہ سہمے ہوئے تھے اور خود کو شاید ذہنی طور پر اس خونریز جنگ کے لئے تیار کر رہے تھے جو ان کی زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ میں نے اپنی دونوں کلباڑیاں سنبھال لیں۔ بندوق اب بیکار ہو چکی تھی۔ ”تیار ہو جاؤ۔“ میں نے چیخ کر کلائم سے کہا اور اس نے اپنا شکاری چاقو ڈب سے نکال لیا۔

خونخوار درندے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے فولادی اور مضبوط پٹھے اور خنجر کی مانند تیز دھار والے دانت سرخ سرخ زبائیں اور خون برساتی ہوئی آنکھیں یہ سب اس قدر دہشت ناک تھے کہ میری روح لرز کر رہ گئی۔ میں پاگلوں کی طرح خود کو باور کر رہا تھا کہ یہ سب محض ایک بھیانک خواب تھا لیکن یہ ایک اٹل اور سنگین حقیقت تھی۔

میں اپنی کلباڑیاں سنبھالے ان خونخوار بدروحوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ میں اگر ایسا نہ کرتا تو آج اپنی داستان نہ سنار ہا ہوتا۔ گولیاں تو میں ختم کر چکا تھا لیکن بھیڑیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس مرحلے پر میں نے ہمت ہار دی تو چند لمحوں بعد درندے میری کھال بھی کھینچ لیں گے۔ اور شاید میں اسی لئے زندہ تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا تھا ادھر کلائم بھی تین چار بھیڑیوں سے بیک وقت گتھم گتھا تھا۔ میرا چہرہ، داڑھی اور کپڑے ان درندوں کے خون میں لت پت ہو چکے تھے اور اب ان کی تعداد کم ہوتے ہوئے صرف دس رہ گئی تھی۔

اس خونریز جنگ میں جو ہم تینوں کے لئے زندگی اور موت کی جنگ تھی ہمارے آٹھوں کتے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑے موثر انداز میں حملہ کرنے میں مصروف تھے۔ اچانک مجھے یوں لگا

جیسے میری پشت میں کسی نے زہر میں بچھا ہوا خنجر گھونپ دیا ہو۔ میں بجلی کی سی تیزی سے مڑا۔ ایک بھیڑیائے مجھ پر پشت سے حملہ کر دیا تھا اور اس کے تیز دانت میرے چمڑے کے کوٹ سے ہو کر میرے شانے میں اتر گئے تھے۔

میں نے پوری قوت سے کلباڑی کا ایک وار کیا اور اس کی کھوپڑی سے بھیجائیکل کر چاروں طرف بکھر گیا، اب میرے چاروں طرف مردہ نیم مردہ زخمی بھیڑیے پڑے تھے۔ میں نے کلباڑیاں پھینک دیں اور رائفل کے دستے سے ان کے سر پاش پاش کر دیئے ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بمشکل تمام دو تین بھیڑیے زندہ بچ سکے تھے اور اپنی جان بچا کر جنگل کی طرف بھاگے۔ جنگل جو ان سے میلوں دور تھا لیکن اب بھوک کی آگ مٹانے سے زیادہ انہیں اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی اور وہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ہم سے دور چلے جانا چاہتے تھے میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔

میں اب بری طرح تھک گیا تھا اور واقعی نڈھال ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جین اب ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ کبل اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا اب وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے خدا کے حضور شکر ادا کرنا شروع کر دیا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور رائفل کے ٹوٹے بٹ کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگانے لگی۔ میں کسی جنونی اور دیوانے کی طرح اس کی یہ حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور برف کے چنخنے یا لکڑیوں کے سلگنے کی آواز کبھی کبھی اس خاموشی کا سینہ چیر جاتی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے پھر خبردار کر رہی تھی کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ میں نے اچانک کلائم کی طرف دیکھا کلباڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی وہ ابھی تک اپنے حواس بحال نہیں کر سکا تھا۔

لیکن نہیں وہ ہوش میں تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرتے ہوئے ہولناک نگاہوں سے جین کی طرف دیکھا پھر اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتے



ہوئے کلباڑی تولتا ہوا میری طرف بڑھا۔ ”ٹانگر۔  
ہوشیار ہو جاؤ!“ جین چیخا۔

میں اب خود کو پوری طرح مستعد اور تیار کر چکا تھا۔  
”جہاں میں نے اتنے خونخوار درندوں کا مقابلہ کیا تھا وہاں  
ایک درندہ اور سہی۔“ یہ خیال میرے لئے باعث تقویت تھا  
کہ ”جین کے دل میں میرے لئے محبت تھی اور وہ کبھی خود  
کو کلائین کے حوالے نہیں کرے گی۔“ اس خیال نے  
میرے اندر ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دی تھی۔ میں بجلی  
کی سی تیزی سے جھکا اور کلائین کی پھینکی ہوئی کلباڑی میری  
کھوپڑی کے قریب سے گزرتی ہوئی دور جا گری۔

کلائین بڑی برق رفتاری سے بھاگا تاکہ  
کلباڑی اٹھا سکے۔ میں نے اپنی ٹانگ اس کی ٹانگوں  
میں پھنسا دی۔ وہ اس غیر متوقع حملے کے لئے بالکل تیار  
نہیں تھا وہ چاروں شانے چت جا گرا۔ میں نے فوراً  
اسے جالیا اور اس کے سر اور چہرے کو اپنے وزنی بوٹوں  
کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اچانک لیٹے لیٹے کلائین نے  
اچھل کر میرے ناف کے نیچے ایک فلائنگ کلک رسید کی  
تو میں درد کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں  
برف پر پڑا تھا اور کلائین کے وزن تلے میرے سینے کی  
ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔

وہ پوری بربریت اور درندگی سے اپنے کام میں  
مصروف تھا۔ اچانک اس نے ایک ہاتھ میری گردن سے  
اٹھالیا اور قریب پڑی ہوئی کلباڑی اٹھا کر جین کی طرف  
پھینکی۔ جین شاید میری مدد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے جین کی  
ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ کلباڑی اس کی پنڈلی میں لگی تھی۔  
اس خونریز جنگ میں ہمارے چار کتے بھی ہلاک  
ہو گئے تھے۔

اچانک مجھے قریب ہی سے ایک غراہٹ سنائی  
دی۔ آہ یہ کوئی بھیڑ یا نہیں میرا سب سے جاندار کتاباک  
تھا۔ ہاک نے کلائین کا ٹیٹا اپنے خونخوار جبروں میں  
دبایا تھا اور اس خونریز کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔  
چند منٹ بعد کلائین بے ہوش ہو گیا تھا، اب وہ بے حد زخمی  
حالت میں تھا۔

میں نے جلدی سامان سمیٹا، برف گاڑی میں کتوں  
کو جوتا اور جین کو گود میں اٹھا کر برف گاڑی میں جا کر ڈال  
دیا، ہمیں جلد از جلد اس جہنم سے نکل جانا ہوگا۔ آخر وہی  
ہوا جس کا مجھے ڈر تھا کلائین خود کی فر کردار کو پہنچ جائے گا۔  
خس کم جہاں پاک؟ ٹھیک ہے ناں۔“ اور جین  
نے اپنی مرمریں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔  
مجھے کچھ پتہ نہیں، کچھ معلوم نہیں کہ اس مہم سے  
زندہ واپس آ جانے کے بعد میں نے کیا کیا۔ ہاں میں  
چار دن اور چار راتیں متواتر سویا رہا۔ میں اس قدر تھک  
گیا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔

جین اب واپس جانا چاہتی تھی لیکن وہ مصر تھی کہ  
میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ ”تم کل میرے ساتھ  
فلوریڈا چل رہے ہو نا۔“ جین نے کہا۔

”شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں ایک قاتل  
ہوں جس کی تلاش میں سی آئی اے انٹرپول اور اسکاٹ  
لینڈ یارڈ کے علاوہ ایف بی آئی کے شکاری کتے لگے  
ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم  
ایکلی لوٹ جاؤ اور مجھے میری دنیا میں ہی رہنے دو۔“  
”نہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا  
نہیں کر سکتی، میں دیکھ چکی ہوں کہ تم ایک بہادر، دلیر اور  
جواں مرد انسان ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی کیا میں  
تمہاری شریک حیات نہیں بن سکتی۔“

میں نے اس کی اس بات کا جواب وہاں نہیں دیا  
اگلا دن اتفاق سے اتوار تھا، میں نے اس کا بازو تھاما  
اور جا کر فادر کے سامنے کھڑا ہو گیا، اب ہم قانونی  
اور شرعی طور پر میاں بیوی بن چکے تھے۔

کہانی جب ختم ہو گئی تو شاگرد بولا۔ ”استاد کہانی  
ختم ہو گئی۔“ یہ سن کر رولو کا مسکرا نے لگا۔

کہ اتنے میں رولو کا کے ایک نادیدہ کارندہ کی  
دل دہلا دینے والی، دل و دماغ کو مہوت کرتی، بدن پر  
لرزہ طاری کرتی، رگوں میں خون کو منجمد کرتی اور پورے  
جسم پر سکتہ طاری کرتی سرگوشی کان کے پاس سنائی دی۔  
(جاری ہے)





## بدروح بلی

خالد شاہان - صادق آباد

سامنے موجود ہیولہ نے اچانک ایک عورت کا روپ دھار لیا اور اس کے کئی ہاتھ نمودار ہو کر آگے کو بڑھنے لگے اور پھر دو ہاتھوں نے سامنے کھڑے سادھو کو دبوچ لیا گرفت سخت تھی کہ سادھو اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

جادوئی عمل کا لرزہ براندام کرتا عجیب و غریب شاخسانہ جو کہ دلوں پر ہیبت طاری کر دے گا

”تمہاری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تم ہدایت کو غور سے نہیں سنتیں۔ اسی وجہ سے اس پر عمل در آمد نہیں کر پاتی۔ اپنی یہ کمزوری دور کرو۔“

بلی کی نگاہیں سادھو کی نگاہوں میں جیسے پیوست تھیں۔

سادھو کہہ رہا تھا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری کمزوری ایک ہی دن میں ختم ہو جائے گی، کوئی بھی کمی یا

اس بلی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اگرچہ ڈرنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ مگر پھر بھی اس سے ایک نجانہ سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو سادھو اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بلی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

سادھو بلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں باتیں کر رہا تھا کہ جیسے وہ بلی نہیں بلکہ انسان ہو۔



خامی ایک ہی دن میں نہیں دور ہوتی آہستہ آہستہ دور ہوتی ہے۔ کوشش کرو، کروگی تو ناں کوشش۔“

بلی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”تم ناراض تو نہیں ہو گئیں میری باتوں سے۔“ سادھو نے پوچھا۔

بلی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”شاباش اب جاؤ مگر دیکھو زیادہ دور نہ جانا۔ بس اتنی دور رہو کہ جب میں تمہیں بلاؤں تو تمہیں آنے میں دیر نہ لگ جائے۔“ سادھو کی بات ختم ہونے پر وہ کھڑی ہوئی اور اس نے احترام سے اپنا سر جھکایا۔ اور ایک طرف کو چلنے لگی۔

میں دور کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ دراصل میں سادھو سے ملنے اس کے پاس گیا تھا۔ مگر اس کی بلی سے اس دوران گفتگو سن کر ٹھٹھک گیا تھا۔ بلی میرے قریب سے مجھے گھورتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے ہلکے سے آواز دی۔ ”میں اندر آ سکتا ہوں۔ سادھو صاحب۔“

”آ جاؤ۔“

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ میں تازہ بہ تازہ لاہور کے سائٹ ایریا میں پہنچا تھا۔ جہاں مجھے ایک زیر تعمیر پروجیکٹ میں ملازمت ملی تھی۔ یہ علاقہ شہری آبادی سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس علاقے میں ایک دوا ایسے ہی پروجیکٹ کی تعمیر ہو رہی تھی اور ان میں کام کرنے والوں کے علاوہ اور کوئی یہاں آباد نہ تھا۔ ان پروجیکٹس میں کام کرنے والے اعلیٰ عہدیدار روزانہ شہری آبادی سے یہاں آتے جاتے تھے۔ باقی کا تمام عملہ یہاں مقیم ہوتا تھا۔ مگر یہاں دور دور تک لق و دق ریگستان کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

اس جگہ ایک ہوٹل تھا جو کہ سادھو ہوٹل سے مشہور تھا۔ جہاں ہم جیسے دور دراز سے آئے ہوئے کام کرنے والوں کو طعام و قیام کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ زیر تعمیر پروجیکٹس کے مالکان نے کچھ کوارٹرز بھی تعمیر کئے تھے۔ جس میں دوسرے درجے کے افسران کو رہائش وغیرہ کی سہولت حاصل تھیں۔ مگر ہم جیسے نچلے درجے کے کارکنوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ کہ ان میں رہیں کیونکہ ان کا کرایہ وغیرہ کافی تھا۔

سادھو ہوٹل کوارٹروں کے مقابلے میں بہت سستا تھا۔ جہاں قیام و طعام کی سہولت حاصل تھی رہائش کی جگہ ایک بستر، الماری، اور ایک کرسی ہر ضرورت مند کارکن کو دی جاتی تھی صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کا بندوبست تھا۔ جبکہ دیگر اوقات میں چائے یا دوسری چیزوں کے حصول کے لئے نقد ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔

میں سادھو کے قریب جا کر کھڑا ہوا تو اس نے غور سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولا۔ ”تم نئے آنے والوں میں سے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”بنگلہرام سے۔“

”کیا نام ہے؟“

”کاشف۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہاں میرے اس چھوٹے ڈھابے جیسے ہوٹل میں رہنے کی سہولت چاہتے ہو۔“

”جی ہاں۔“

”تمہارے ساتھیوں نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ یہاں کے کیا طور طریقے ہیں۔ اپنا شناختی کارڈ ساتھ لائے ہو۔“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”شناختی کارڈ ہم اس لئے جمع کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ کھاپی کر چپکے سے بھاگ جاتے ہیں مگر ہم بھاگنے والوں کو معاف نہیں کرتے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم دوبارہ پکڑ کر واپس لے آتے ہیں۔ خیر یہ الگ دردسری ہے اس لئے شناختی کارڈ اپنے پاس رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سادھو صاحب مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنا شناختی کارڈ دے دیا۔ سادھو اپنی شخصیت کے اعتبار سے کافی پراسرار تھا خاصا دراز قد، لیکن بے حد بلا پتلا گویا ہڈیوں پر جیسے چمڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ وہ جتنا آسانی اور



روانی کے ساتھ عربی بولتا تھا اتنی ہی روانی کے ساتھ کافی زبانیں بھی بول لیتا تھا۔ اور وہ اس علاقے میں ہوٹل کب سے چلا رہا تھا ابتداء میں مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا لیکن قیاس غالب تھا کہ اس علاقے میں کام شروع ہونے کے بعد ہی وہ ادھر آیا ہوگا۔

”تمہارا سامان کدھر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جدھر کام ہو رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم جب بھی ادھر آؤ اپنا سامان لیتے

آنا۔ تمہیں تمہارا بستر اور دیگر سامان تیار ملے گا۔“

شام کو میں دیگر کارکنوں کے ساتھ سادھو کے ہوٹل میں آیا۔ لکڑی کا ایک تخت لوہے کی ایک پلے والی الماری اور ایک معمولی نوعیت کی کرسی، کرسی اور تخت پر میرے نام کی پرچی لگی ہوئی تھی وہاں کی سب سے اچھی بات جو مجھے فوری طور پر محسوس ہوئی اس کا ٹھنڈا ہونا تھا۔ باہر کی آگ برساتی گرمی کے مقابلے میں یہاں کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔

رات کے وقت کھانا وغیرہ کھا کر میں کچھ کارکن ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آدھی بتیاں گل ہو گئیں تو وارث بولا۔ ”جاؤ اب اپنے بستر پر چلے جاؤ۔“

”اتنی جلدی کیوں؟“

”آدھی بتیاں بجنے کا مطلب ہے سونے کی تیاری کرو۔“

”کوئی ضروری نہیں جب ہمارا دل چاہے گا تو سوئیں گے۔“ میں نے کہا۔

”کاشف ایسی بات نہیں، یہاں سب کچھ اصولوں کے مطابق کرتا ہے۔“ وارث نے ہلکے لہجے میں کہا۔ ”ابھی بلی گشت کرے گی۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”یہ سادھو کی خاص بلی ہے۔ وہ گشت پر آتی ہے اگر کسی کو اس کے بستر پر نہیں دیکھتی تو۔“

”تو کیا کرتی ہے؟“ میں نے مضحکہ خیز لہجے

میں کہا۔ ”میاؤں کر کے دھمکاتی تو نہیں۔“

وارث نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یار اس بارے میں ایسی باتیں نہ کرو۔“

”کیوں وہ بلی ہے یا کوئی بلا۔۔۔۔۔“

”پتہ نہیں وہ کیا بلا ہے۔“ وارث نے کہا۔ ”تم آہستہ آہستہ خود اس کے بارے میں جان جاؤ گے۔“ اور یہ کہنے کے ساتھ ساتھ اس نے چادر تان کر منہ چھپا لیا۔

تھوڑی دیر بعد بلی آئی۔ بستروں کے درمیان سے گزرنے لگی سارے لوگ اپنے اپنے بستروں پر دم سادھے لیٹے رہے۔ میں بھی ان کی تقلید کر رہا تھا مگر ذرا سی چادر سر کا کر بلی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ میرے بستر کے قریب سے گزرنے لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی ہو۔ ”اپنا منہ ڈھانپو اور سونے کی کوشش کرو۔“ یہ میرے کسی ساتھی کی آواز نہ تھی۔ ”تو پھر کیا یہ بلی کی آواز تھی۔“ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بلی ہماری طرح بول بھی سکتی ہے میں نے فوراً اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

بستروں کی دوسری یا تیسری قطار سے ذرا دیر بعد کسی نے سسکاری لیتے ہوئے۔ ”ارے باپ رے۔“ کہا تھا۔ جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ساری بتیاں گل ہو گئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا بلی کا گشت ختم ہو گیا ہے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ جلد ہی میرے ساتھ والے بستر سے خراٹوں کی آوازیں آنے لگی تھیں میری چونکہ یہ پہلی رات تھی اس لئے میں دوسروں کی طرح سونہ سکا۔

دوسرے دن کام کے دوران میں نے ایک ساتھی سے کہا۔ ”یار یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہوٹل میں اتنی جلدی سونے پر کیوں اصرار کیا جاتا ہے۔“

”سادھو کا اصول ہے کہ جلدی سو جاؤ۔ تاکہ صبح جلدی اٹھ سکودیر سے سونے والوں کی صبح سویرے اٹھنے پر نیند پوری نہیں ہوتی اور جب بندے کی نیند پوری نہ ہوگی تو وہ دن بھر دلچسپی سے کام نہیں کر پائے گا۔“ وہ بولا۔



چونکہ میں جلدی سونے کا عادی نہیں تھا اس لئے پہلی دوسری راتوں کو مجھے جھٹ پٹ نیند نہیں آئی تھی میں دم سادھے لیٹا رہا مگر اندھیرا ہونے کے بعد میں اپنے منہ پر سے چادر ہٹا دیتا تھا۔

جانے کتنا وقت گزرا ہوگا۔ اس وقت کیا بجا ہوگا۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا۔ یہ تیسری رات کا واقعہ تھا۔ مجھے یوں لگا کہ اندھیرے میں بھی کوئی گشت کر رہا ہے۔ مگر جب وہ ہمارے بستروں کے رو سے گزرا تو مجھے یوں لگا کہ وہ کوئی بلی نہیں شیر ہے۔ یا ایسی جسامت کا کوئی اور شے، شے میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ انسانوں جیسی دوپیر والی مخلوق محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پتہ نہیں یہ مخلوق بستروں کی کون سی قطار میں تھی۔ کہ مجھے ایک بار اندھیرے میں دوچمکتی ہوئی چیزیں نظر آئی تھیں۔ مگر یہ دودھ بکتے ہوئے انگارے کسی طرح بھی بلی کی آنکھیں نہیں تھیں ڈر کے مارے میں نے اپنا منہ چادر سے ڈھک دیا۔

ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ پہلی رات گزرنے کے بعد دوسری صبح ناشتہ کرتے وقت ایک ساتھی کو میں نے اپنی دائیں پنڈلی کو بار بار سہلاتے ہوئے دیکھا۔ جو سرخ ہو رہی تھی اور لگتا تھا جیسے وہاں کوئی گہری چوٹ لگی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ”بلی۔“ مگر وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ جیسے اس نے مغالطے میں یہ لفظ منہ سے نکال دیا ہو دوسرے ساتھی کھانے میں اسی طرح مشغول ہو گئے۔ جیسے کسی نے کچھ سنا ہی نہیں ہے۔ اسی لمحے بلی سامنے سے آتی ہوئی نمودار ہوئی۔ وہ ایک جگہ آ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہماری نگرانی کر رہی ہو۔ سائٹ پر پہنچ کر میں نے کام کرنے کے دوران ایک آدمی سے پوچھا۔ ”اس کی پنڈلی سے بلی کا کیا تعلق؟“ تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ ”رات تم نے ایک بلکی سی چیخ سنی تھی۔ نا۔“ ارے باپ رے۔“

”ہاں سنی تھی۔“

”وہ غالباً مکمل طور پر بستر پر دراز نہیں ہوا ہوگا۔ لہذا بلی نے اس کے پیر پر پنچہ یا منہ مارا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”مگر یا وہ تو.....“ میں نے کہا۔

”وہ بلی نہیں بلا ہے۔ اپنا کام کرو۔“ کہتے ہوئے وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

چند روز بعد وارث سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ میرے ساتھ ہی کام کرتا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے بستر کے برابر میرا بستر تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ کام کے دوران اس پر اسرار بلی کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کرنا شروع کر دی یہاں کے متعلق اسے بہت سی باتوں کا علم تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”یار وارث اس ہوٹل میں سب لوگ اس بلی سے کیونکہ ڈرتے ہیں؟“

”وہ بلی نہیں بلا ہے۔ بلا۔“ وہ بولا۔

”یہ تو سبھی اس کے بارے میں کہتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنے یا کہنے کی وجہ؟“

”وہ، وہ بہت خطرناک بلی ہے۔ شیر سے بھی زیادہ خطرناک۔“

”آخر اس کی کن باتوں کی وجہ سے اسے ایسا سمجھا جاتا ہے۔“

”اس کی کچھ باتوں کا اندازہ تو تم خود بھی لگا چکے ہو۔ جبکہ اس کی بہت سی باتوں کا علم بہت سے لوگوں کو نہیں ہے۔“ وارث بولا۔

”مثلاً۔“

”مثلاً یہاں سے ایک بار ایک لڑکا بھاگا تھا۔“

”مگر یہاں تو شناختی کارڈ وغیرہ جمع ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایسا عاجز آ گیا تھا۔ یہاں سے کہ اپنے سامان کے بغیر ہی بھاگا تھا اور رات کی تنہائی سنائے اور اندھیرے میں وہ جانے کتنی دور تک بھاگا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ صبح ہوتے ہوتے شہری آبادی تک پہنچ جائے گا۔ مگر۔“



”تو کیا وہ پکڑا گیا۔“

”ہاں۔“

”مگر اس میں بلی کا کیا کردار تھا؟“

”یہ بلی کا تو ہی کارنامہ تھا۔“

”بلی نے اس موقع پر کیا کیا؟“

”رات کو غالباً گشت کے دوران بلی کو معلوم

ہوا کہ ایک بستر خالی ہے۔ بس ذرا دیر بعد اسے پتہ چل گیا کہ وہ یہاں سے فرار ہو گیا ہے۔ بلی اس کے تعاقب میں نکل پڑی اور ذرا دیر بعد ہی اسے جالیا۔ صبح جب ہم لوگ بیدار ہوئے تو نو جوان کو خون میں لت پت ہوٹل کے باہر پایا۔ جس کے پاس بلی بیٹھی گویا پہرہ دے رہی تھی۔ اس کے منہ پر خون کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے۔“

”نو جوان نے بتایا نہیں کہ وہ کیسے گرفتار ہوا۔ اور اس حال کو کیونکر پہنچا۔“

اس وقت تو وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ مگر جب علاج معالجے سے اچھا ہو گیا تو اس نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ ”میں اندھیری رات میں پیچھے دیکھے بنا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ تھوڑی دیر بعد شہری آبادی تک پہنچ جاؤں گا مگر مزید کچھ دور جانے کے بعد میں لڑکھڑا کر بری طرح گر گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے پیچھے سے کسی نے مجھ پر حملہ کیا ہو۔ گرنے کے بعد میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھ پر دوبارہ حملہ ہوا۔ مگر فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کوئی شیر تو نہیں آیا، پھر مجھے احساس ہوا کہ یہاں دور تک جنگل نہیں تو شیر کہاں سے آئے گا۔“

مگر ایک غراہٹ جو بعد میں سنائی دی تھی وہ شیر ہی جیسی تھی اس کے دونوں حملے اتنے شدید تھے کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا پھر آہستہ آہستہ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی جانے کتنی دیر بعد میرے کچھ کچھ حواس بحال ہوئے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے مجھے اپنے منہ میں دبا رکھا ہو اور اسی حالت میں آگے بڑھ رہا ہے۔

## ہزاروں خواہشیں ایسی.....!

خواہش ایک ایسے بے لگام گھوڑے کی طرح ہوتی ہے جو منزل کا تعین کئے بغیر سرپٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ خود رو پودے کی طرح دل میں پیدا ہوتی ہے اور نفس کی آبیاری سے پھل پھول کرتا اور درخت بن جاتی ہے۔ اس کی جڑیں خون میں شامل ہو کر پورے جسم کو جکڑ لیتی ہیں۔ خواہش ایک ایسے ضدی بچے کی طرح ہوتی ہے جو اپنی من مانی کے لئے ہر وقت مچلتا رہتا ہے۔ سیلاب کے اس بھرے ہوئے پانی کی طرح ہے جس کے آگے بند باندھنا ناممکن ہوتا ہے۔

بنیادی خواہشات دو طرح کی ہوتی ہیں، فطری اور نفسانی، فطری خواہشات قدرتی ہوتی ہیں جو فطری تقاضوں کے مطابق اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جاتی ہیں جبکہ نفسانی یا دنیاوی خواہشات نفس کے زیر نگرانی دل میں پلتی ہیں۔ اگر انہیں بے جالا ڈ پیار سے پالا جائے تو یہ بگڑ کر انسان کے اپنے لئے وبال جان بن جاتی ہیں۔

نیک خواہشات، دعا کی شکل میں اپنے پیاروں کو تحفہ پیش کی جاتی ہیں جبکہ بری یا بد خواہشات ہوس بن کر ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ بے جا خواہشات اس اندھے کنویں کی طرح ہوتی ہیں جس میں اگر کوئی انسان گر جائے تو اس کا بچ نکلتا ناممکن ہو جاتا ہے۔

(ایس اتیار احمد - کراچی)



چلانے لگا اور یہ بلی۔ اس بلی کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔  
 ”یعنی یہ جادوئی بلی ہے۔“

”ہاں خیال یہی ہے کہ یہ خاص بلی وہ خاص طور پر اس لئے اپنے ساتھ لایا ہے کہ یہاں کے حالات پر وہ کنٹرول کر سکے۔“ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس بلی اور سادھو کے بارے میں مجھے کچھ نہ کچھ اطلاعات ملتی رہتی تھی۔

کوئی ایک سال بعد میرا مطلب ہے کہ میرے وہاں پہنچنے کے ایک سال بعد ہمارے ریوڑ میں کچھ اور لوگ آئے ریوڑ میں نے اس لئے کہا کہ ہم لوگ یہاں جانور جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ نئے آنے والوں میں ندیم نامی ایک نوجوان تھا۔ وہ کراچی سے آیا تھا اس کے بارے میں ہمیں آہستہ آہستہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بہت پہنچا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ حافظ قرآن اور عالم دین تھا۔ اور پانچ وقت کا نمازی بھی تھا۔

سادھو نے اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔  
 ”مرد دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔  
 دونوں نارمل طریقے سے ملے تھے۔ مگر دونوں کو ایک دوسرے میں غالباً کچھ غیر معمولی باتیں نظر آ رہی تھیں۔ پھر چند دنوں بعد ندیم کو سادھو کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔  
 سادھو کی بلی نے بھی ندیم کو دیکھ کر اپنی بے چینی اور بے قراری کا اظہار کیا تھا۔

ندیم نے آہستہ آہستہ ہم لوگوں سے دوستی بڑھانی شروع کر دی۔ اور یہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے لگا۔ پھر اس نے ہم سے یہ کہنا شروع کیا۔ ”ہم اپنے شہر سے دور بال بچوں کو چھوڑ کر اس لئے نہیں آئے کہ ایسے لوگوں کے جنگل میں آ کر قید ہو جائیں مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں برسوں سے گھر جانے کی اجازت نہیں ملی ہمارے خط جو ہم گھر بھجواتے ہیں وہ سنسر ہونے کے بعد بھجوائے جاتے ہیں ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ یہاں کٹ کٹا کر آدھی رہ جاتی ہے اور سادھو جانے کس کس بہانے

یوں سمجھئے کہ جیسے بلی اپنے منہ میں اپنے بچوں کو دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مجھے کوئی لئے جا رہا تھا۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ سوچ نہ سکا۔ کہ شیر مجھے اپنی کچھارتک لے جا رہا ہے اور وہاں لے جا کر مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا اس تصور کے بعد مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ہوٹل کے سامنے پڑا تھا۔

”یہ منحوس بلی میرے سامنے بیٹھی اپنے منہ پر جمے ہوئے میرے خون کے قطرے چاٹ رہی تھی۔“  
 ”واقعہ سن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔“ واقعی یہ بلی نہیں..... کوئی بلا ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ذرا دیر تک سناٹے میں رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ”وارث یہ سب کیا ہے؟“

”یہ سب سے تمہاری مراد کیا ہے؟“  
 ”یہی کہ بلی۔ سادھو اور ہوٹل..... وغیرہ۔“  
 ”بات دراصل یہ ہے شبیر کہ زیادہ پیسے اور بہتر مستقبل کے خیال سے ہم جیسے مجبور لوگ اس بیابان میں چلے تو آتے ہیں مگر جب یہاں آ کر لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ دولت کی لالچ میں آ کر جہنم کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئے ہیں تو یہاں سے بھاگنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شروع شروع میں یہی ہوتا رہا۔ کہ اکثر آنے والے موقع ملتے ہی نکلتے تھے ان چیزوں کو روکنے کے لئے ان پروجیکٹوں کے مالکوں نے یہ بندوبست کیا۔“

”تمہاری یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی پیارے۔ یہ بندوبست سے تمہاری کیا مراد ہے؟“  
 ”میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔“ وارث نے کہا۔

”یہ سادھو کالے جادو کا ماہر ہے۔ جو اس پروجیکٹ کے ٹھیکیدار ہیں، سادھو سے ملے اور صورت حال کا ذکر کر کے اس پر قابو پانے کا مشورہ طلب کیا۔“  
 جس پر سادھو یہاں آ کر اس ہوٹل کا مالک بن کر حالات کنٹرول کرنے لگا۔ اور اپنے اصولوں پر اسے



اس میں سے اپنا حصہ نکال لیتا ہے ہمیں یہاں سے شہر تک آنے جانے کی بھی سہولت میسر نہیں اس لئے کہ ہم کہیں بھاگ نہ جائیں یا یہاں کے بارے میں باہر والوں کو پتہ نہ چلے۔“

”مگر ان باتوں کا ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔“ ندیم نے کہا۔ ”یہ فائدہ ہوگا کہ ہم میں اپنی آزادی کا جذبہ جاگے گا۔“

”یہاں تو ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی صلب کر دیا گیا ہے۔“

”ہمارے دلوں میں جذبہ کیسے جاگے گا؟“

”سب سے پہلے ہمیں اپنے دلوں سے یہ خیال

نکال دینا ہوگا کہ یہ سب کچھ دائمی ہے۔ ان حالات سے

ہم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”اس سے ہم مایوسی کے آسیب سے نجات

حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور جب مایوسی

کے بادل چھٹ جائیں گے تو ہم اپنی بقاء کی جنگ لڑنے

کے قابل ہو جائیں گے۔“

”اپنی بقاء کی جنگ۔“ وارث نے بڑے عجیب

انداز میں کہا۔

”کیا ہم اپنی بقاء کی جنگ لڑ نہیں سکتے۔“

”مگر..... وہ..... وہ بلی۔“

”سب کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں نے سب

کا علاج تلاش کر لیا ہے۔ بلی کا بھی اس کے مالک کا

بھی۔“ ندیم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ پھر اس نے

ہم سب کو بتانا شروع کیا کہ ”سادھو اور اس کے جادو کا

توڑ اللہ کے کلام پاک میں ہے ہم اللہ کے کلام سے اس

کے جادو کو ذائل اور بے اثر کر دیں گے۔“ اس کے بعد

ندیم نے ہمیں کچھ وظیفے بتائے۔ کچھ دعائیں یاد

کروائیں اور کہا کہ ”روزانہ صبح اور رات میں آیت

الکری پڑھ کر اپنے بدن پر پھونک لیا کرو اور جب وہ

آسیبی بلی آئے تو آیت الکری پڑھ کر اس کے سامنے

پھونک دیا کرو۔“ اس نے چائے پانی اور کھانے کو بھی دم

کر کے کھانے کو کہا۔

جلد ہی ہم سب نے سادھو اور اس کی بلی کو اپنے

سامنے بہت بے بس پایا۔ وہ بلی شیر کی طرح غرائی

اور پھر بے بسی کے عالم میں واپس چلی جاتی۔

سادھو کو اپنے عمل کے زور سے معلوم ہو گیا تھا کہ

ندیم اس کی حکومت کو تباہ کرنے آ گیا ہے لہذا اس نے

موقع ملتے ہی ندیم پر حملہ کر دیا جس سے ندیم کو جانی

نقصان تو نہیں پہنچا پر وہ اپنے ہاتھوں کو لے کر بیٹھ گیا ہم

سب ندیم کو اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے مگر اس نے

مسکرا کر کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم سب اپنے

اپنے ورد اور وظیفے پڑھتے رہو۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں

ہوگا۔ اور ہاں اب تک میں کھل کر جنگ نہیں کر رہا تھا اب

سادھو نے بہل کی ہے تو مجھے جواب تو دینا ہی پڑے گا۔

میرے تکتے کے نیچے ایک تعویذ ہے اسے تم میں سے کوئی

کسی طرح بلی کے گلے یا اس کے پیر میں باندھ دے۔“

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اور اس کے لئے کوئی

تیار نہیں ہو رہا تھا کہ وارث نے کہا۔ ”ندیم بھائی، یہ کام

میں کروں گا۔“

اور سچ مچ وارث نے یہ کام کر دیا۔ بلی آنکھیں

موندے سو رہی تھی کہ وارث نے اس کے پیر میں تعویذ

باندھ دیا ذرا دیر بعد ہی بلی بیدار ہو گئی۔ مگر لمحہ بہ لمحہ اس کی

حالت میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ پہلے وہ بے چینی کے

عالم میں ادھر سے ادھر پھری پھر اسکی غراہٹ بڑھ گئی۔

درمیان میں وہ میاؤں میاؤں بھی کرتی جاتی تھی مگر اس

میاؤں میاؤں میں بڑی بے چینی کی سی کیفیت تھی۔

سادھو گھبرا کر اس کے پاس آیا۔ ”کیا ہو گیا ہے

تم کو، تم کیوں چلا رہی ہو؟“ وہ یہ کہتے ہوئے اس کی

طرف بڑھا کہ بلی نے سادھو پر اچانک چھلانگ لگائی

اور سادھو کے چہرے پر پنجہ مارا اس اچانک افتاد سے

سادھو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھڑام سے نیچے

گر پڑا اور بلی نے جیسے اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

تماشہ دیکھنے والوں کے لئے یہ حیرانی کا سبب تھا

کہ سادھو میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ



اس نے بلی کو دبوچا اور دوڑا چھال کر پھینک دیا۔

اب بلی اچھل اچھل کر سادھو پر حملہ آور ہو رہی تھی جب وہ دوبارہ اچھلی تو ہمیں یوں لگا تھا کہ جیسے کوئی شیر چھلانگ لگا کر حملہ آور ہو رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے سادھو کو لہو لہان کر دیا اس کے چہرے پر ہی نہیں جسم کے مختلف حصوں پر زخم نظر آ رہے تھے۔

اچانک سادھو نے کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔

اس کی آواز تیز سے تیز ہونے لگی۔ وہ کس

زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا ہم میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ غالباً کوئی جادو کے بول تھے۔

ذرا دیر بعد بلی اچھلی اور جب واپس زمین پر آئی تو اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ پھر بلی کے جسم سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلنے لگا اور جب دھواں چھٹنا تو اس کے قریب ہی نہایت بدہیت ایک عورت کھڑی تھی۔ جس نے منمناتی ہوئی آواز میں سادھو سے کہا۔ ”سادھو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں اتنے دنوں تک تمہاری خدمت کرتی رہی اس کا تم نے یہ صلہ دیا۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی تمام تر ہیبت ناک کیوں کے ساتھ سادھو کی طرف بڑھی۔

”رک جا۔۔۔ رک جا۔“ میری بات سن۔“

سادھو چیخا۔

”سننے کا موقع تم نے خود کھو دیا ہے سادھو۔ میرا پورا وجود تمہارے جادو کے زور سے آگ کی طرح دہک رہا ہے۔“

سادھو نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنے بچاؤ کے لئے اور کچھ پڑھنے لگا اس سے بلی کا آسیب اور مشتعل ہو گیا اور اس نے سادھو کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ سادھو کے عمل نے اس ہیبت ناک عورت کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو غالباً روک دیا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس عورت کے جسم سے دو ہاتھ مزید نمودار ہوئے اور پھر ان ہاتھ کی تعداد میں منٹوں کے وقفے میں

اضافہ ہو گیا پھر اس نے آگے بڑھ کر سادھو کو دبوچ لیا، عجیب منظر تھا اس عورت کے دونوں ہاتھ سادھو کا گلہ دہا رہے تھے اور اس کے کچھ ہاتھ سادھو کے جسم کے دوسرے حصوں کو توڑ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سادھو بے حس و حرکت ہو کر ڈھیر ہو گیا اب اس بدروح نے مڑ کر ہم سب کی طرف دیکھا ہم سب کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا کہ یہ شاید ہم پر حملہ آور ہوگی۔ مگر اس نے منمناتی ہوئی آواز میں ہمیں مخاطب کیا۔

”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں دوستو! میں تم سب کی احسان مند ہوں کہ تم لوگوں کی کوشش سے میں اس بد بخت سادھو کی قید سے رہائی حاصل کر سکی۔ اس نے بلی کے اندر مجھے طویل عرصے سے قید کر رکھا تھا۔“ ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا ندیم کی ہدایت کے مطابق ہم سب ورد کر رہے تھے۔

بدروح نے سادھو کا بے حس و حرکت جسم اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور چند لمحوں میں ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

ہم سب نے خوشی کا نعرہ لگایا اور ندیم کی طرف پلٹے میرے علاوہ باقی سب کو اس بات کا دکھ تھا کہ اس جنگ کے چکر میں ندیم اپنے دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گیا تھا۔ مگر ہم ندیم کے پاس گئے تو یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ندیم کے دونوں ہاتھ پہلے کی طرح بالکل صحت مند تھے۔ ہم سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دی کہ اللہ نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ ندیم نے کہا۔

”دوستو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے نیک نیتی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ بڑی طاقت کو بھی اپنے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں، ہمیشہ اللہ پر توکل کرو، کیونکہ ”بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“







## کالا عمل

ملک فہیم ارشاد- ڈجکٹ فیصل آباد

چند الفاظ زبان سے نکلے ہی تھے کہ ایک ڈرائونہ وجود کمرے میں ظاہر ہو گیا اس کی انگارہ برساتی آنکھیں دہشت زدہ تھیں اور جب اس کی کھرکھراتی ہوئی ڈرائونی آواز نکلی تو کمرے میں موجود سارے لوگ دھل کر رہ گئے۔

انچارج تھیں میڈم شگفتہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”کب چھوٹے تم جیل سے؟“ میڈم شگفتہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”جی ابھی رہا ہوا ہوں اور سیدھا یہی آیا ہوں۔“ حامد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں نے تمہیں کرسی پر بیٹھنے کے لئے نہیں کہا“..... میڈم شگفتہ نے غصے سے کہا۔

**حامد** ٹیکسی سے نیچے اتر اور اس نے ٹیکسی

کا کرایہ ادا کیا اور پیچھے کو مڑا، اس کے سامنے یتیم خانہ کی بلڈنگ موجود تھی، وہ سینٹرل جیل سے سیدھا اسی طرف آیا تھا، وہ یتیم خانے میں اپنی بچپن کی محبت یعنی اور اپنے رقیب شہروز سے ملنے آیا تھا۔

یتیم خانے میں داخل ہونے کے بعد وہ میڈم شگفتہ کے دفتر کی طرف بڑھا میڈم شگفتہ یتیم خانے کی



”اس کا مطلب آپ اب بھی مجھے قصور وار سمجھتی ہیں۔“ حامد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔  
”تم قصور وار نہیں بلکہ قاتل ہو۔“ آخری الفاظ پر میڈم شگفتہ جیسے چیخیں۔

”نہیں ہوں میں قاتل میڈم شگفتہ۔“ جواباً حامد بھی چیخا۔ ”نہیں ہوں میں قاتل۔“  
”اپنی آنکھوں سے میں نے تمہیں دیکھا ہے کلثوم کا قتل کرتے ہوئے۔“ میڈم شگفتہ نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔  
”کیا دیکھا تھا آپ نے اس روز؟“ حامد نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا میری بہن کلثوم فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی اور جس خنجر سے اس کی موت ہوئی تھی وہ تمہارے ہاتھوں میں تھا اور وہ بھی خون سے لت پت۔“ میڈم شگفتہ نے عملی لہجے میں کہا۔  
”آپ نے خنجر کا وار کرتے ہوئے مجھے دیکھا تھا؟“ حامد نے میڈم شگفتہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”خون سے رنگا خنجر تمہارے ہاتھ میں تھا، سامنے میری بہن کلثوم مردہ پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا ظاہر ہے وہ قتل تم ہی نے کیا تھا۔“ میڈم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔  
”لیکن آپ نے مجھے میڈم کلثوم پر وار کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا، میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر حامد کچھ دیر کے لئے رکا شاید وہ اپنے ذہن میں بیٹے خیالات کے تانے بانے سلجھانے لگا تھا۔  
پھر وہ گویا ہوا۔ ”میڈم وہ قتل میں نے نہیں بلکہ شہروز نے کیا تھا۔“ حامد نے کہا۔

”کک..... کیا؟“ میڈم شگفتہ چلائیں۔ ”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم، وہ تو اس روز کمرے میں ہی نہیں تھا..... بلکہ وہ۔“ میڈم شگفتہ کہتے کہتے رکیں۔

”میڈم میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا

ہوں۔“ دراصل شہروز کا لا عمل کرتا تھا۔“ حامد نے کہا تو میڈم شگفتہ حیرت سے بولیں۔

”کا لا عمل..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں میڈم، آپ کو یاد ہوگا جب عینی نے اس کا کھلونا چرایا تھا تو اس نے عینی کو خوب مارا تھا اور آپ نے اتنی بے دردی سے عینی کو مارنے پر شہروز کو سزا دی تھی..... دی تھی ناں۔“ حامد نے کہتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”بالکل دی تھی۔“ میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”اور دوسرے دن سچ کے وقت عینی کو چاول کھاتے وقت خون کی الٹیاں آئی تھیں، تو میں نے دیکھا شہروز اس وقت عینی کو غصے سے گھور رہا تھا اور منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا،“ حامد نے بتایا۔

”یہ تو اس کے خلاف کوئی خاص ثبوت نہ ہوا.....“ میڈم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”آپ کو وہ بلی تو یاد ہوگی جو آپ کے کمرے میں مری پڑی تھی..... یاد ہے ناں آپ کو؟“ حامد نے کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر تصدیق چاہی۔

”ہاں مجھے یاد ہے.....“ میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اس کا خاتمہ بھی شہروز نے ہی کیا تھا کیونکہ وہ بھی ایک دن پہلے اس کے پیروں پر سے گزر گئی تھی اور بلی کا بچہ اس کے پیر کی چھوٹی انگلی پر لگ گیا تھا اسی وجہ سے اس نے بلی کا خاتمہ کیا تھا..... اور آپ کو شہروز کے بیڈ کے نیچے وہ خوف ناک کھوپڑی کا نشان تو یاد ہوگا۔؟“ حامد نے پوچھا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے.....“

”یعنی شہروز کے بیڈ کے نیچے بندھی پڑی ملی تھی..... یعنی ایک دن اور ایک رات غائب رہی تھی ہم نے پورا یتیم خانہ چھان مارا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں مل رہی تھی ہم پولیس اسٹیشن خبر کرنے جا ہی رہے تھے کہ اکبر چوکیدار نے ہمیں آکر بتایا کہ ”اس نے کل رات کے وقت عینی اور شہروز کو اکٹھے دیکھا تھا۔“

”ہم نے شہروز سے پوچھا تو اس نے صاف



لا علمی کا اظہار کیا لیکن پھر میری بہن کلثوم کی نظر شہروز کے بیڈ کے نیچے پڑی..... ”وہ کیا ہے بیڈ کے نیچے؟“ اچانک کلثوم چلائی سب اس طرف متوجہ ہوئے سب کو شہروز کے بیڈ کے نیچے کسی چیز کی حرکت دکھائی دی اکبر نے جھک کر دیکھا تو وہاں عینی بندھی تھی، اکبر نے اسے باہر نکالا تو عینی کے منہ پر بھی لال پٹی بندھی ہوئی تھی، اکبر نے وہ پٹی ہٹائی تو عینی نے روتے ہوئے کہا..... ”مم..... مم..... مجھے..... مجھے شہروز نے باندھ کر اس بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔“

شہروز خونخوار نظروں سے عینی کو گھور رہا تھا۔ ”اوئے..... یہ کیا ہے.....؟“ اکبر نے جھک کر شہروز کے بیڈ کے نیچے جھانکا۔

”کیا ہے بیڈ کے نیچے؟“ کلثوم نے حیرانگی سے پوچھا لیکن اکبر حیرت سے بیڈ کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ ”بولتے کیوں نہیں اکبر۔“ میں نے آگے بڑھ کر اکبر سے پوچھا۔

”آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔“ اتنا کہہ کر اکبر اٹھا اور اس نے بیڈ اس جگہ سے کھسکا دیا سب حیرت سے بیڈ کے نیچے فرش کی طرف دیکھنے لگے فرش پر لال رنگ کے بڑے سے دائرے میں لال رنگ سے ایک کھوپڑی اور اس کے نیچے کر اس کی شکل میں ہڈیوں کا نشان بنا ہوا تھا۔ ”یہ..... یہ..... کیا ہے؟“ کلثوم نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”پپ..... پپ..... نہیں.....“ اکبر نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

”کیا ہے یہ؟“ میں نے اپنے قریب کھڑے شہروز کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”میں..... نہیں جانتا میڈم.....“ وہ غصے سے بولا۔ ”تو اور کون جانتا ہے..... تمہارے بیڈ کے نیچے ہی تو یہ نشان بنا ہے..... اور تم نے عینی کو باندھ کر بیڈ کے نیچے کیوں چھپایا تھا۔“ میں نے ایک پھنر شہروز کے گال پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تو ہے میں نہیں جانتا.....“ شہروز

نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس عینی کی بچی کو تو میں مار ڈالوں گا۔“ وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

”شگفتہ..... یہ..... یہ تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے..... اس کا کچھ کرنا پڑے گا..... ورنہ..... یہ باقی بچوں کو بھی نقصان پہنچائے گا۔“ کلثوم نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا شہروز اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

”ایسے..... ایسے نشان میں نے فلموں میں دیکھے ہیں..... ایسے نشان کا لاکمیل کرنے والے لوگ استعمال کرتے ہیں۔“

”کلثوم رات بہت ہو چکی ہے اس کا فیصلہ ہم کر دیں گے کل..... آج کی رات یہ تمہارے کمرے میں سوئے گا۔“ میں نے کہا تو کلثوم گھبرا گئی۔

”نا بابا نا..... میں تو کبھی بھی اسے کمرے میں نہ رکھوں۔“ کلثوم نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”فکر نہ کرو کچھ نہیں کرے گا۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا..... اس نے ہی عینی کو باندھ کر دو دن سے بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔“

”نا بابا نا..... اسے تو آپ پولیس کے حوالے کریں۔“ کلثوم بدستور گھبراتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے پھر..... اسے میں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں.....“ میں نے کہا تو کلثوم نے اطمینان کی گہری سانس کھینچی۔

رات کا نچانے وہ کون سا پہر تھا۔ ”جب اچانک میری آنکھ کھلی میری نظر اس صوفے کی طرف گئی جس پر شہروز لیٹا ہوا تھا مگر اب وہ صوفہ خالی تھا.....“ ارے..... یہ شہروز کہاں چلا گیا۔“ میں پریشانی سے بڑبڑائی اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کھڑکی پر زور زور سے ہاتھ مار رہا ہو کھڑکی پر پردہ لٹکا ہوا تھا کھڑکی کے شیشوں پر کوئی بہت زوردار انداز میں دستک دے رہا تھا میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو میری زوردار چیخ نکل گئی۔ ”یہاں تک کہہ کر میڈم شگفتہ خاموش ہو گئیں۔“

”آپ کیوں چیخیں تھیں میڈم.....؟“ حامد نے



حیرانگی سے پوچھا۔

”ایک جلا ہوا ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر دستک دے رہا تھا لیکن وہ صرف جلا ہوا ہاتھ ہی تھا چلتے ہوئے ہاتھ کے وجود کا مالک شخص کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر وہ ہاتھ یکدم غائب ہو گیا، میں ہاتھ کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھی تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔۔۔۔۔“ اتنا کہہ کر میڈم ایک مرتبہ پھر رکیں۔

”کیا منظر دیکھا آپ نے میڈم۔۔۔۔۔؟“ حامد نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا شہروز یتیم خانے کے پچھواڑے بنے احاطے میں بھاگ رہا تھا۔

”شہروز۔۔۔۔۔“ میں نے اسے آواز دی تو وہ رکا، اس نے میری طرف دیکھا، وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔۔۔۔۔“ یہ۔۔۔۔۔ یہ تمہارے ہاتھ کیوں خون سے رنگے ہوئے ہیں؟“ میں نے ہکلاتے ہوئے اس سے پوچھا لیکن وہ جواب دینے کی بجائے احاطے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکل گیا، میں تیزی سے واپس مڑی اور اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اسی وقت مجھے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی کیونکہ وہ چیخ کی آواز کسی اور کی نہیں بلکہ کلثوم کی تھی، میری آنکھوں کے سامنے شہروز کے خون سے رنگے ہاتھ بار بار آ رہے تھے، میں کلثوم کے کمرے کی طرف تیزی سے بھاگی میں نے دروازہ کھولا تو دھک سے رہ گئی میری بہن کلثوم فرش پر مردہ حالت میں پڑی تڑپ رہی تھی اور خون سے رنگا خنجر تمہارے ہاتھوں میں تھا۔“ اتنا کہہ کر میڈم شگفتہ خاموش ہو گئیں ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”دیکھا تھا آپ نے۔۔۔۔۔ شہروز کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے اور وہ پچھلی دیوار پھلانگ کر باہر نکل گیا تھا۔۔۔۔۔ میں سو رہا تھا کہ کسی قسم کے شور کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی مجھے حیرت ہوئی میں اٹھ کر بیٹھا، اسی وقت مجھے ایک تھپڑ کی گونج سنائی دی میں

حیران ہوا کیونکہ تھپڑ کی وہ آواز میڈم کلثوم کے کمرے سے آئی تھی، میں تیزی سے میڈم کلثوم کے کمرے کی طرف بھاگا دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے سنا میڈم کلثوم کہہ رہی تھیں۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ مجھے دھمکیاں دیتے ہو۔“

”میڈم میں کالے عمل میں ماہر ہوں۔۔۔۔۔ اور اس راز سے تم آگاہ ہو چکی ہو اس لئے تمہیں مرنا ہوگا۔“ مجھے شہروز کی غصے میں بھری آواز سنائی دی ساتھ ہی میڈم کلثوم کی چیخ کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا شہروز میڈم کلثوم کے پیٹ میں خنجر گھونپ چکا تھا، میں ہکا بکا وہ خونی منظر دیکھنے لگا، شہروز نے میری طرف دیکھا تو میں خوف کے باعث تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں فرش پر تڑپتی ہوئی میڈم کلثوم کی طرف بڑھا، میں نے ان کے پیٹ سے خنجر نکالا تو ان کے منہ سے ایک مرتبہ پھر چیخ نکلی میں حیرانگی سے فرش پر مردہ میڈم کلثوم کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت آپ کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے میڈم کلثوم کا قاتل سمجھ بیٹھیں، میں لاکھ چلایا چیخا لیکن آپ نے میری ایک نہ سنی اور مجبوراً مجھے جیل میں جانا پڑا میں دنیا کے سامنے تو گناہ گار رہی لیکن۔۔۔۔۔ لیکن آپ کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کرنے آیا ہوں۔“ آخری الفاظ پر حامد کی آواز بھرا گئی۔ ”اور یہ صرف اس لئے کہ آپ نے مجھے ایک ماں جیسا پیار دیا تھا۔“

اتنا کہہ کر حامد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میڈم شگفتہ کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے۔ ”مجھے معاف کر دو میرے بچے۔“ میڈم شگفتہ روتے ہوئے شرمسار لہجے میں بولیں۔ ”میری وجہ سے تمہیں اتنی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو میرے بچے۔“

”آپ نے مجھے بے گناہ سمجھا میرے لئے یہی بہت ہے۔“ حامد نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”آپ مجھے صرف یمنی کا پتہ بتادیں۔“



”یعنی..... اسے تو ایک فیملی نے ایڈوپ کر لیا تھا.....“ میڈم شگفتہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میڈم آپ مجھے یعنی کو ایڈوپ کرنے والی فیملی کا ایڈریس دے دیں۔“

”وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا حامد۔“ میڈم شگفتہ نے کہا۔ ”کیونکہ میں تو وہاں کئی مرتبہ جا چکی ہوں۔“

”پھر بھی آپ ایڈریس تو دیں۔“ حامد نے کہا تو میڈم نے اسے ایڈریس دے دیا۔

وہ یتیم خانے سے باہر آیا اور ایک طرف بنے فٹ پاتھ پر چلنے لگا اس کا ذہن کئی طرح کے سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔ ”شہروز ایسے عجیب و غریب کھیل کیوں کھیلتا تھا وہ یعنی کی چھوٹی سی غلطی سے اس کا دشمن کیوں بن گیا تھا، اس نے میڈم کلثوم کا قتل کیوں کیا تھا؟ اس نے یعنی کو باندھ کر اپنے بیڈ کے نیچے کیوں چھپایا تھا؟ کیا وہ نشان جو شہروز کے بیڈ کے نیچے تھا وہ واقعی کالے نسل کا تھا، شہروز کہاں غائب ہو گیا؟ یعنی کو ایڈوپ کرنے والی فیملی کون تھی؟“ وغیرہ وغیرہ۔

سڑک پر چلتی ایک سفید رنگ کی وین اچانک اس کی طرف مڑی اور اس کے قریب آ کر آہستہ آہستہ رفتار میں چلنے لگی، حامد چلتے چلتے چوکتے ہوئے رکا اور وین کی طرف مڑا وین بھی اب رک چکی تھی، وین کا پچھلا دروازہ کھلا اور حامد کو ایک نقاب پوش نظر آیا۔

”کیسے ہو حامد.....؟ وہ نقاب ہوش بولا۔

”ٹھٹھ..... ٹھیک ہوں، پپ..... پر تم کون ہو؟“ حامد نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”وین میں بیٹھو پھر بتاتا ہوں۔“ نقاب پوش کے ہاتھ میں اب ریوالور نظر آ رہا تھا۔ ”کم از کم تم یعنی کے لئے تو ضرور بیٹھو گے۔“

یعنی کے ذکر پر حامد چونکا اور حامد بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ وین میں بیٹھ گیا تو حامد نے دیکھا وین کی پچھلی سیٹوں پر دو نقاب پوش بیٹھے ہوئے تھے اور انکی

سیٹ پر ایک ڈرائیور اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی تھی جو نقاب کا کام دے رہی تھی۔

”کہاں ہے یعنی؟“ حامد نے پوچھا۔

”صبر کرو..... اتنے بے چین کیوں ہوئے جارہے ہو۔“ اتنا کہہ کر ریوالور والے نقاب پوش نے دوسرے نقاب پوش کو اشارہ کیا، اس نے اپنی جیب سے ایک کالے رنگ کا رومال نکالا اور حامد کے چہرے پر ڈال دیا، اب حامد کی آنکھوں کے آگے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، تھوڑی دیر بعد وین رکنے کی آواز سنائی دی پھر دودھ ہارن کی آواز حامد کے کانوں میں بڑی اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی اور وین رک گئی پھر وین کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

”اتر و نیچے.....“ حامد کے کانوں میں ریوالور والے نقاب پوش کی آواز پڑی ساتھ ہی اس نقاب پوش نے حامد کا بازو پکڑ لیا تھا، حامد لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وین سے نیچے اتر اور پھر نقاب پوش کی رہنمائی میں آگے چلنے لگا، ایک جگہ سے روکا گیا اور پھر بیٹھنے کو کہا گیا، بیٹھنے کے بعد اس کے چہرے سے رومال ہٹا لیا گیا، اندھیرا چھٹنے کے بعد اس کی آنکھوں کے آگے تیز روشنی آئی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں، تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ معمول پر تھا اس کے سامنے وہی دو نقاب پوش کھڑے تھے۔ ”کک..... کہاں ہے یعنی؟“ حامد نے پوچھا۔

”وہ ہمارے قبضے میں ہے۔“ ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

”قبضے میں۔“ حامد حیران ہوا۔

”ہاں..... قبضے میں.....“ نقاب پوش نے یہ کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن کیوں.....؟“ حامد چیخا۔

”دنیا میں ہر چیز کسی مقصد کی وجہ سے ہی ہوتی ہے..... یعنی بھی کسی وجہ سے ہی ہمارے قبضے میں ہے۔“ نقاب پوش بولا۔



”کس مقصد کی وجہ سے؟“ حامد نے غصے سے پوچھا۔

”اگر تم چاہتے ہو کہ عینی تمہیں صحیح سلامت مل جائے تو تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا۔“ ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

”کام..... کیسا کام.....؟“ حامد نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بڑا آسان سا کام ہے۔“ نقاب پوش نے کہا۔ ”کام کیا ہے.....؟“ حامد نے سخت لہجے میں لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تمہیں تقریباً ایک ماہ تک ایک فیملی میں رہنا ہوگا۔“ ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

”کسی فیملی میں ایک ماہ کے لئے مجھے کیوں رہنا پڑے گا؟“ حامد نے پوچھا۔

”عینی کی سلامتی کے لئے کیونکہ اگر تم نے ہمارا حکم نہ مانا تو عینی کی بے آبرو لاش تمہیں مل جائے گی۔“ نقاب پوش سخت لہجے میں بولا۔

”نہیں، نہیں تم جو کہو گے وہ میں کروں گا.....“

”بولو کیا کرنا ہے مجھے۔“ حامد نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں ایک فیملی میں رہنا ہوگا اور میں جو حکم دوں گا تمہیں وہ کرنا ہوگا۔“ ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

”لیکن..... لیکن پہلے میری عینی سے بات کراؤ۔“ حامد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ اتنا کہہ کر نقاب پوش نے جیب سے موبائل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد موبائل کان سے لگالیا۔ ”ہیلو بات کراؤ اس سے۔“ نقاب پوش نے کہا اور موبائل حامد کے کان سے لگا دیا۔

”ہیلو۔“ حامد بولا۔

”ہیلو۔“ ایک خوبصورت سریلی آواز نے حامد کے کانوں میں رس گھولا۔

”عینی میں حامد بول رہا ہوں۔“ حامد نے بتایا۔

”حامد..... حامد مجھے ان کے چنگل سے بچالو۔“ عینی کی پریشان زدہ آواز حامد کے کانوں میں پڑی۔

”عینی جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے تو تم رورہی تھی..... میں نے تمہیں ہنسانے کے لئے کیا کیا تھا؟“

حامد نے بظاہر تصدیق چاہی کہ بولنے والی عینی ہی ہے۔

”حامد مجھے ان کے چنگل سے بچالو..... میں کئی سالوں سے ان کی قید میں ہوں۔“ عینی کی بھرائی ہوئی آواز حامد کے کانوں میں جڑی۔

”عینی میں نے جو پہلے پوچھا پہلے اس کا جواب دو۔“ حامد نے سخت لہجے میں لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”تم جان بوجھ کر پھسلتے تھے اور تمہارے پیر پر سچ مچ چوٹ لگ جاتی تھی۔“ عینی نے بتایا۔

”اوہ..... عینی میری جان کیسی ہو تم.....“ حامد نے اطمینان کی ایک گہری سانس کھینچی۔

”میں ٹھیک نہیں ہوں حامد..... پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر رکھا ہے..... مم..... مم..... مجھے ان سے بچالو۔“ عینی نے روتے ہوئے کہا۔

”تم فکر مت کرو عینی..... میں اب جیل سے باہر آ گیا ہوں..... میں تمہیں ان کے.....“ ابھی حامد نے اتنا ہی کہا تھا کہ ریوالور والے نقاب پوش نے موبائل اس کے کان سے ہٹالیا۔ ”اتنی بات ہی بہت ہے..... اور میں تمہاری غلط فہمی دور کردوں یہ فلمی ڈائلاگ فلموں تک ہی محدود رکھو کہ میں تمہیں ان کے چنگل سے بچالوں..... ہم عینی کو چھوڑیں گے اور وہ بھی تب جب تم ہمارا کام پورا کرو گے۔“

”ٹھیک ہے میں تمہارا کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ حامد نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے..... کچھ دنوں کی ٹریننگ کے بعد ہم تمہیں اس فیملی میں بھیج دیں گے اور کسی بھی قسم کی ہوشیاری نہیں کرنا..... اور یہ بات شاید تم بھی جانتے ہو گے کہ میں کالے علم میں ماہر ہوں.....“ ریوالور والا



نقاب پوش شاید اس دفعہ مسکرایا بھی تھا۔  
 ”کک..... کک..... کون ہو تم.....؟“ حامد  
 نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔  
 ”شش..... شہروز.....“ ریوالور والے نقاب  
 پوش نے کہا۔

☆.....☆.....☆

گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رکی  
 ، گاڑی میں اس وقت ڈرائیونگ سیٹ پر حامد بیٹھا ہوا تھا  
 اس وقت اس کے چہرے پر سیٹھ اصغر کے بیٹے نعمان کا  
 میک اپ موجود تھا حامد کو اس بنگلے میں نعمان بن  
 کر جانا تھا وہ شہروز کے معیار پر پورا اترتا تھا اور نعمان کی  
 ہر عادت سیکھ چکا تھا نعمان کا ایک بھائی کاشف اور ایک  
 بہن شائستہ تھی، نعمان کی ماں کا نام شائلہ تھا اصغر کی ایک  
 کار ایکسیڈنٹ میں دونوں آنکھیں اس کا ساتھ  
 چھوڑ گئیں، ایک بوڑھا ملازم تھا کرم دین جو بہت پرانا  
 تھا حامد نے گاڑی گیٹ کے پاس لے جا کر ہارن  
 دیا تو گیٹ کھل گیا حامد گاڑی اندر لے گیا اس نے گاڑی  
 گیراج میں کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا بنگلے  
 میں بنے احاطے میں ہری ہری گھاس کا قالین بچھا  
 ہوا تھا اور کیار یوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے  
 تھے حامد اندرونی حصے کی طرف بڑھا، اندر ہال میں  
 پڑے صوفوں پر شائستہ ایک کتاب پڑھنے میں محو تھی  
 شائستہ تصویریں کھینچنے کی بہت عادی تھی۔ ”نعمان بھائی  
 .....“ شائستہ کے پکارنے پر حامد رکا۔ ”پلیز ذرا  
 مسکرائیں۔“ شائستہ نے کہا تو حامد مسکرایا اور شائستہ نے  
 اپنے موبائل میں اس کی تصویر اتار لی۔

حامد کچن کی طرف بڑھا اس نے دیکھا شائلہ  
 کھانا پکانے میں مگن تھی۔  
 ”ہائے ممما.....“ حامد نے نعمان کے انداز میں  
 کہا۔

شائلہ نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”نعمان بیٹا..... میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا  
 ہے کہ جب گھر میں داخل ہوتے ہیں یا کسی سے ملتے

ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں نا کہ ہائے..... لیکن تمہارے  
 منہ سے یہ ہائے ہیلو کا پہاڑ ختم ہی نہیں ہوتا۔“ شائلہ  
 نے دوپٹے سے اپنے بھیکے ہاتھ صاف کرتے ہوئے  
 کہا۔

”کم آن ممما..... جدید دور ہے اور آپ ہیں کہ  
 یہ پرانی باتیں لے کر بیٹھی ہیں۔“ حامد نے نعمان کی  
 طرح اکیٹنگ کرتے ہوئے کہا نعمان اور اس کی ماں کی  
 ہر وقت یہی بحث چھڑی رہتی تھی۔

”یہ پرانی باتیں نہیں بیٹا ہماری دینی باتیں ہیں ہمارا  
 اوڑھنا بچھونا ہیں اور دین کبھی پرانا نہیں ہوتا..... ہائے  
 ، ہیلو یہ انگریزوں کا مذہب ہے۔ اسی طرح جب تم کسی  
 سچے مسلمان کو ہیلو کہو گے تو وہ تمہیں اچھی نگاہ سے نہیں  
 دیکھے گا..... مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو السلام علیکم  
 کہتا ہے یعنی تم پر سلامتی ہو اسی طرح جواباً دوسرا بھائی  
 اسے وعلیکم السلام کہے گا یعنی تم پر بھی سلامتی ہو۔“

شائلہ نے اس گھر کو شروع سے کچھ اصولوں  
 پر رکھا ہوا تھا جن اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا  
 کہ تین وقت کا کھانا وہ اکٹھے کھاتے تھے، شائلہ نماز کے  
 معاملے میں سختی سے پابند تھی لیکن وہ اپنی اولاد کو صرف  
 سمجھاتی رہتی تھی لیکن وہ تینوں ایک کان سے سن  
 کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد حامد آفس چلا آیا خاکی  
 رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ اس کے پاس تھا دفتر میں پہنچنے  
 کے بعد وہ کرسی پر بیٹھا تو اس کے موبائل کی رنگ ٹون  
 جاگ اٹھی اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور  
 Answer کا بٹن پریس کر کے موبائل کان سے  
 لگا لیا۔ ”ہیلو“ دوسری طرف سے شہروز کی آواز اس کے  
 کانوں میں پڑی۔ ”ہاں بولو“ حامد ناگواری سے بولا۔

”وہ لفافہ تو تمہیں مل چکا ہوتا۔“ شہروز نے  
 بظاہر پوچھا۔ ”ہاں..... مل چکا ہے۔“ حامد نے سنجیدہ  
 لہجے میں کہا۔

”کھولو اسے۔“ شہروز نے کہا تو حامد نے اس  
 لفافے کو کھولا اس میں ایک چھوٹی خوبصورت لڑکی کی



تصویر تھی۔

”کیا ہے لفافے میں؟“

”تم جانتے ہو.....“ حامد نے منہ بناتے ہوئے

کہا۔ ”جانتا ہوں میں لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ شہروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایک لڑکی کی تصویر ہے۔“ حامد نے بتایا۔

”اس تصویر کو الٹو۔“ شہروز نے کہا حامد نے تصویر کو پلٹا تصویر کی کچھلی سائیڈ پر ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ ”یہ لڑکی اس ایڈریس کے ہوٹل میں رہتی ہے اور اس کا نام ماریہ ہے یہ نعمان کی خفیہ گرل فرینڈ ہے۔“ شہروز کی بات ابھی جاری تھی کہ حامد نے اسے ٹوکا۔ ”خفیہ گرل فرینڈ..... کیا مطلب؟“

”خفیہ اس لئے کہ سوائے نعمان کے کوئی بھی نہیں جانتا کہ یہ نعمان کی گرل فرینڈ ہے اس کا نام ماریہ ہے..... دونوں رنگ رلیاں بھی مناتے ہیں ماریہ چاہتی ہے کہ دونوں کی جلد سے جلد شادی ہو جائے لیکن نعمان ابھی اسے ٹالتا رہتا ہے اب آفس ٹائم کے بعد تم اس کے پاس جاؤ گے اور تمہیں وہاں کیا کرنا ہے وہ میں تمہیں گاڑی میں بتا دوں گا۔“ اتنا کہہ کر شہروز نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا حامد نے گہری سانس لیتے ہوئے موبائل جیب میں ڈال دیا۔

☆.....☆.....☆

اصغر کی موت کی وجہ ڈاکٹروں کی پہنچ سے باہر تھی پوسٹ مارٹم کرانا شاملہ نے بہتر نہ سمجھا کیونکہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ نجانے کیسے اصغر کے پورے جسم پر سوراخ بن گئے تھے جن سے خون نکلتا تھا اور شاید یہی وجہ اصغر کی موت کی تھی..... اسی وجہ سے شاملہ نے اصغر کی چیر پھاڑ کرانا مناسب نہ سمجھی کیونکہ اصغر بہت بھیا تک موت مرا تھا۔

ایک عورت کے پوچھنے پر شاملہ نے بتایا کہ ”میں کمرے میں اصغر کے لئے دودھ لے کر گئی تھی کمرے کا نظارہ دیکھ کر دودھ کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اصغر وہیل چیئر سے گرے پڑے تھے، میں

تیزی سے ان کی طرف بھاگی۔“ کک..... کیا ہوا اصغر..... آپ وہیل چیئر سے کیسے گر پڑے۔“ میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”شم..... شاما..... نلہ..... مم..... میرے پورے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے..... ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے جسم میں سوئیاں چھو رہا ہے۔“ اصغر نے درد کے باعث ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ساری بات بتائی، میں نے دیکھا ان کی ساری قمیض خون سے بھری پڑی تھی، پھر ان کے چہرے سے وقفے وقفے سے خون نکلنے لگا، میں جلدی سے ٹیلی فون کی طرف بھاگی اور ڈاکٹر کو انقارم کیا اس کے بعد میں نے شائستہ کو آواز دی میں نے اسے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

وہ تیزی سے نعمان اور کاشف کے کمروں کی طرف بھاگی ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اصغر دم توڑ چکے تھے۔“ اتنا کہہ کر شاملہ نے رونا شروع کر دیا باقی عورتیں اسے دلا سہ دینے لگیں کاشف اور شائستہ کی آنکھیں بھی نعم آلودہ تھیں جبکہ حامد عرف نعمان پریشانی کے باعث اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

اسی وقت بیرونی دروازے سے انسپکٹر جمشید اور دو کانسیبل اندر داخل ہوئے جسے دیکھ کر حامد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا وہاں بیٹھے سارے افراد حیرت سے انسپکٹر جمشید اور دونوں کانسیبلز کی طرف دیکھنے لگے، حامد اپنی جگہ سے اٹھا اور انسپکٹر کے قریب آیا۔ ”جی انسپکٹر صاحب.....“ حامد نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔ ”میں اصغر صاحب کے بیٹے کاشف کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید نے بظاہر دھماکہ کیا۔

”کیا مطلب.....؟“ حیرت کے باعث حامد کے منہ سے نکلا۔ ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں مسٹر نعمان..... مسٹر کاشف کے نام کا اریسٹ وارنٹ نکلا ہے۔“ انسپکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن کیوں انسپکٹر صاحب۔ میں نے ایسا کیا



کر دیا کہ میرے نام کا اریسٹ وارنٹ نکل آیا۔“  
کاشف ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔  
”آپ نے اپنے کالج کی ایک لڑکی فائزہ کی  
عزت لوٹی ہے۔“ انسپکٹر نے اصل دھماکہ اس دفعہ کیا۔  
”ہائے اللہ.....“ وہاں بیٹھی سب عورتوں کے  
منہ سے بے اختیار نکلا۔

”عزت یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ انسپکٹر صاحب  
.....م.....م.....میں نے۔“ گھبراہٹ کے باعث  
کاشف کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”وہ لڑکی ابھی بھی اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے تم نے اس کی عزت پامال کرنے کے بعد اس پر تشدد کر کے اسے مارنے کی کوشش کی لیکن“ جسے اللہ رکھے اسے کون چھلے۔“ انسپکٹر جمشید نے عزم سے کہا۔

انس..... پکٹر..... صاحب..... آپ  
کو ضرور غلط نہیں ہوئے..... مم..... مم..... میں ان کی ماں  
ہوں۔ میں اپنی..... اپنی اولاد کو اچھی طرح جانتی  
ہوں..... میرا بیٹا ایسا گھناؤنا کام نہیں کر سکتا۔“ شائلہ  
نے اسپکٹر جمشید کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”ماں جی قانون دل کی گواہی نہیں مانتا کاشف کے خلاف پختہ ثبوت ملے ہیں اور آپریشن تھیر میں جانے سے پہلے فائزہ نے کاشف کا نام لیا تھا۔“ اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنے پیچھے کھڑے کانسیبلوں کو اشارہ کیا، انہوں نے آگے بڑھ کر کاشف کو تھکڑی لگا دی۔

”انسپکٹر صاحب پلیز آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے..... میرے بیٹے کو چھوڑ دیں.....“ شاملہ انسپکٹر التجائیہ انداز میں بولی۔

”ہم بڑے سے بڑا وکیل کریں گے۔“ حامد نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا حق بنتا ہے نعمان صاحب.....“ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کاشف کو لے کر باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

بھیا کیا بنا کیس کا..... شائستہ نے دودھ کا گلاس

7 November 2015



”آج بازار سے گزر رہا تھا تو تمہارے لئے خرید لیا، اسے اپنے کمرے میں جا کر کھولنا۔ تمہارے لئے اسپیشل گفٹ ہے۔“ حامد نے مسکراتے ہوئے کہا تو شائستہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسی وقت حامد کے موبائل کی رنگ نون جاگ اٹھی، حامد نے Answer کا بٹن پریس کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو..... حامد.....“ شہروز کی مسکراتی ہوئی آواز حامد کے کانوں میں پڑی۔ ”دیکھو میں نے اب تمہارا آخری کام بھی کر دیا..... اب تو عینی کو چھوڑ دو.....“ حامد کا لہجہ التجائیہ تھا۔

”چھوڑ دیں گے تم فکریوں کرتے ہو اگر تم نے ہمارا کام کیا ہے تو ہم بھی تمہارا کام ضرور کریں گے۔“ اتنا کہہ کر دوسری طرف سے شہروز نے کال کاٹ دی اور حامد پریشان نگاہوں سے موبائل کی طرف دیکھنے لگا۔

شائستہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور خاکی لفافہ بیڈ پر رکھنے کے بعد کمپیوٹر ٹرالی کے پاس پڑی چیز پر بیٹھ گئی اس نے موبائل کیبل کے ذریعے کمپیوٹر سے کنکٹ کیا اور موبائل میں موجود تصویریں کمپیوٹر میں Paste کرنے لگی اس کا دل کاشف کی تصویریں دیکھنے کو کر رہا تھا اور ویسے بھی تصویریں کھینچنا تو شائستہ کی ہابی تھی تصویریں پیسٹ کرنے کے بعد انہیں چیک کرنے لگی تصویریں شیک کرتے ہوئے اسے بار بار حیرت کے شدید جھٹکے لگ رہے تھے جیسے جیسے وہ تصویریں دیکھتی جا رہی تھی اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ جلدی سے جیئر سے اٹھی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی وقت نجانے کہاں سے تیز ہوا کا جھونکا آیا اور بیڈ پر پڑا خاکی رنگ کا لفافہ اڑ کر شائستہ کے پیروں میں جا کر گر گیا بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی شائستہ حامد کا دیا ہوا خاکی رنگ کا لفافہ اپنے پیروں میں گرتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی اس نے جھک کر وہ لفافہ اٹھایا اور لفافے کو کھولا تو شائستہ نے دیکھا لفافے میں ایک

کاغذ تھا شائستہ نے اس کاغذ کو باہر نکالا تو اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا اس کاغذ پر لال رنگ سے ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور کھوپڑی کے نیچے کراس کی شکل میں دو ہڈیاں بنی ہوئی تھیں۔“ ہیں..... یہ کیسا گفٹ ہے.....“ شائستہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

اسی وقت شائستہ کو ناک میں خارش سی محسوس ہوئی اس نے ناک کھجائی شائستہ کی نظر ناک کھجانے والی انگلیوں پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ انگلیاں خون سے رنگین ہو گئی تھیں، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے آئی اس کی ناک کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔

شائستہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ٹشو کے ڈبے میں سے ایک ٹشو نکالا اور ناک سے بہنے والا خون صاف کرنے لگی لیکن خون رکنے کی بجائے مزید بہتا جا رہا تھا شائستہ ایک کے بعد ایک ٹشو سے خون صاف کر رہی تھی لیکن خون تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا سردرد کی وجہ سے پھٹ رہا تھا شائستہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گیں۔

☆.....☆.....☆

کہتے ہیں جب تیز سیلاب آتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے ایسا ہی کچھ شائستہ کے ساتھ ہوا تھا چند منٹوں کے سیلاب نے اس کی ساری زندگی اجاڑ دی تھی وہ چند لمحوں میں اکیلی پڑ گئی تھی۔ بیٹا تھا لیکن وہ بھی عجیب بھنور تھا..... وہ تھا بھی کہ نہیں..... یہ وہ نہیں جانتی تھی..... زندگی کبھی کبھی انسان کو اچھی نہیں لگتی یہی حال اب شائستہ کا تھا..... لیکن وہ ایک مسلمان تھی اور وہ یہ بخوبی جانتی تھی کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے..... اس نے ابھی تک سلاخوں کے پیچھے بند اس لڑکے کو جو خود کو نعمان کہہ رہا تھا کہ متعلق کوئی بھی عملی کام نہیں کیا تھا وہ اندر سے ٹوٹ چکی تھی وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی وہ اس وقت ہاں میں بیٹھی ہاں کے درود یوار کو دیکھ رہی تھی جو اسے کھوکھلی لگ رہی تھی، وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی اور دروازے سے فوٹو البم نکال کر چہروں کو دیکھنے لگی



شاملہ کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کا سیلاب  
اُمڈ آیا۔

کافی دیر وہ آنسو بہاتی رہی اسے کوئی بھی چپ کرانے والا وہاں موجود نہیں تھا کافی دیر رونے کے بعد اس نے اپنے آنسو خود ہی صاف کئے فوٹو البم دوبارہ دراز میں رکھا اور شائستہ کے کمرے میں چلی آئی یہ کمرہ بھی اب ویران سا ہو گیا تھا وہ بیڈ کے پاس آئی اور حیرت زدہ نگاہوں سے بیڈ کو دیکھنے لگی اسے یوں محسوس ہوا جیسے شائستہ بیڈ پر لیٹی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو وہ بیڈ پر بیٹھی اور ایک مرتبہ پھر آنسو بہانے لگی..... آنسو ہی اب اس کا مقدر تھا کافی دیر بعد آنسوؤں کا طوفان تھا تو وہ اٹھ کر کمپیوٹر ٹرالی کے پاس پڑی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

شاملہ کو بھی تصویریں کھینچنے کا بہت شوق تھا اس نے کمپیوٹر آن کیا اور شائستہ کے فولڈر میں پڑیں تصویریں دیکھنے لگی تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تقریباً پچھلے ایک ماہ سے کھینچی گئیں نعمان کی تصویریں حیران کن تھیں تصویروں میں موجود باقی افراد تو اپنی بالکل اصلی حالت میں موجود تھے لیکن جن تصویروں میں نعمان تھا لیکن اس کی جگہ تصویروں میں ایک بندر نما شکل کا انسان کھڑا تھا۔

”یہ..... یہ..... کیا..... ان تصویروں میں  
تو نعمان تھا.....؟“ شاملہ الجھن آمیز لہجے میں بولی ایک  
تصویر میں شاملہ کچن میں کھڑی نعمان سے بحث کر رہی  
تھی لیکن اس تصویر میں بھی نعمان کی بجائے بندر کی شکل  
کا انسان کھڑا تھا۔ ”یہ..... یہ..... کیا چکر ہے۔ ان  
تصویروں میں تو نعمان تھا..... یہ بندر کی شکل کا انسان  
کہاں سے آ گیا؟ شاملہ پریشانی سے بڑائی۔

وہ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی  
تو وہ ٹھٹھک کر رکی اس کے پاؤں میں ایک کاغذ پڑا  
ہوا تھا شامکہ نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا کاغذ پر کھوپڑی  
اور نیچے کر اس کی شکل میں بڑیاں بنی ہوئی تھیں شامکہ کے  
دماغ کو ایک زوردار جھٹکا لگا شامکہ نے آیت الکرسی

پڑھنی شروع کر دی اچانک شاملہ کے ہاتھ میں پکڑے  
کاغذ میں آگ بھڑک اٹھی شاملہ نے چیختے ہوئے وہ  
کاغذ چھوڑ دیا فرش پر گرتے گرتے وہ کاغذ پورا جل چکا  
تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فرش پر اس کاغذ کی راکھ  
کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆ ..... ☆ ..... ☆

”یہ تو واقعی بڑی عجیب و غریب بات ہے مگر  
 اصغر.....“ اسپیکر جمشید نے شاملہ کی لائی ہوئی تصویروں  
 کو دیکھتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں انسپکٹر صاحب میں خود حیران و پریشان ہوں یہ جو تصویریں آپ کے ہاتھوں میں ہیں تقریباً ایک ماہ پہلے کی ہیں اور سب تصویروں میں نعمان کی بجائے یہ بندر نما شکل کا انسان ہے، میں نے نعمان کی ایک ماہ پہلے کھینچی گئیں تصویریں بھی دیکھیں ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور جیل میں بند نعمان کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور یہ جو تصویر ہے جس میں کچن میں اس بندر کی شکل کے انسان کے ساتھ کھڑی ہوں یہ نعمان ہی ہے اور یہ تصویر ایک ماہ پہلے کھینچی گئی ہے اور پھر میں نعمان کے کمرے میں گئی تو مجھے یہ چیزیں ملیں۔“ اتنا کہہ کر شاملہ نے چند خاکی لفافے اور ایک کھلونا انسپکٹر کی میز پر رکھ دیا کھلونا وہی تھا جس میں سوئیاں چھوٹی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر جمشید حیرت سے ان چیزوں کو دیکھنے لگا اس نے خاکی لفافوں سے کھوڑی والے وہ کاغذ نکالے انہیں دیکھنے کے بعد انسپکٹر جمشید اس کھلونے کی طرف دیکھنے لگا۔ ”یہ کیا ہے سزا صفر.....“ انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک ماہ پہلے جو نعمان کی شکل میں لڑکا ہمارے گھر آیا تھا اس کے پاس میں نے ایسے کئی لٹائے دیکھے تھے اور یہ جو کھلوتا ہے اس کھلونے کے ذریعے میرے شوہر کو مارا گیا ہے۔“ شائلہ نے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ.....“ انسپکٹر ہنسا.....  
 ”کھلونے کے ذریعے بھلا کوئی کسی کو کیسے مار سکتا ہے۔“  
 ”آپ نے دیکھا ہے ناں..... یہ کھلونا بظاہر یہ



ظاہر کر رہا ہے کہ ایک آدمی وئیل چیئر پر بیٹھا ہے یعنی اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہیں۔۔۔ ایسا ہی ہے۔ انسپکٹر صاحب ”شائلہ نے کہتے ہوئے بظاہر تصدیق چاہی۔“  
”جج۔۔۔ جی۔۔۔ ہاں۔“ انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میرے مرحوم شوہر کی بھی ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں اور وہ ہر وقت وئیل چیئر پر ہی ہوتے تھے اور جس دن ان کی موت ہوئی میں کمرے میں ان کے لئے دودھ لے کر گئی تھی، میں نے دیکھا وہ وئیل چیئر سے نیچے گرے پڑے تھے اور ان کی قمیض لہولہان تھی میں تیزی سے ان کی طرف بڑھی انہوں نے مجھے بتایا کہ ”مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے بدن میں سونیاں چھو رہا ہے۔“ پھر ان کے چہرے سے بھی خون نکلنے لگا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب وہ جو کوئی بھی تھا شیطانی عمل میں مہارت رکھتا تھا۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کالے عمل کے ماہر لوگ جب کسی کا پراسرار خاتمہ کرتے ہیں تو کپڑے کے ایک پتلے میں سونیاں چھونے لگتے ہیں اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ سلاخوں کے پیچھے میرا اصل بیٹا نعمان ہی ہے۔“ اتنا کہہ کر شائلہ خاموش ہو گئی اور شائلہ کے تبصرے پر انسپکٹر جمشید داد بھری نظروں سے شائلہ کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں بھی آپ کی بات سے ایگری ہوں ہوں مسز اصغر۔ یہ دیکھئے۔“ اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی سامنے پڑی ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں سے ایک خاکی لفافے اور سفید رنگ کا لفافہ نکال کر شائلہ کے آگے رکھ دیا، شائلہ نے حیرت سے وہ لفافہ اٹھایا۔

”یہ خاکی لفافہ ہمیں ماریہ کے روم سے ملا ہے اور یہ سفید رنگ کا کاغذ جس پر کھوپڑی اور ہڈیاں بنی ہوئی ہیں یہ ہمیں حوالات سے ملا ہے اور ایک قیدی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ کاغذ اسی ہم شکل نعمان نے کاشف کو دیا تھا، کاشف حوالات کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر اس کاغذ کو دیکھنے لگا پھر وہ زوردار انداز میں چیخنے لگا اس کی

آنکھوں اور ناک کے نتھنوں سے خون بہنے لگا۔ قیدی حیرت زدہ انداز میں اس کی طرف بڑھے اسپتال لے کر گئے تو کاشف زندگی کی قید سے آزاد تھا۔“ یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گیا۔

”پتہ نہیں ہم نے اس کا کیا باگاڑا ہے جو اس نے ہمارے ساتھ ایسا کیا۔“ شائلہ ممکن لہجے میں بولی۔

”اب وہ زیادہ دن ہماری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔“ انسپکٹر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ”سلاخوں کے پیچھے موجود مسز اصغر واقعی آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں اپنے کچھ خدشات دور کر چکا ہوں۔“

”خدشات۔۔۔ کیسے خدشات انسپکٹر صاحب؟“ شائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”جس ہوٹل میں نعمان ماریہ سے ملنے جاتا تھا اس ہوٹل کے CCTV کیمرے کی فوٹیج مجھے مل گئی ہیں، ہوٹل کا منیجر خود لے کر آیا تھا وہ خاصا پریشان تھا۔“ انسپکٹر صاحب CCTV کیمرے کی فوٹیج

آچکیں ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اتنا کہہ کر ہوٹل کا منیجر رکا۔ ”لیکن کیا۔۔۔“ میں نے متوجہ ہو کر پوچھا۔

”لیکن ایک پریشانی والی بات ہے۔“ ہوٹل منیجر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”پریشانی والی بات۔“ میں نے حیرت سے ہوٹل منیجر کی بات دہرائی۔ ”کیسی پریشانی والی بات۔“

”آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔“ اتنا کہہ کر منیجر نے سفید رنگ کا بڑا سا لفافہ میرے سامنے رکھ دیا، میں نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں تین تصویریں تھیں جس میں ہوٹل منیجر کے سامنے ایک بندر کی شکل کا انسان کھڑا تھا۔ ”یہ آپ کے سامنے کون کھڑا ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ تصویر تو مسٹر نعمان کی ہونی چاہئے مگر۔۔۔ حیرت ہے۔“ ہوٹل منیجر الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

”مسٹر نعمان کی۔۔۔ میں حیرت کے باعث ہنسا۔“ یہ تو کہیں سے بھی مسٹر نعمان نہیں لگ رہے۔“

”لگ تو نہیں رہے۔۔۔ لیکن انسپکٹر صاحب یہ



تصویر مسٹر نعمان کی ہے۔“ ہوٹل منیجر نے پختہ لہجے میں کہا۔  
”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ منیجر صاحب۔ آپ  
کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میری طبیعت بالکل ٹھیک انسپکٹر صاحب اس  
دن نعمان صاحب نے یہی کپڑے پہنے تھے لیکن اب  
تصویروں میں۔“ ہوٹل منیجر نے کہتے ہوئے بات  
ادھوری چھوڑی میرے کانوں میں اب نعمان صاحب  
کی باتیں گونجنے لگیں جب میں انہیں گرفتار کرنے  
آیا تھا..... ”انسپکٹر صاحب میں تو پچھلے ایک ماہ سے کسی  
جگہ پر قید تھا..... جو یہاں موجود تھا وہ کوئی میرا بمشکل  
ہوگا، میں تو پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور کہیں  
نعمان صاحب سچ تو نہیں کہہ رہے تھے.....“ میں نے  
سوچا۔ ہو سکتا ہے وہ نعمان صاحب کا کوئی بمشکل  
ہو جس نے یہ سازش کی ہو..... لیکن تصویروں میں یہ  
بندر کی شکل کا انسان..... کوئی بھی بات میرے حلق سے  
نیچے نہیں اتر رہی تھی میں اٹھ کر نعمان صاحب کے پاس  
آیا اور انہیں یہ تصویریں دکھائیں وہ بھی یہ تصویریں دیکھ  
کر حیران ہوئے اور پوچھا ”یہ کون ہے؟“ میں نے  
انہیں ساری بات بتائی تو وہ بھی حیران ہوئے۔

پھر مجھے یقین دلانا شروع کر دیا کہ میں تو پچھلے  
ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور اب آپ کی لائی ہوئی  
تصویروں نے یہ تصدیق کر دی ہے کہ وہ واقعی نعمان  
صاحب نہیں تھے لیکن یہ تصویریں انجمن میں ڈال رہی  
ہیں مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی شیطانی عمل ہوگا۔“ اتنا کہہ  
کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گیا۔

”شیطانی عمل۔“ حیرت کے باعث شاملہ کے  
منہ سے نکلا۔

”جی ہاں مسز اصغر..... مجھے شاہ صاحب سے  
ملنا پڑے گا۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”شاہ صاحب.....؟“ شاملہ نے حیرت سے

لفظ دہرایا۔

”جی ہاں..... شاہ صاحب..... بہت نیک

اور عبادت گزار بزرگ ہیں وہ ضرور ہمیں کوئی نیک  
مشورہ دیں گے..... آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ نعمان  
صاحب کو بھی ساتھ ہی لے لیتے ہیں فی الحال تو ان کے  
خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا تو  
شاملہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆.....☆.....☆

میں اسے ہر حال میں پانا چاہتی ہوں..... اس  
نے میری راتوں کی نیندیں اور دن کا چین چھین لیا ہے  
جہاں دیکھتی ہوں وہی نظر آتا ہے..... میں نے اسے  
پہلی مرتبہ ہوٹل روزینہ میں دیکھا تھا وہاں ویٹر تھا.....  
وہ ایک ہی نظر میں میری نظروں کے ذریعے میرے دل  
میں سما گیا میں روزانہ اسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاتی  
ایک دن وہ ہوٹل میں موجود نہیں تھا میں نے دوسرے  
ویٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ آج بیمار ہے، میں  
نے ویٹر سے اس کا ایڈریس لیا اور اس کے گھر پہنچ گئی۔

لیکن اس کے گھر جانا میرے لئے کسی دھماکے  
سے کم نہیں تھا..... ”وہ..... وہ شادی شدہ تھا۔“ اتنا کہہ  
کر وہ لڑکی رکی وہ ایک آفس نمائندہ تھا جس میں ایک  
خوبصورت لڑکا کرسی پر بیٹھا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس لڑکے  
کی آنکھوں پر بلیک گلاسز تھے لڑکے کے سامنے ایک  
بڑی سی میز پڑی ہوئی تھی ٹیبل کے پاس پڑی کرسیوں  
میں سے ایک پر فریادی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر  
تقریباً سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔

کمرے کی دیوار کے ساتھ دو کرسیوں پر ایک  
2 4 - 2 3 سال کی لڑکی اور دوسری کرسی  
پر 40-45 سال کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا.....  
شادی شدہ بلیک گلاسز والا وہ لڑکا ہنس..... ”ہاں شادی  
شدہ.....“ میز کے سامنے بیٹھی اس لڑکی نے افسردہ لہجے  
میں کہا۔ ”وہ شادی شدہ ہے تو کیا ہوا..... میں پھر بھی  
اس سے محبت کرتی ہوں اور اسے ہر قیمت پر حاصل  
کرنا چاہتی ہوں۔“

”ایک شادی شدہ مرد کو تم حاصل کرنا چاہتی  
ہو..... یہ تو پاگل پن ہے..... تم کسی اور لڑکے سے محبت



کر سکتی ہو۔۔۔ اس دنیا میں بے شمار خوبصورت مرد ہیں۔“ بلیک گلاسز والے لڑکے نے بظاہر مشورہ دیا۔

”میں صرف اسی لڑکے کو حاصل کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور میں اسی لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔۔۔۔۔ مجھے میری یہ فرینڈ تمہارے پاس لے کر آئی ہے۔“ اس لڑکی نے دیوار کے پاس پڑی کرسیوں پر بیٹھی لڑکی طرف اشارہ کیا۔

”کام تو میرے لئے یہ مشکل نہیں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے اس کام کے پانچ لاکھ روپے لگیں گے۔“ بلیک گلاسز والے لڑکے نے اپنی رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کام کی قیمت بتائی۔

”مجھے منظور ہے میں سیٹھ امجد کی بیٹی ہوں پانچ لاکھ تو میرے لئے معمولی رقم ہے۔“ وہ لڑکی فخریہ لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ بلیک گلاسز والے لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تم دونوں باہر جاؤ۔“

دیوار کے پاس پڑی کرسیوں پر بیٹھی لڑکی اور ادھیڑ عمر آدمی چپ چاپ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے لڑکے نے اپنی گلاسز اتار کر سامنے پڑی میز پر رکھے۔ ”اب تم میری بات غور سے سنو میں تمہاری کمر پر ایک منتر لکھوں گا۔۔۔۔۔ تم روزانہ اس لڑکے سے ملنا وہ تمہارا عاشق ہو جائے گا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔“ لڑکے نے غور سے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کی آنکھوں کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ ”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مجھے منظور ہے۔“ لڑکی نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے اب تم اپنی قمیض اتار دو۔“ لڑکے نے کہا تو لڑکی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اس نے اپنی قمیض اتار دی لڑکے کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی وہ اٹھ کر لڑکی کے سامنے پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا لڑکی نے منہ دوسری طرف کیا اب لڑکی کی کمر لڑکے کی طرف تھی اب لڑکا لڑکی کی کمر پر اپنی انگلی سے کچھ لکھنے لگا۔

اچانک دوسرے کمرے میں شور کی آواز سنائی دی لڑکے نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اسی وقت شائلہ نعمان اور انسپکٹر اندر داخل ہوئے ان کے ساتھ وہ لڑکی اور ادھیڑ عمر آدمی ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھے اور چار پانچ کا نشیبل بھی تھے۔

وہ لڑکا اور لڑکی گھبراتے ہوئے اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے، لڑکی اپنی بانہوں سے اپنا ننگا بدن چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی، انسپکٹر نے ایک زوردار پھینک لڑکے کے چہرے پر دے مارا۔

”انسپکٹر۔“ وہ لڑکا چیخا۔۔۔۔۔ تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔“ انسپکٹر نے جواب دینے کی بجائے اس پر پھپھروں کی مزید بارش کر دی وہ لڑکا مار کھاتے کھاتے زمین پر جا گرا تو انسپکٹر نے اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔

وہ لڑکی اب اپنی قمیض پہن چکی تھی اور اب سب کی طرف شرمسار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”حرام زادے لوگوں پر کالا عمل کرتا ہے تو۔۔۔۔۔ کالا جادو کرتا ہے تو۔۔۔۔۔ شریف لوگوں کے گھر تباہ کرتا ہے تو۔۔۔۔۔ تیرا تو میں مار مار کر کچھ مر نکال دوں گا۔“ انسپکٹر بولنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا۔

اس لڑکی کو آفس سے باہر لے جایا جا چکا تھا جبکہ دوسری لڑکی اور وہ ادھیڑ عمر آدمی ہتھکڑیاں پہنے بے بسی کے عالم میں اس لڑکے کو انسپکٹر جمشید سے مار کھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”انسپکٹر صاحب آپ پیچھے ہٹ جائیں مجھے اس سے چند باتیں کرنی ہیں۔“ جب انسپکٹر کسی بھی طرح باز نہ آیا تو شائلہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا انسپکٹر کا ارادہ شاید اس لڑکے کو جان سے مارنے کا تھا۔

انسپکٹر نے پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی کئی ٹھڈے اس لڑکے کو دے مارے اس لڑکے کی حالت کافی بری تھی اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور چہرہ بھی کئی جگہ سے لہو لہان ہو چکا تھا وہ لڑکا کراستے ہوئے فرش پر اٹھ کر بیٹھا۔

شائلہ اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے



بولی۔ ”بولو تم نے ایسا کیوں کیا..... کیوں میرا ہنستا بستا گھرا جاڑ دیا..... کیوں میرے شوہر، میرے بیٹے اور بیٹی کو مجھ سے چھین لیا..... بولو کیوں ایسا کیا تم نے..... آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔“

شائلہ کا لہجہ غمگین تھا.....

”وہ..... وہ..... میں نے نہیں بلکہ..... بلکہ مجھ سے کروایا گیا.....“ اس لڑکے نے اپنے ہونٹوں سے نکلنے والے خون کو اپنی قمیض کی آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو جھوٹ مت بولو..... ہم تمہاری حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں..... شاہ صاحب نے ہمیں تمہارے متعلق کافی کچھ بتا دیا ہے..... تم ہی اس سارے کھیل کے مالک ہو اور تمہارا نام حامد ہے۔“ شائلہ نے عجیب بات کہی۔ ”تم جان بوجھ کر اپنا موبائل بھی میرے گھر چھوڑ آئے تھے جس میں تم نے اپنی کالیں ریکارڈ کی تھیں اور کوئی شہر و نامی لڑکا تمہیں یہ سب کچھ کرنے کو کہتا تھا..... لیکن وہ بھی تمہارے اس کھیل کا حصہ تھا تا کہ تم جب کل پکڑے جاؤ تو سب سے یہی کہو گے کہ تم تو بالکل بے قصور ہو..... اور تم سے یہ سب کچھ کروایا گیا ہے۔

لیکن شاہ صاحب نے ہمیں بتا دیا ہے کہ یہ سب کچھ تم ہی نے کیا ہے اور یہ عینی جس نے اغوا ہونے کا ڈرامہ رچایا تھا وہ بھی اور ہمارا یہ ملازم کرم دین بھی تمہارے ہی ساتھی ہیں۔“ شائلہ نے ہتھکڑیاں پہنے اس لڑکی اور ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کرم دین ہی شہروز بن کر تم سے موبائل پر بات کرتا تھا اور یہی اکبر کے بھیس میں یتیم خانے کا چوکیدار تھا..... لیکن..... لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا.....؟“

تمہارے اس کہنے اور لنگڑے شوہر اصغر کی وجہ سے.....“ حامد چیخا۔

”اصغر کی وجہ سے.....“ شائلہ حیران ہوئی۔

”اس نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا تھا؟“

”اس نے.....“ حامد نے جبرے پھینچتے ہوئے..... اس نے ہماری ہنستی بستی دنیا اجاڑ کر رکھ دی۔“

”کیا کیا، انہوں نے.....“ شائلہ نے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

”پوچھو میرے باپ سے۔“ حامد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کک..... کون ہے تمہارا باپ؟“

شائلہ نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ ہے میرا باپ.....“ حامد نے ہتھکڑیاں پہنے اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ..... یہ تمہارا باپ ہے۔“

شائلہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں میں ہی ہوں اس کا بد نصیب باپ ساجد.....“

ہم نے تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا..... تمہارے شوہر نے ہی ہماری دنیا اجاڑ دی اور ہم نے بھی تمہاری دنیا اجاڑ دی

حساب برابر۔“ اس مرتبہ حامد کا باپ ساجد بولا۔

”کیا کیا تھا اصغر نے.....؟“ شائلہ اس مرتبہ چیخی۔

”میری بیوی اور حامد کی ماں کی عزت لوٹی تھی اس کہنے شخص نے۔“ اس مرتبہ ساجد چیخا۔

”کک..... کیا.....؟“ اس مرتبہ ساجد اور نعمان چلائے۔

”ہاں..... اس کہنے نے ہماری ہنستی بستی زندگی کو جہنم سے بدتر بنا دیا..... ہم ایک تھیز چلاتے تھے جس میں طنز و مزاح کے ڈرامے ہوا کرتے تھے ایک رات

تمہارا شرابی شوہر اصغر اس تھیز میں آیا اور میری بیوی پر فقرے کسنے لگا تھیز کی سیکورٹی کی سختی پر یہ اس کے ساتھی

اس وقت تو باہر چلے گئے مگر ڈرامہ ختم ہونے پر یہ میری بیوی کو خیمے سے اٹھا کر لے گئے اور اس کی عزت کی

دھجیاں اڑا دیں باقی لڑکیوں نے ہمیں آکر بتایا کہ تین چار لڑکے میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

ہم حامد کی ماں ثانیہ کی تلاش میں نکلے تو ثانیہ

ایک جگہ ہمیں زخمی حالت میں ملی وہ بے آبرو ہو چکی تھی،

اس نے ہمیں اصغر اور اس کے ساتھیوں کے متعلق

بتایا، اس سے پہلے کہ میں ثانیہ کو اسپتال لے کر جاتا وہ

ہم حامد کی ماں ثانیہ کی تلاش میں نکلے تو ثانیہ

ایک جگہ ہمیں زخمی حالت میں ملی وہ بے آبرو ہو چکی تھی،

اس نے ہمیں اصغر اور اس کے ساتھیوں کے متعلق

بتایا، اس سے پہلے کہ میں ثانیہ کو اسپتال لے کر جاتا وہ

ہم حامد کی ماں ثانیہ کی تلاش میں نکلے تو ثانیہ

ایک جگہ ہمیں زخمی حالت میں ملی وہ بے آبرو ہو چکی تھی،



راستے میں ہی دم توڑ گئی۔

میں نے اور حامد نے قسم کھائی کہ ہم ثانیہ کے قاتلوں کو بھیا نک موت دیں گے، ابھی ہم وہیں بیٹھے ثانیہ کی لاش پر آنسو بہا رہے تھے کہ وہاں ایک شخص آیا جو ہمارے لئے مہربان ثابت ہوا اس نے ہم سے کہا کہ ”اگر تم اپنی بیوی کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں میری پیروی کرنا ہوگی۔“

”تم کون ہو.....؟“ میں نے اس شخص سے پوچھا۔  
”میں تمہارا مہربان ہوں اگر تم چاہتے ہو کہ وہ قاتل بھیا نک موت مرے اور ان کے خاندانوں کو بھی بھیا نک موت ملے تو تمہیں میرا راستہ چننا پڑے گا۔“  
اس خوف ناک شکل کے مالک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیسا ہے تمہارا راستہ اور تم اصل میں کون ہو؟“  
میں نے پوچھا۔ ”میں..... میں شیطان ہوں۔“ اس شخص نے حیران کن بات کہی۔ ”میرا راستہ بدی کا راستہ ہے تمہیں کالا جادو سیکھنا پڑے گا۔“

کالا جادو کا سن کر میں حیران ہوا لیکن جب ہم نے اس شخص کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیا تو ہمارے لئے آسانیاں ہی آسانیاں پیدا ہو گئیں میں نے اصغر کے تینوں ساتھیوں کو بھیا نک موت دی اور جس دن اصغر کا ایکسیڈنٹ ہوا..... ”تمہیں یاد ہوگا تمہارا بیٹا بھی اس میں تھا..... یاد ہے ناں۔“ اتنا کہہ کر ساجد رکا۔  
”ش..... شہروز.....“ شامکھ کے منہ سے نکلا۔

”میں اس دن ڈرائیور کے دماغ پر حاوی ہو گیا تھا میں نے اس سے کہا کہ وہ کار سامنے والی چٹان میں دے مارے اور ڈرائیور نے میرا حکم مانا اور کار سامنے والی چٹان میں دے ماری، کار چٹان سے ٹکرانے سے پہلے شہروز دور جھاڑیوں میں جا گرا، کار چٹان سے ٹکراتے ہی اصغر مرا تو نہیں ہاں البتہ وہ اپنی دونوں ٹانگیں کھو بیٹھا۔

مجھے اپنے کالے عمل کے ذریعے پتہ چلا کہ شہروز یتیم خانے میں ہے میں نے وہاں کے ملازم کو گٹری رقم دے کر فارغ کروایا اور خود وہاں ملازمت پر لگ گیا پھر میں ایک دن منصوبہ کے تحت حامد اور عینی کو یتیم خانے

میں لے آیا اور میڈم شگفتہ سے کہا کہ مجھے سڑک پر یہ دو یتیم بچے ملے ہیں میں انہیں یہاں لے آیا۔

عینی بھی ایک یتیم تھی اور وہ سچ میں ثانیہ کو یتیمی کی حالت میں ملی تھی وہ بھی بعد میں ہمارے ڈراموں کا حصہ بنی اب حامد شہروز کے پیچھے پڑ گیا، اسے وہ بھی اپنی ماں کا قاتل لگتا تھا وہ یتیم خانے میں شہروز کو سب کی نظروں میں برا ثابت کرنے لگا عینی نے پہلی مرتبہ حامد کے کہنے پر شہروز کا کھلونا چرایا۔

عینی کو جو خون کی الٹیاں آئیں تھیں وہ بھی حامد کے کالے عمل کا کمال تھا اور وہ جو میڈم شگفتہ کے کمرے میں مردہ بلی ملی تھی اس کا خاتمہ بھی حامد نے ہی کیا تھا پھر حامد نے ہی شہروز کے بیڈ کے نیچے کالے عمل کا نشان بنایا اور پھر عینی کو باندھ کر اس بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور میں نے ہی میڈم شگفتہ کو بتایا کہ میں نے عینی اور شہروز کو اکٹھے دیکھا تھا اور خود ہی شہروز کے بیڈ کے نیچے سے عینی کو دریافت کیا اور سب کے سامنے کالے علم کا نشان واضح کیا یعنی سب کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ شہروز کالا علم کرتا ہے۔

شہروز اب سمجھ چکا تھا کہ یہ سب کچھ حامد اس کے خلاف کر رہا ہے اور وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حامد اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے جب میڈم شگفتہ سو گئی تو وہ میڈم شگفتہ کے کمرے سے باہر آیا تو اس نے دیکھا حامد میڈم کلثوم کے کمرے کی طرف جا رہا تھا حامد میڈم کلثوم کو شہروز بن کر مزید ڈرانا چاہتا تھا شہروز چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا حامد نے اپنے کالے علم کے بل بوتے پر میڈم کلثوم کے کمرے کی کنڈی اندر سے گرائی کنڈی کی آواز سن کر میڈم کلثوم جاگ تو گئیں مگر ڈر کی وجہ سے اپنے بستر سے نہ اٹھیں حامد میڈم کلثوم کے کمرے میں داخل ہوا تو شہروز نے اسے آواز دی اور پوچھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے آخر اس نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔

حامد نے اسے ساری حقیقت سے آگاہ کیا کہ ہم اس کے ساتھ اس کے باپ کی وجہ سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں ہم اسے اور اس کی فیملی کو ختم کر دیں گے



پھونک رہا ہوں لیکن..... تم لوگوں کو کچھ ہونیس رہا.....“  
ساجد نے بتاتے ہوئے حیرت ظاہر کی۔

سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے کہنے  
انسان..... اندھیرا چاہے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو روشنی کی  
ایک چھوٹی کرن ہی کافی ہوتی ہے، یہ تو واقعی حقیقت ہے  
کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی..... اصغر کے کئے کی سزا  
ہم سب کو بھگتنا پڑی..... تمہارے منتر ہم پھر اس لئے  
اثر نہیں کر رہے کیونکہ شاہ صاحب نے ہم پر کلام الہی  
پڑھ کر پھونکا ہے..... اور نوری علم پر کالاً علم نہیں چلتا۔

”اب تم یہ بتاؤ کہ میرا بیٹا شہروز کہاں ہے  
.....؟“ ثنائکہ نے عزم کے ساتھ کہتے ہوئے پوچھا۔

”اسے تو میں نے اسی رات ختم کر دیا تھا جس  
رات وہ یتیم خانے سے بھاگا تھا۔“ دکھاری ماں کے  
سینے پر ساجد نے ایک وار پھر کیا۔

”حرام زادے، کہنے، ذلیل انسان میں تم  
تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ ثنائکہ یکدم بھڑک  
کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی، اس نے اپنے دوپے  
کے پلو میں چھپی شاہ صاحب کی دی ہوئی پانی کی بوتل  
نکالی سب حیرانگی سے ثنائکہ کی طرف دیکھنے لگے،  
ثنائکہ نے بوتل کا ڈھکنا کھول کر بوتل کا پانی ساجد  
پر ڈال دیا۔

کمرہ ساجد کی چیخوں سے گونج اٹھا ثنائکہ نے  
باقی بچا پانی یعنی اور حامد پر بھی ڈال دیا تو ان کی چیخوں  
سے بھی کمرہ گونج اٹھا تینوں کے جسموں میں یکدم آگ  
بھڑک اٹھی۔

سب پیچھے ہٹ گئے حیرت کی بات یہ تھی کہ  
آگ نے ان تینوں کے سوا کسی چیز کو نہ چھوا سب  
حیران کھڑے حامد، ساجد اور یعنی کا بھیانک انجام  
دیکھ رہے تھے۔

اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے والے چند لمحوں  
میں جل کر اڑھ ہو گئے۔



میڈم کلثوم بیڈ سے اتر کر نیچے آئیں اور حامد کے گالوں  
پر تین چار پھٹر لگا دیئے، غصے میں حامد نے اسے چاقو کے  
ذریعے ختم کر دیا اور شہروز کو میڈم کلثوم کی طرف دھکا دے  
دیا جس سے اس کے ہاتھ اور میض خون سے رنگ گئے۔

شہروز اٹھا اور باہر کی طرف بھاگ گیا میں نے  
اپنی طاقتوں سے میڈم شگفتہ کو بیدار کیا اور اس طرف  
متوجہ کیا کہ شہروز یتیم خانے سے بھاگ رہا ہے ادھر حامد  
نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور میڈم کلثوم کے پیٹ سے  
خنجر نکالا جس سے میڈم کلثوم کی آخری چیخ نکلی۔

میڈم شگفتہ نے رنگے ہاتھوں حامد کو پکڑ لیا تھا  
مجبوراً حامد کو جیل جانا پڑا جب حامد جیل چلا گیا تو میں  
بھیس بدل کر ایک عورت کے ساتھ یعنی کو اغوا کرنے  
کے لئے آ گیا فرضی پتہ لکھوایا جیل سے رہا ہونے کے  
بعد حامد میڈم شگفتہ کی طرف گیا اور فرضی کہانی سے اسے  
اپنی طرف کیا میں نے حامد کے جیل میں جانے کے بعد  
کرم دین کے نام سے تمہارے گھر ملازمت کر لی تھی  
پھر سوچتے سمجھتے منصوبے کے تحت ہم نے نعمان کا اغوا  
کیا اور نعمان کی شکل میں حامد تمہارے گھر آیا اس نے  
تمہارے علاوہ سب کو نعمان بن کر ہی ختم کیا اور ایک ماہ  
کے بعد ہم نے نعمان کو چھوڑ دیا۔

ماریہ کے قتل کے سلسلے میں انسپکٹر جمشید نے اصل  
نعمان کو گرفتار کر لیا تھا اور باقی ثبوت ہم نے تمہارے  
ذریعے کرنے تھے کیونکہ نعمان کی شکل کے پیچھے چھپے حامد  
کے ہاتھ میں کالے جادو کے لفافے تم اکثر دیکھ چکی تھی  
کاشف کو بھی ریب کے سلسلے میں حامد نے ہی پھنسا یا تھا  
اور جیل میں کالے علم کے کاغذ کے ذریعے اسے ختم کیا۔

کالے علم کے لفافے اور اس کھلونے کے  
ذریعے تم یہی فیصلہ کر پاتی کہ نعمان نے ہی یہ سب کچھ  
کیا ہے۔ نعمان ادھر جیل میں قتل کی سزا بھگتا اور تم اکیلی  
تڑپتی۔ لیکن اس شاہ کے بچے نے ہمارا سارا کام خراب  
کر دیا..... خیر پھر بھی یہ پولیس اور تم ہمارا کچھ  
نہیں بگاڑ سکتے..... لیکن..... لیکن ایک حیرانگی والی بات  
ہے کہ میں کافی دیر سے تم لوگوں پر منتر پڑھ پڑھ کر



# تاریکی کا عفریت

ایس امتیاز احمد - کراچی

تابوت میں مردہ لیٹا تھا کہ اچانک اس کی آنکھیں کھل گئیں اس کی آنکھوں میں جیسے شرارے ناچ رہے تھے کہ اچانک اس کا استخوانی ہاتھ اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں خوبرو حسینہ کا گلا دبوچ لیا اور جب حسینہ کی چیخ نکلی تو.....

خوف کے خونی لہادے میں لپٹی ہوئی دماغ کو مبہوت کرتی اور دل کو دبلائی خونچکاں کہانی

اور اندر بیٹھے ہوئے مسافران جانے خوف اور دوسووں میں گھر گئے..... وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں وہ راستہ بھٹک کر ان جنگلوں میں گم تو نہیں ہو گئے! لیکن وہ ایک سرائے میں آ گئے تھے کوچوان کو دکر نیچے اتر اور دروازہ کھول دیا۔ دن بھر کی صبر آ زما مسافت اور تھکن کے بالآخر انہیں آرام و طعام کی سہولت میسر آ گئی تھی۔

مہمانوں کا کمرہ اجنبی مسافروں کا منتظر تھا یہ سرائے چھوٹی تھی لیکن سرائے کا مالک اپنے برطانوی مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے پوری تندہی سے مصروف کار نظر آنے لگا۔ گرم پانی تیار کیا گیا اور جتنی دیر میں یہ برطانوی سیاح نہادھو کر تازہ دم ہوئے کھانا لگایا جا چکا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر یہ لوگ آتش دان کے گرد اکٹھے ہو گئے اور قہوہ کا دور چلنے لگا۔ سب لوگ گل مل کر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ تمباکو کی مہک اور قہوے کی تیز خوشبو نے مل جل کر سرائے پر ایک خوابناک ماحول طاری کر دیا تھا۔ یورپ کے اس تفریحی دورے کا پروگرام۔ چارلس کینٹ نے بنایا تھا وہ ہمیشہ سے ایڈوائس اور سیر و تفریح کا دلدادہ تھا اور نت نئے تفریحی پروگرام بنانا اس کا دلچسپ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔

اس نے سرائے کے مالک کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی

**ٹوٹی** پھوٹی سڑک پر بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ کا پر میتھیا کا یہ علاقہ اپنے گھنے جنگلوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے سیاحوں کے لئے دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن اس علاقے میں ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔ اس لئے بہت کم لوگ ادھر کا رخ کرتے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے چاروں مسافر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ گاڑی پتھر ملی اور ناہموار سڑک پر بری طرح ہل رہی تھی۔

باہر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اگر ان لوگوں کو راستے کی خرابی اور اپنی تھکن کا علم ہوتا تو وہ اس علاقے میں آنے کی بجائے اپنی چھٹیاں ویانا میں ہی گزار لیتے۔ لیکن اب اوکھلی میں سر دیا تھا تو موسلوں سے گھبراتا لا حاصل تھا۔ بہر حال یہ سب کیا دھرا چارلس کا تھا جس کے اصرار پر ان لوگوں کو یہاں آنا پڑا تھا۔

ان کی ہڈیاں بری طرح دکھ رہی تھیں، ان کے جوڑ جوڑ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدایا یہ سفر جلدی ختم ہوتا کہ وہ کچھ دیر آرام کر سکیں اور تازہ دم ہو جائیں تاریکی بڑھ رہی تھی اور یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی کہ اس تاریکی میں کوچوان کو راستہ صاف نظر آ رہا ہوگا۔

چند لمحوں بعد بھی کے رکنے کی آواز آئی







جرمن میں گفتگو شروع کر دی اور دوستی کرنی۔ سرائے میں موجود چند اور لوگوں کو اپنے برطانوی مہمان سے بات چیت کرنا گوارہ نہیں تھا۔ پھر بھی جب چارلس نے انہیں قہوہ پینے کی دعوت دی تو وہ زرب لب مسکرائے۔ کچھ لوگ پائپ پی رہے تھے اور اس گہما گہمی میں بظاہر بڑی بے نیازی سے شامل نظر آتے تھے۔ پھر وہ لوگ جو اکھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ چارلس نے سکہ دوبارہ اچھالا اور وہ دونوں بار جیت گیا۔

دوسرے لوگوں میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی لیکن چارلس نے ماحول کی کشیدگی کے پیش نظر تقریباً ہر شخص کو شراب پلانے کی پیشکش کی اور ماحول پھر سے پرسکون ہو گیا۔ ہیلن کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا یہی نہیں بلکہ چارلس کے بڑے بھائی ایلن نے ابھی اپنی رائے محفوظ رکھی اور کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

بہر حال ایلن مسکراتے ہوئے یہ سب کھیل دیکھ رہا تھا چارلس نے بمشکل تمام ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کو اس مہم پر آنے کے لئے رضا مند کیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کو ورثے میں تھوڑی سی جائیداد ملی تھی۔ چارلس زندگی میں اچھی اچھی چیزوں تفریحات اور عیاشیوں کا قائل تھا اس کے برعکس ایلن کو اپنی بیوی ہیلن کا ساتھ دینا پڑتا تھا جو کنجوس تو نہیں تھی لیکن کفایت شعار ضرور تھی۔ اسی لئے ایلن نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ ایک کاروبار میں لگا رکھا تھا اور اپنی سیاسی اور معاشی حالت خاصی مستحکم کر لی تھی۔ وہ چارلس کی طرح نئی نئی دلچسپیوں اور ایڈوانچرز کی تلاش میں کوشاں نہیں رہتا تھا۔

ایلن کی شادی کو سات آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن اس کی بیوی ہیلن اب بھی پہلے کی طرح شاداب اور شگفتہ شگفتہ نظر آتی تھی۔ ہیلن تیس برس کی ہو چکی تھی لیکن اس کی جلد شفاف اور بے داغ تھی وہ اپنے بال بہت کس کے باندھا کرتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کی معصومیت میں کمی نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر چوستی رہتی تھی۔ چارلس اور ایلن نے کئی بار اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا

لیکن اب یہ چیز ہیلن کی عادت بن چکی تھی۔ چارلس کی بیوی ڈیانا جو اس سفر میں ان کے ہمراہ تھی بڑی دلکش اور خوب رو عورت تھی۔ چارلس سرائے کے مسافروں میں قہوہ تقسیم کر رہا تھا اور ہیلن اس کی اس فضول خرچی پر بڑبڑا رہی تھی۔ ڈیانا کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اپنے شریک حیات کو قہوہ پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ڈیانا کا جسم لوجدار اور گداز تھا اور اس کے گدرائے ہوئے جسم کی چاشنی اسی وقت چارلس کے دل و دماغ میں کھلی جا رہی تھی۔ ڈیانا نے بے تکلفی سے اپنا پیالہ آگے بڑھایا اور چارلس نے اسے ارغوانی رنگ کے قہوے سے بھر دیا۔ ہیلن بے بسی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ اس کے سوا بھلا کر بھی کیا کر سکتی تھی؟

وہ سوچ رہی تھی کہ سرائے میں قیام پذیر دوسرے لوگ یقیناً چارلس کو احمق سمجھ رہے ہوں گے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ”وہ بولی چارلس بس بہت ہو چکی۔ اب تم یہ بچکانہ حرکتیں ختم کرو۔ اتنی فضول خرچی سے بھلا کیا فائدہ؟“

”مجھے اپنی خوشی سے مطلب ہے۔ لوگ کیا سوچ رہے ہیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“ چارلس نے سرد مہری سے جواب دیا پھر اپنے بھائی ایلن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کیا تم بھی ہیلن کی طرح میری فیاضی کو ناپسند کرتے ہو؟“ ایلن مسکرایا۔ ”میرے بھائی میں تو مدت ہوئی تمہارے متعلق پسند یا ناپسند والی حد سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔“

”حماقت تو بہر حال حماقت ہی ہوتی ہے۔“ ہیلن بڑبڑائی! ڈیانا بالکل خاموش رہی۔ اور اپنی خمار آلود آنکھوں میں مستی کے ڈورے لئے نشیلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے محبت پاش انداز میں چارلس کو دیکھنے لگی۔ ”میرا خیال ہے رات بہت بیت چکی۔ اب ہمیں سو جانا چاہئے!“ چارلس نے ڈیانا کی آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا تھا، ہیلن بھی دوسری صبح پھر اسی تکلیف دہ سفر پانے کی تیاری کرنے کے لئے خود کو جلد از جلد تازہ دم



کر لینا چاہتی تھی اسی لئے آرام کی طلب اسے بری طرح ستا رہی تھی۔

ابھی وہ کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سرائے کا صدر دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا اور سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔ سرائے میں موجود لوگوں کے جسم میں سردی کی لہری دوڑ گئی اور وہ خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

دروازے کے نیچوں نیچ ایک قوی ہیکل لمبا چوڑا راہب کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنی عقابی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ تیزی سے اس نے اپنے دانتوں سے ہونٹ کاٹے پھر بڑی بے نیازی سے دروازہ زور سے بند کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر آتش دان کی گرمی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

وہ تیزی سے آتش دان کی طرف بڑھا اور غرایا۔ ”مجھے ایک بوتل سرخ شراب کی شدید طلب ہے۔ سردیوں کی اس برفانی رات میں تو کوئی درندہ بھی باہر نہیں رہ سکتا!“ یکا یک اس کے سر سے کوئی چیز ٹکرائی۔ اس نے جھنجھلا کر اوپر دیکھا۔ وہاں کسی نے لہسن کی ایک پوتھی سیاہ ڈوری میں باندھ کر لٹکا رکھی تھی۔ اس نے جنگلی پن سے بڑے وحشیانہ انداز میں اس ڈوری کو توڑ دیا اور لہسن کی پوتھی اٹھا کر آتش دان میں جھونک دی۔ ”احمق کہیں کے خبیث بدروحوں کو روکنے اور شیطانی قوتوں سے سرائے کو محفوظ رکھنے کا یہ کیا وقیانوسی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔“ فادر شینڈور! سرائے کا مالک گھگھیا نے لگا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں کیا بھوسا بھرا ہوا ہے۔“ وہ پھر غرایا۔ ”دس برس ہو چکے اب یہ سب بکواس ختم ہو چکی ہیں۔“

کمرے میں جہاں کچھ دیر پہلے آوازوں کا شور تھا۔ ایک روح فرسا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فادر شینڈور نے شعلہ باز نگاہوں سے کمرے میں موجود لوگوں کو گھورا اور بولا۔ ”یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے ایک معصوم بچے کی لاش کو میں نے اس عذاب

سے نجات دلائی۔ وہ بد بخت لوگ اسے جلا ڈالنے پر مصر تھے۔ آخر کب تک ہم لوگ یونہی دوسو سوں، ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا شکار ہوتے رہیں گے۔“

سب لوگ خاموش تھے۔ یکا یک پہلی بار فادر کی نظر برطانوی باشندوں پر پڑی۔ اس نے بھرپور نظروں سے چاروں سیاحوں کا جائزہ لیا اور آہستہ سے احتراماً ڈیانا کی تعظیم کے لئے جھکا۔ وہ جوانا مسکرائی اور سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فادر سینڈور نے ہیلن کو بھی تعظیم دی لیکن وہ شس سے شس نہ ہوئی، ٹمکنکی باندھے اس کی جانب دیکھتی رہی۔

”زندگی میں سوائے دکھوں کے اور بھلا رکھا بھی کیا ہے۔ میں اسی لئے جو لمحہ بھی عیش و آرام سے گزر جائے اسے زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں! آرام اور عیاشی تفریح اور سکون روح کے لئے ضروری ہیں۔“

چارلس نے حیرت سے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی باتوں میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ ”فادر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ زندگی کی گہما گہمیوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں؟“ چارلس نے کہا۔

”زندگی میں سکون اور عیش بے حد ضروری ہیں میرے بچے اور اس کے علاوہ بھلا کیا دھرا ہے زندگی میں جہنم کی آگ مرنے کے بعد انسان کی منتظر ہوتی ہے اور ویسے بھی تو زندگی ایک جہنم سے کم نہیں ہوتی!“ فادر شینڈور نے کہا۔

ہیلن نے بے زاری سے ناک سکوڑی۔ فادر شینڈور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ میرے پیارے برطانوی مہمان یہاں کارہ تھیا میں کیا کر رہے ہیں؟“

چارلس نے اپنا اور دوسرے ساتھیوں کا مختصر سارکی تعارف فادر شینڈور سے کرایا۔ پادری نے نرمی سے اور خوش دلی سے گردن ہلائی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں۔ میں کلیں برگ کے گر جا کا بڑا پادری ہوں۔“

چارلس نے اپنے ذہن میں کلیں برگ کے محل



وقوع کے بارے میں ایک مبہم سی تصویر بنانی چاہی لیکن وہ ناکام رہا۔ ”فادر نے اس کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے بچے یہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کیا تم شکار کھیلنے کے شوقین ہو؟“

چارلس نے جواب دیا۔ ”نہیں مجھے کوہ پیمائی کا بہت شوق ہے۔ ویسے بھی مجھے سیاحت اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے سے جنون کی حد تک عشق ہے!“

”خوب بہت خوب۔“ فادر شینڈور مسکرایا۔ ”مجھے اپنے ساتھیوں سے یہی کہنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم چاروں وہاں کلین برگ جاؤ اور چند دن دوسرے راہروں کی پر لطف رفاقت میں بھی گزارو! ہم سب خلوص دل سے تمہارے لئے چشم براہ رہیں گے۔“

چارلس کی باپچیں اس دعوت پر کھل گئیں۔ وہ سوچنے لگا یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوگا۔ اسے ہمیشہ نئے اور دلچسپ پروگرام بہت پسند آتے تھے۔ اس نے ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ہیلن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا۔ ”لیکن کلین برگ جانا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے! ہم وہاں نہیں جاسکتے۔“

چارلس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اگر ہم ایک آدھ دن وہاں گزار آئیں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

ہیلن بولی۔ ”لیکن کل ہمیں جوزف سباد جانا ہے! فادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے کہا میرا خیال ہے آپ لوگوں کو اپنا پروگرام ہر قیمت پر بدل لینا چاہئے!“ ہیلن کے تن بدن میں جیسے چنگاریاں سی لگ گئیں۔

ایلن نے بھی اس لمحے میں ہیلن کا ساتھ دینا مناسب سمجھا، وہ نرمی سے بولا۔ ”آپ کی بے حد نوازش بڑی عنایت کہ آپ ہمیں کلین برگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم سب اس خلوص کے لئے آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں، لیکن ہم نے وہاں سے چلنے سے پہلے ہی اپنا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے معذرت چاہی۔“

”لیکن میرے خیال میں جوزف سباد جانا ایک

فاش غلطی ہوگی۔ یہ خیال ہی ایک حماقت سے کم نہیں۔ میں آپ لوگوں کو کلین برگ آنے کے لئے تو مجبور نہیں کر سکتا لیکن یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ لوگ جوزف سباد ہرگز ہرگز نہ جائیں!“ فادر نے نرم لہجے میں تنبیہ کی۔

”لیکن ہم نے تو سنا ہے وہ بڑی خوبصورت جگہ ہے!“ ڈیانا نے اصرار کیا۔ ”ویسے بھی فادر ہم لوگ بڑے تجربہ کار کوہ پیما ہیں۔ کیا وہاں بہت خطرناک اور دشوار گزار چٹانیں اور راستے ہیں؟“

چارلس کی بات سن کر فادر شینڈور نے ایلن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”لیکن میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جوزف سباد سے دور رہنا ہی تم لوگوں کے حق میں بہتر ہوگا!“

ڈیانا سے نہ رہا گیا۔ ”لیکن آخر کیوں؟ وہ بحسب سے بولی۔“

”میرے بچو! اگر میں تمہیں ساری تفصیلات بتا دوں تو تم شاید میری باتوں کا یقین نہیں کرو گے۔ میں خود بھی تو ہمت کا قائل نہیں ہوں، لیکن خطرے سے دور رہنا ہی بہتر ہوگا۔ جوزف سباد بدروحوں کا مسکن ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اس ملک میں اور بھی بہت خوبصورت جگہیں موجود ہیں۔ جہاں دل چاہے جا کر زندگی کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہو لیکن جوزف سباد نہ جانا ہی اچھا ہے۔“ فادر شینڈور نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

چارلس بولا۔ ”تو گویا یہ چیزیں بھی اب ہمارے لئے چیلنج بن گئی ہیں! فادر شینڈور نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلایا۔“ سرائے کا مالک کہاں ہے؟

”سرائے کے مالک نے آگے بڑھ کر سرا سیمگی کے عالم میں پادری کے ہاتھ سے شراب کا خالی جام لے لیا۔“ اپنے آدی سے کہو میرا گھوڑا باہر تھان سے کھول کر لے آئے مجھے ابھی بہت دور جانا ہے!“ پھر وہ چارلس وغیرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اچھا میرے بچو یسوع مسیح تمہاری حفاظت کرے بہتر تو یہی ہے کہ تم میری ہدایت پر عمل کرو۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو، تو بھی قلعے کے قریب مت جانا اسی میں تمہاری بھلائی ہے!“



قلعہ.....“ ایلن نے حیرت سے دہرایا۔ ”نقشے میں تو قلعہ نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے!“

”ضروری نہیں کہ جو چیز نقشے میں نہ ہو اس کا وجود سرے سے نہ ہو! بہر حال تم لوگ قلعہ سے دور رہی رہنا!“ یہ کہہ کر فادر تعظیماً جھکا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر سے مقفل کر لیا گیا اور دو رات کے سناٹے میں اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئی۔

سرائے میں ہلکی ہلکی آوازیں ابھرنے لگیں۔

یکا یک ایلن نے سرائے کے مال سے پوچھا۔ ”فادر نے کس قلعہ کے متعلق بتایا تھا کیا تمہیں معلوم ہے وہ کہاں پر واقع ہے.....“ سرائے کے مالک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایلن کی طرف دیکھا..... قلعہ؟ کیسا قلعہ؟ جہاں تک میرے علم میں ہے مجھے کسی قلعے کا پتہ نہیں ہے! سرائے کے مالک نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

”ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے رخ موڑتے ہی ڈیانا نے حیرت سے کہا.....“ یہ کم بخت آخر اتنا خوف زدہ کیوں ہے.....؟

”میرا خیال ہے فادر شینڈور کی باتوں نے ان لوگوں کے دل و دماغ پر بہت اثر کیا ہے!“ چارلس نے اپنی رائے ظاہر کی۔

”ہیلن کا خیال تھا کہ انہیں ان فضول باتوں پر دھیان دیئے بغیر جوزف سباد کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔ ویسے بھی ہیلن خواہ مخواہ رسک۔ لینے کی عادی نہیں تھی۔ چارلس نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اپنی گل اندام بیوی ڈیانا کی طرف دیکھا۔ اس کے آتش بدن کی آنچ اور دھیمی دھیمی آگ کی لپٹیں اس کے دل کو چھو رہی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سوچ رہا تھا کون جانے واقعی وہاں کوئی قلعہ بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی مہم درپیش آجائے۔ کتنا مزہ آئے گا اگر ایسا ہو گیا تو.....“

”پھر اس نے ڈیانا کا گلابی ماتھا چوما اور پر جانے لگا۔ دوسرے دن علی الصبح وہ لوگ سرائے سے چل دیئے۔ ایک بار پھر کبھی کا سفر ان کا منتظر تھا۔ کافی دیر تک

چلنے کے بعد کوچوان نے کبھی روکی۔ اور ان لوگوں سے اتر جانے کا کہا۔ ”لیکن ہم نے تو تم سے جوزف سباد کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ آخر ہم یہاں کیوں اتریں۔ یہ بھی بھلا کوئی شرافت ہے!“ چارلس نے احتجاج کیا۔

کوچوان نے بے نیازی سے کہا۔ ”تم لوگ وہاں تک پیدل جاسکتے ہو!“

چارلس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ اور ایلن بضد تھے کہ کوچوان انہیں آگے لے جائے، لیکن وہ کم بخت انہیں وہیں اتارنے پر بضد تھا۔ جھگڑا سنگین نوعیت اختیار کرتا جا رہا تھا اور خاصی تو تو میں میں کے بعد آخر نوبت اٹھاؤں تک جا پہنچی۔

لیکن اس سے پہلے مار دھاڑ شروع ہوتی یکا یک دو چارلس کی نظر ایک پرانے قلعہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ اس نے حیرت سے اس طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو..... قلعہ..... وہ رہا قلعہ!“ کوچوان نے یکجہت پلٹ کر دیکھا..... اسی اثناء میں ایلن بھی قلعے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ”یہ کیسی جگہ ہے؟“ چارلس نے کوچوان کا شانہ تھپتھپایا۔

”کون سی جگہ؟“ کوچوان جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔ وہ قلعے کی طرف سے نظریں چرا رہا تھا اور دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران چارلس نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر نیچے گرا لیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور چٹان کی ڈھلوان سے لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرے! لیکن پلک جھپکتے میں کوچوان نے ایک تیز دھار چاقو اپنے ڈب میں سے نکال کر اسے گھماتا ہوا چارلس کی طرف بڑھنے لگا۔

”اچھا اب بہت ہو چکی۔ سیدھی طرح خواتین کو باہر نکالو اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ!“

کوچوان نے بڑی کمینگی اور سفاکی سے ایلن اور چارلس کو وارنگ دی! اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا جس نے چارلس اور ایلن کو اور خوف زدہ کر دیا تھا! وہ اس کی درندگی اور وحشت کو نظروں میں تول رہے تھے۔

پھر انہوں نے سوچا کہ حالات کی سنگینی کے پیش



نظر یہی مناسب ہوگا کہ وہ بگھی خالی کر دیں! ہیلن اور ڈیانا بگھی سے اتر آئیں۔ چارلس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ڈیانا نے مضبوطی سے اس کا بازو جکڑ لیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے کوچوان کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے چاقو کو دیکھ رہی تھی۔

کوچوان بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور ایک چھلانگ مار کر بگھی میں جا بیٹھا۔ اس نے تیز دھار چاقو سے سامان کی ڈوری کاٹ ڈالی اور ایک ایک کر کے سارے سوٹ کیس سڑک پر گر گئے۔ کوچوان نے لگا میں سنبھالیں اور بولا۔ ”میں کل صبح سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد یہاں پھر آؤں گا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا، لیکن جوزف سب اد نہیں۔ یہاں سے واپس ہاں بس شرط یہی ہے کہ تم لوگ اگر صبح تک مجھے زندہ مل گئے تو!“ ہیلن اور ڈیانا نے خوف سے جھرجھری لی اور ڈیانا نے چارلس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ کوچوان نے چابک لہرایا اور گھوڑے ہنسناتے ہوئے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ چند لمحوں میں بگھی دور ہوتی ہوئی ایک سیاہ دھبا بن کر رہ گئی اور پھر اس کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

چارلس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ تاریکی سے خوف زدہ تھا! لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ ڈاکو یا رہزن نہیں تھا۔“

اب آہستہ آہستہ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور دور فاصلے پر قلعہ کی چند کھڑکیوں سے چمکتی ہوئی روشنی تاریک رات میں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھی۔ دور سے دیکھنے پر قلعہ کی عمارت بڑی بوسیدہ اور پرانی نظر آتی تھی۔ دن کی روشنی میں چاہے قلعہ کیسا بھی لگتا ہو لیکن رات کی تاریکی میں قلعہ خاصا بھیانک اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔

چارلس نے کہا۔ ”فادر شینڈور نے ٹھیک کہا تھا۔ قلعہ وہاں موجود ہے یہ کوئی وہم یا نظر کا دھوکہ ہرگز نہیں ہے!“ ڈیانا نے پوچھا۔ ”لیکن خدا معلوم ایسا کیا راز ہے جو ہر شخص اس قلعے کا ذکر آتے ہی پہلو تہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خود کوچوان بھی

ہمیں بے وقوف بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا!“ ہیلن نے کہا۔ ”میرا خیال ہے فادر شینڈور کا خدشہ بے بنیاد ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں اس قلعہ سے ہر وقت دور رہنا چاہئے!“ چارلس نے چونک کر ہیلن کی طرف دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہیلن نے اپنی ضدی طبیعت کے برعکس کسی دوسرے کی رائے کی تائید کی تھی! وہ حیرت سے ہیلن کی طرف دیکھنے لگا۔ خود ڈیانا بھی ہیلن کی بات کی تائید کر رہی تھی؟

چارلس نے خاموشی سے ایلن سے مشورہ کیا کہ اس معاملے میں اس کی رائے کیا ہے۔ ایلن نے جو ایسے معاملات میں زیادہ تر چارلس پر اعتماد کیا کرتا تھا اس مرتبہ بھی خاموش رہا پھر بولا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں رات یہاں قلعہ سے باہر ہی گزارنی چاہئے!“ غالباً وہ بھی ان حالات میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ چارلس نے ایک لکڑہارے کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

”میرا خیال ہے ہم رات کو یہاں آگ جلا کر شب باشی کر سکتے ہیں!“

”یہ بہت اچھا ہوگا!“ ہیلن نے اطمینان ظاہر کیا دونوں آدمیوں نے بھاری بھاری سوٹ کیس خود اٹھائے اور ہلکا پھلکا سامان خواتین کے سپرد کر دیا۔ پھر یہ چاروں جھونپڑی سی چٹان پر سے ہوتے ہوئے اس چوراہے کے قریب بنی ہوئی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ جھونپڑی کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ چارلس نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں کھلا۔ بالآخر اس نے اپنے شانے کا زور لگا کر دروازہ کھولا جو ہلکی سی جڑ جڑاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

جھونپڑی خالی تھی۔ اس کے فرش پر ایک کونے میں خشک اور سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ چارلس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے دونوں سوٹ کیس فرش پر رکھ دیئے اور خالی خالی نظروں سے جھونپڑی کا جائزہ لینے لگا۔

پھر اس نے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کیا۔ ”میرا



خیال ہے رات گزارنے کے لئے یہ جگہ مناسب ہے!“  
ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے تو قلعہ کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی میں خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن چارلس کچھ بے چین نظر آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا آخر یہ لوگ کیوں اتنے بزدل واقع ہوئے ہیں! قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے جھوپڑی میں گھسے رہنے کا آخر کیا فائدہ! وہ دل دہی دل میں بہت کڑھ رہا تھا اور اس کو چوان کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بجائے جوزف سباد جانے کے اس ویرانے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ سب لوگ اپنا سامان اٹھائے جھوپڑی میں آگئے۔ انہیں یہ سوچ کر کچھ سکون اور اطمینان ہوا کہ اب وہ نسبتاً محفوظ جگہ پر ہیں۔ ڈیانا کا خیال تھا کہ انہیں آگ باہر جلانی چاہئے لیکن ہیلن اور چارلس کو یہ آئیڈیا اچھا نہیں لگا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ باہر دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آتی سنائی دی۔

”میرا خیال ہے کوچوان نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور اب ہمیں لینے آیا ہے؟“ ایلن نے خوش فہمی سے کہا۔

ہیلن کی بانچھیں بھی کھل گئیں۔ وہ چاروں جھوپڑی سے باہر نکل کر چوراہے کے قریب کھڑے ہو گئے اور شام کے دھندلکے میں ادھر دیکھنے لگے جدھر سے آواز آرہی تھی لیکن بالکل غیر متوقع طور پر ایک بگھی اس سمت سے آتی نظر آئی جدھر قلعہ واقع تھا۔ ڈیانا نے سہم کر چارلس کا بازو تھام لیا ڈیانا کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا۔

درختوں کے جھنڈ میں سے سیاہ بگھی نمودار ہوئی جسے دو شاندار نسل کے گھوڑے بڑی شان سے کھینچ رہے تھے۔ لیکن وہاں کوئی کوچوان نہیں تھا۔ ہیلن کا حلق خوف سے خشک ہونے لگا۔ اس کے شوہر ایلن نے چارلس سے کہا۔ ”کیا ہم اسے روک سکیں گے؟“

یہ سنتے ہی چارلس نے جو ہمیشہ مہم جو واقع ہوا تھا سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ گھوڑے برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی خوبصورت ایالیں ہوا میں لہرا رہی

تھیں اور ان کے سیاہ جسم شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔  
ڈیانا بے قرار ہو کر چیخیں۔ ”چارلس۔“  
لیکن چارلس اپنی جگہ جم رہا۔ اسی دوران بگھی اس کے بہت قریب آچکی تھی پھر اچانک چارلس سے دو گز کے فاصلے پر آ کر بگھی رک گئی۔ گھوڑے نہانے لگے اور بار بار اپنے سم زمین پر مارنے لگے۔ چارلس نے آگے بڑھ کر ایک گھوڑے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کی لگامیں تھام لیں۔ ہیلن اور ڈیانا بڑی نروس ہو رہی تھیں چارلس نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے یہ حالات بڑے غیر معمولی ہیں لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوگی اگر اس ٹور میں حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات پیش نہ آئے۔“

پھر اس نے سب لوگوں کو بگھی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈیانا اور ہیلن سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ بڑا پرسرار، بڑا غیر معمولی اور بہت سنگین نظر آتا تھا، لیکن اس دور دراز ویران اور پرہول سنائے سے بہتر تھا کہ وہ لوگ بگھی میں بیٹھ جاتے، ہو سکتا ہے اس طرح وہ کسی سرائے میں جا سکیں اور یوں سفر کی کوفت اور الجھن کسی حد تک دور ہو جائے۔

آخر چارلس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”ٹھیک ہے آؤ سامان لادیں اور چلنے کی تیاری کریں۔“ اسے یقین تھا کہ ہیلن کے مقابلے میں ڈیانا زیادہ ہمت اور جرأت کا مقابلہ کرے گی اور فوراً بگھی میں بیٹھ جائے گی۔ اور ہوا بھی یہی ہیلن جھجکتے ہوئے بگھی میں سوار ہو گئی۔ ایلن نے پوچھا۔ ”جوزف سباد؟“

”ہاں جوزف۔ سباد۔“ چارلس نے بڑے اعتماد اور یقین سے کہا پھر اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے، لیکن چارلس کی آنکھیں خوف اور ہشت سے ابل پڑیں گھوڑے اپنا رخ تبدیل کر رہے تھے اور بجائے جوزف سباد کی سڑک پر جانے کے قلعہ کے طرف جانے والی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

چارلس زور سے چیخا لیکن رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی اور سنائے میں اس کی آواز زیادہ دور تک نہ گونجی۔ گھوڑے بہت تیزی سے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔



چارلس کو یقین ہو گیا کہ وہ ان جانوروں کا رخ تبدیل کر سکے گا۔ اس نے لگا میں ڈھیلی چھوڑ دیں لیکن گھوڑوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی وہ بدستور برق رفتاری سے بھاگ رہے تھے۔ ”ہوسکتا ہے قلعہ کا مالک کوئی خوش اخلاق اور نیک دل آدمی ہو اور چند گھڑیاں سکون کی مل سکیں۔“ چارلس نے دل ہی دل میں سوچا۔

رات کی اس تاریکی میں گھوڑے یوں بے خبر و خطر اور آسانی سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے ان کے سم ان راستوں سے اچھی طرح آشنا ہوں۔ پھر قلعہ کی کھڑکیوں کی زرد روشنی قریب آنے لگی اور پانی سے بھری ہوئی ایک خندق عبور کر کے گھوڑے بڑے وقار سے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک بڑا سا محکم تھا اب گھوڑوں کی رفتار آہستہ ہو گئی تھیں۔ پہنیوں کی گڑ گڑاہٹ میں بھی کمی آ گئی تھی اور آخر کار کبھی صدر دروازے کے سامنے رک گئی۔

ہر طرف بھیاں تک سی خاموشی تھی اور سناٹا چاروں مسافروں کی رگوں میں سنسنی بن کر اترتا چلا جا رہا تھا۔ ایلن نے درشتگی سے کہا۔ ”کیا ہوا تم ہمیں یہاں کیوں لے آئے ہو؟“

یہ میں نہیں لایا یہ کام ان گھوڑوں کا ہے!“ اس کے لہجے میں حیرت اور خوف کے اثرات نمایاں تھے چارلس نے کہا اور کبھی سے چھلانگ لگا دی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ قلعے کا مالک نجانے کیسا آدمی ہوگا۔ پھر ان سب کی نگاہیں بڑے سے دروازے پر جم گئیں۔ وہ جب آئے تھے تو رات کے سناٹے میں خاصا شور ہوا تھا، لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اب تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ کم از کم کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔ آخر کار چارلس نے خوش دلی سے کہا۔ آئیے خواتین ہم سب اندر چلتے ہیں اور صاحب خانہ سے خود ہی مل لیتے ہیں۔ ہیلن کو چارلس کی بات سے اتفاق نہیں تھا اسے ان سب باتوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

چارلس دروازے کے قریب گیا۔ ایک گھوڑے نے زور زور سے اپنی ٹانگیں زمین پر مارنی شروع

کر دیں اور بری طرح ہنہانیا۔ اس کے گلے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پھر چاروں طرف وہی روح فرسا خاموشی چھا گئی۔ چارلس نے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن دروازہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ چارلس نے مڑ کر اپنے قریب کھڑے ہوئے ایلن کی طرف دیکھا اور پھر وہ سب اندر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے خاتمے پر ایک گیلری بنی ہوئی تھی۔ فرش سے لے کر گیلری تک بے حد خوبصورت نقشتین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیواریں اور فرش بڑے قیمتی پتھر سے بنی ہوئی تھیں اور ہال کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک دبیز قالین بچھے ہوئے تھے ایک دیوار میں بہت وسیع و عریض آتش دان تھا جس میں لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے اور آتش دان میں شعلے اٹھ رہے تھے۔

”ہیلو، کوئی ہے؟“ چارلس کی آواز ہال کی دیواروں میں گونجی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن آگ میں ابھی تازہ لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ چارلس نے دیکھا کہ ہال کے ایک کونے میں سا گوان کی ایک میز پر چار آدمیوں کے لئے کھانا چنا ہوا تھا۔ ابھی وہ حیرت سے بت بنایہ سب چیزیں دیکھ رہا تھا کہ باہر گھوڑوں کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کے بجنے کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

حیرت اور خوف سے ان کے منہ پھٹے کے پٹھے رہ گئے۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ ابھی بہت تیزی سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔ ان کا تمام اسباب کبھی پرلدا ہوا تھا اور گھوڑے بجلی کی سی تیزی سے کبھی کو کھینچنے لئے جا رہے تھے پھر یلے فرش پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں کبھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہیلن نے ہسٹریائی انداز میں سسکی لی اور بولی۔ ”مجھے معلوم تھا ایسا ہی ہوگا۔ ہمیں ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ کاش تم لوگ میرا کہا مان لیتے تو ہم کبھی اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ کاش!“

”اگر ہم تمہارا کہنا مان لیتے تو ابھی تک انگلینڈ



میں ہی ہوتے۔“ چارلس نے احتجاج کیا۔ ”کیا یہ کوئی بری بات ہوتی؟“ ..... ”میرا خیال تھا کہ تم زندگی میں کچھ دیکھنا اور سیکھنا چاہو گی تم تو گھرے کی مچھلی نکلیں.....“ چارلس نے ہیلن پر چوٹ کی۔ ان کی نوک جھونک سے ایلن بیزار ہو چکا تھا۔ اتنے میں ڈیانا میز کے قریب گئی اور بولی۔ ”دیکھو ہماری آمد یہاں غیر متوقع نہیں تھی۔ پہلے وہ کبھی ہمیں یہاں لائی اور اب جبکہ ہم یہاں ہیں یہ کھانے کی میز اور یہ سب تکلف۔ آخر ان سب کا کیا مطلب ہے؟“ وہ حیرت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

چارلس نے اب تک اپنی بیوی سے متفق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا ابھی گیلری کی سیڑھیوں سے چار آدمی اتر کر آئیں گے اور کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اس کے اعصاب بھی اب تھک سے گئے تھے۔ کیا اس قلعہ میں رہنے والے سب لوگ گونگے اور بہرے ہیں۔ پھر بھی ان سب باتوں کا جواب جاننے کے لئے کسی نہ کسی کا اوپر جانا بے حد ضروری ہے۔

چارلس بے خونی سے آگے بڑھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ”نہیں نہیں رک جاؤ۔“ ہیلن نے چیخ کر اسے روکنے کو کہا۔ ”ہمیں اس محل نما قلعہ سے چلے جانا چاہئے ہم یہاں نہیں رہ سکتے!“ وہ بے حد خوف زدہ تھی! ایلن نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا، لیکن ہیلن نے خود کو چھڑا لیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ”ڈارلنگ تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چارلس نے بھی ہیلن کو تسلی دی لیکن وہ بدستور ہاتھ پھیلائے التجا کرتی رہی۔ ”خدا کے لئے تم وہاں مت جاؤ میں خدا کا واسطہ دیتی ہوں تم اوپر مت جاؤ۔“ چارلس نے اس کی التجا کو نظر انداز کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیلری کی طرف بڑھنے لگا۔ گیلری ختم ہوتے ہی چارلس نے خود ایک کاریڈور کے سرے پر پایا۔ یہ ایک طویل سی راہداری تھی جس میں زرد مشعلیں جل رہی تھیں اور راہداری کی دونوں طرف دور تک بند کمروں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔

چارلس نے پوری قوت سے آواز دی۔ ”کوئی

ہے؟“

پھر وہ چند لمحے جواب کا منتظر رہا پر روح فرسا خاموشی اسے بے چین کئے دے رہے تھی۔ اگر اس عمارت میں یہ روشنیاں مشعلیں وغیرہ نہ ہوتیں تو شاید وہ یقین بھی کر لیتا کہ صدیوں سے کسی انسان نے اس قلعہ میں قدم نہ رکھا ہوگا۔ بغیر کسی سے ملے وہ نیچے جانے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں پہلے کمرے کے دروازے تک گیا اور دستک دی اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا دروازہ کھل گیا اور چارلس اندر چلا گیا۔

کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اس روشنی میں اس آگ کے شعلوں کی سرخی بھی شامل تھی جو آتشدان میں جل رہی تھی کمرہ خوب گرم تھا اور کمرے کے ایک کونے میں اوپر تلے چند سوٹ کیس کھلے تھے باہر جاتے جاتے چارلس کے قدم جیسے کسی نے جکڑ لئے ہوں۔ اسے ان سوٹ کیسوں پر لکھے ہوئے اے کے کے الفاظ واضح نظر آ رہے تھے۔ یہ ایلن کین کا سوٹ کیس تھا جسے خود چارلس نے کبھی پر لاد ا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ ہیلن نے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی خوف سے چیخنے لگے گی۔ وہ سب نیچے کھڑے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”ایلن تم ایک منٹ کے لئے ذرا اوپر آؤ!“ چارلس نے کہا۔ ہیلن نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کو روکنا چاہا لیکن وہ زینے پر جڑھ چکا تھا اور گیلری کے قریب آ گیا تھا۔ چارلس اسے کمرے میں لے گیا اور یہ سب چیزیں دکھائیں۔ ایلن کو کسی صورت ان باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ انہیں اپنی نظر کا فریب سمجھ رہا تھا لیکن جب اس نے اپنا سوٹ کیس اور اپنی قمیض دیکھی جو اس کے سر ہانے تہہ کی ہوئی رکھی تھی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

چارلس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں بھی آتش دان میں آگ روشن تھی اور صورت حال



پہلے کمرے سے بالکل مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کمرہ چارلس کے لئے مخصوص تھا کہ اس کا سامان بھی یہاں رکھا ہوا تھا۔ ابھی وہ ان بھول بھلیوں میں گم تھے کہ یکا یک ہال میں ایک وحشت ناک چیخ ابھری جو بڑی دیر تک گونجتی رہی۔ یہ ہیلن کی چیخ تھی۔

ایلن اور چارلس بے قرار ہو کر باہر کی طرف دوڑے۔ ڈیانا اور ہیلن ہال کے وسط میں کھڑی خوف سے لرز رہی تھیں اور ان کے چہرے سفید ہو رہے تھے انہوں نے دیکھا ہال کی ایک دیوار کے قریب ایک بلند قامت، بد صورت اور خوف ناک آنکھوں والا اجنبی شخص چپ کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی بھونٹیں گھنی اور سیاہ تھیں اور اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

ایلن غرایا۔ ”یہ کیا تمیزی ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے؟ کیا تم اس سے زیادہ بہتر انداز میں ہمارا خیر مقدم نہیں کر سکتے تھے۔“ اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ خود چارلس کی حالت بھی غصہ سے غیر ہو رہی تھی۔ اجنبی نے تعظیماً جھکتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میرے آنے سے معزز خواتین ڈسٹرب ہو گئیں۔“ ”لیکن تم نے آخر اتنی دیر کیوں لگائی۔ ہم لوگ تو یہاں جانے کب سے پاگلوں کی طرح آوازیں دے رہے تھے۔“ چارلس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ لوگوں کا سامان درست کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے؟“ اجنبی نے جھک کر کہا۔

”ہر چیز قابل تعریف ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ چارلس نے کچھ کہنا چاہا۔

اجنبی کراہیت سے مسکرایا۔ ”میرے آقا کی مہمان نوازی تو دور دور تک مشہور ہے۔“ ”لیکن ہم تو تمہارے آقا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“ چارلس نے کہا۔

اجنبی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر آپ لوگ تیار ہوں تو میں کھانا پیش کروں۔“

چارلس کے ذہن میں سینکڑوں سوال کلبلا رہے تھے، ایلن وہ جانتا تھا کہ یہ ذلیل آدمی اس کے سوالوں کے جواب نہیں دے گا۔ ویسے بھی اب بھوک اسے بری طرح ستا رہی تھی لہذا ان باتوں کو پھر کسی وقت پر بھی اٹھایا جاسکتا تھا، اس نے اجنبی کی تائید میں سر ہلایا اور وہ ایک دروازہ کھول کر غائب ہو گیا۔

”شکر ہے۔“ ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”میں اب بھی کہتی ہوں، میں فوراً یہاں سے چل دینا چاہئے۔“ ”میری سمجھ میں خود کوئی بات نہیں آتی۔ اس وقت بھوک اتنے زوروں کی لگی ہوئی ہے کہ کچھ نہیں سوچ رہا!“ ڈیانا نے بھی چارلس کی تائید کی ڈیانا سوچ رہی تھی کہ اب اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے وہ ایک ویران جنگل میں بھوکے پیاسے کھڑے تھے اور اب گرم بستر عمدہ کھانا اور ایک مہمان نواز میزبان ان سب کے انتظار میں تھے۔

چارلس نے ان سب سے کھانے کی میز پر بیٹھنے کو کہا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ اجنبی جو شاید یہاں کا ملازم تھا سوپ لے کر آ گیا اور سرو کرنا شروع کر دیا۔ چارلس نے اس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“ ”جناب خادم کوکلو کہتے ہیں۔“ اس نے جھک کر کہا۔

”بہت خوب کلو کیا تمہارے آقا کھانے میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے؟“ چارلس نے پوچھا۔ ”مجھے افسوس ہے وہ ایسا نہیں کر سکتے!“ کلو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”کیا وہ بیمار ہیں؟“ ایلن نے پوچھا۔ ”جی نہیں..... وہ مر چکے ہیں.....؟“ کلو نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ہال میں گرمی کے باوجود چارلس کو جھرجھری آگئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہال کے دروازے کھول دیئے ہوں اور سردی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ رہی ہو۔

چارلس نے بڑے اعتماد سے کلو کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ..... کبھی کمروں ڈنر



اور ان سب چیزوں کا آخر کیا مطلب ہے۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟“ کلوو نے چارلس کی طرف دیکھا اور بولا۔  
”یقیناً جناب! میرے آقا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے جو ہدایات مجھے دی ہیں اور جن پر عمل کرنا میرا فرض ہے ان کے مطابق اس قلعے کے دروازے اجنبیوں اور مہمانوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ میں صرف ان کی آخری خواہشات کا احترام کرنے کے لئے زندہ ہوں۔“ اس کی آواز رندھی گئی۔

”تمہارے آقا کا نام کیا تھا؟“ چارلس نے پوچھا۔  
کلوو نے پراسرار طور پر آتش دان کی طرف دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو پھر کہا۔ ”ان کا نام کاؤنٹ ڈریکولا تھا، وہ ایک بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔“  
”کیا ان کے بعد اب اور کوئی اس قلعہ میں نہیں رہتا؟“

”جی نہیں میرے آقا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔“ یہ کہہ کر کلوو ہاں سے چل دیا۔ اس کے جاتے ہی وہ سب حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے سوپ پینا شروع کر دیا اور اس کی لذت نے خوف اور وہم کے جذبات کو ان کے ذہن سے وقتی طور پر دور کر دیا۔

چارلس نے سوپ پی کر نیپ کن سے ہاتھ پونچھے اور بولا۔ ”میرا خیال ہے کل ہمیں بل پیش کیا جائے گا۔“ ڈیانا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ چارلس کو ایسے سنگین حالات میں بھی مذاق سوچ رہا ہے۔ اس نے سوچا کم از کم انگلینڈ میں تو ایسے شاہ خرچ اور فراخ دل لوگ کم ہی ملتے ہیں جو مرنے سے پہلے یہ وصیت کر جائیں کہ ان کے بعد ان کے محلات کے دروازے ہمیشہ اجنبیوں کے لئے کھلے رہیں۔

پھر وہ سب کھانے کے متعلق باتیں کرنے لگے اس اجنبی جگہ پر کلوو اور اس کے آقا کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریفوں میں مگن ہو گئے۔ ان کا خیال

تھا کہ کوچوان خواہ مخواہ اتنی اچھی جگہ سے خوف زدہ تھا۔ ہیلن نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے کہا۔ ”ذرتی تو میں نہیں ہوں۔ ہاں یہ جگہ کچھ ایسی بھیا تک اور دہشت انگیز ہے کہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔“ ایلن نے ہیلن کا بازو تھاما اور اسے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔  
”ڈارلنگ پہلے پہل یہ سب بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ لیکن اب تو ہر بات عیاں ہو چکی ہے اب کس بات کا خوف ہے؟“

ہیلن نے اپنا بازو چھڑایا اور بولی۔ ”حیرت ہے تم اتنی جلدی فادر شینڈور کی نصیحت بھول گئے ہو۔ تمہیں یاد نہیں انہوں نے کتنی سختی سے ہمیں اس قلعہ سے دور رہنے کو کہا تھا۔“

چارلس نے شراب کا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ”وہ صرف اس لئے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ان کے ہمراہ کلین برگ جائیں۔ میں تو کہتا ہوں یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں یہاں آنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں مرحوم کاؤنٹ کی عنایات کا شکر گزار ہونا چاہئے اور لطف اٹھانا چاہئے۔ میں شراب کا پہلا جام کاؤنٹ کے نام تجویز کرتا ہوں۔ خدا اسے کروٹ کروٹ سکون نصیب کرے!“

اسی لمحے باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے پوری عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ آتش دان میں آگ بہت زور سے بھڑکی ڈیانا اور ایلن نے بھی اپنے جام ٹکرائے پھر ڈیانا نے کہا۔ ”کاؤنٹ ڈریکولا۔“ اور اس کی آواز ہال میں گم ہو گئی۔

بغیر کسی آہٹ کے کلوو قلعہ کے اندر سے ہال میں آگیا اور سوپ کے پیالے اکٹھے کرنے لگا۔ ایلن نے نرمی سے اپنا گلاس اٹھایا اور کہا۔ ”کاؤنٹ ڈریکولا۔“ کلوو نے محسوس کیا کہ ہیلن کا جام ابھی تک شراب سے لبریز تھا۔ اس نے دوسروں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کاؤنٹ ڈریکولا کو گزرے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے ظالم اور خونخوار درندہ تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی دہشت



اور خونریزی سے خائف رہتے تھے اور ہمیشہ اس تاک میں رہا کرتے تھے کہ جب بھی موقع ملے وہ اسے کیفر کردار تک پہنچادیں۔ اس کے متعلق بڑی بھیانک اور پر اسرار کہانیاں مشہور تھیں اور اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا ایک دن موقع پا کر کچھ لوگوں نے اسے دبوچ لیا اور ختم کر دیا تھا۔

ڈریکولا ایک بدروح تھی۔ اس کی بچی ہوئی راکھ کو کلوو نے مدتوں سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شیطانی قوتوں نے اب اسے یہ زریں موقع فراہم کر دیا تھا کہ ڈریکولا کی خون آشامی اور اس کی پیاس کو بجھانے کا سامان ہو گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ چار افراد خوف اور دہشت کے اس جال میں خود آ کر پھنس گئے، بلکہ یہ کہ وہ چاروں مطمئن تھے جیسے وہ کسی بہت اچھی جگہ آ گئے ہوں۔

کلوو اپنے آقا کو دوبارہ زندگی دینے کے لئے بے قرار تھا۔ اس وقت وہ راہداری میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مدتیں گزر گئی تھیں کہ ان ایوانوں میں خون اور قتل و غارت کے ہوشربا مناظر دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔ صرف اس لئے کہ اس کا آقا ڈریکولا راکھ کی صورت میں چنگاری بننے کا طویل عرصے سے منتظر تھا۔

کلوو نے آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور آواز دی۔ ہیلن بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر ایلن کو جگایا۔ ہیلن کی بے چینی کو دیکھتے ہوئے ایلن نے موم بتی اٹھائی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آیا۔ کلوو اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے کونے میں کھڑا ہوا تابوت اٹھایا اور اسے اپنی کمر پر لاد کر گیلری کا زینہ اترنے لگا۔ وہ تابوت لے کر دانستہ طور پر آہستہ آہستہ گھسیٹ رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ احمق ایلن اس کا تعاقب کر رہا ہوگا۔

وہ تابوت اٹھا کے نیچے تہہ خانے میں چلا گیا۔

اس کے آقا کی خواہش یہی تھی کہ قربانی کی مہم یہاں انجام دی جائے۔ کلوو نے تابوت ایک طرف رکھ دیا اور خود تاریکی میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کچھ دیر بعد تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایلن موم بتی سنبھالے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر فکر اور تجسس کے آثار نمایاں تھے وہ دبے پاؤں تابوت کے قریب گیا اور موم بتی کی بھڑکتی ہوئی لو میں اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔ تابوت پر کوئی تاریخ یا فقرہ درج نہیں تھا صرف کاؤنٹ ڈریکولا کھدا ہوا تھا۔

کلوو نے چشم زدن میں بھانپ لیا کہ اب موقع آ گیا ہے کہ وہ اس سنہری لمحے کا بہترین مصرف کر سکے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور اس سے پہلے کہ ایلن چیخ سکے یا کوئی آواز نکال سکے ایک ہی وار میں خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔ ایلن بے جان ہو کر فرش پر گرنے لگا تو کلوو نے اسے سنبھالا اور تابوت کا ڈھکنا کھول کر اسے تابوت کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔

پھر اس نے تیزی سے کونے میں رکھا ہوا مرتبان اٹھایا اور ڈریکولا کی راکھ اس تابوت میں ڈال دی۔ تابوت کے عین اوپر ایک رسی کنڈے سے بندھی ہوئی لنک رہی تھی۔ کلوو نے ایلن کی لاش کو کھینچ کر اس کے دونوں پاؤں رسی میں باندھے اور لاش کو الٹا کر کے تابوت کے اوپر لٹکا دیا۔ پھر اس نے اپنے تیز دھار خنجر سے ایلن کی شہ رگ کاٹ ڈالی لاش تڑپنے لگی اور خون کا فوارہ راکھ پر گرنے لگا۔

خون بڑی تیزی سے راکھ پر گر رہا تھا۔ کلوو نے خنجر کا ایک اور وار کیا اور گرم گرم تازہ گاڑھا خون مزید تیزی سے گرنے لگا۔ ایک جھٹکے سے کلوو نے لاش کی گردن کاٹ ڈالی اور سر کو دھڑ سے علیحدہ کر کے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ اب وہ دوزانوں ہو کر تابوت کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں خوف اور احترام کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔

باہر بجلی بہت زور سے چمکی اور پھر بادل گرجنے



لگے۔ روشنی کا ایک تیز جھماکہ سا ہوا اور پھر تابوت کے ایک سرے پر ایک غیر انسانی ہاتھ نمودار ہوا۔ ہاتھ پر خون کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور یہ شیطانی ہاتھ ڈریکولا کا تھا۔

کلوڈ گھنٹوں کے بل کھڑا تھا۔ تہہ خانے میں ڈریکولا کی خوف ناک آواز گونجی اور اپنے آقا کا حکم سن کر کلوڈ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ایک طویل عرصے کے انتظار کے بعد اپنے آقا کی آواز سن رہا تھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ سیرھیاں چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل کر گیلری کی طرف چل پڑا۔ انہی سیڑیوں پر کچھ دیر پہلے ایلن چل کر تہہ خانے تک آیا تھا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

کلوڈ کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھپا لئے۔ پھر آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے سامنے جا کر سرگوشی کی۔ ”ہیلن!“ ہیلن نے سمجھا کہ شاید ایلن واپس آ گیا ہے، اس نے بے دھڑک دروازہ کھولا پھر کلوڈ کے اپنے سامنے پا کر ٹھٹھک گئی۔ ”مادام مجھے افسوس ہے لیکن ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ آپ کے شوہر کی حالت خراب ہے جلدی سے میرے ہمراہ چلئے۔“ کلوڈ جیسے کہیں دور سے بولا۔

ہیلن فوراً اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن کلوڈ سنی ان سنی کر کے آگے چلتا رہا۔ وہ تیزی سے تہہ خانے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کاؤنٹ ڈریکولا اپنے شکار کا منتظر تھا۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور ہاتھ سے ہیلن کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

ہیلن نے دیکھا کہ اس کے شوہر ایلن کی بغیر سر کی لاش رسی سے بندھی ہوئی الٹی ہوئی ہے ہیلن نے زور زور سے آنکھیں ملیں پھر جیسے وہ کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہی ہو، زور سے چیخی دور تک اس کی چیخ گونج کر رہ گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دیوانہ وار دروازے تک بڑھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اس جگہ سے فرار ہو جائے لیکن اسے راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ زینے

پر سیاہ دھاریوں والا سرخ چغہ اوڑھے ڈریکولا اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہیلن کا بازو جکڑ لیا۔ کلوڈ نے دیکھا اس کے آقا کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کے تیز نوکیلے دانت جڑوں میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ ہیلن نیم غنودگی اور بے ہوشی کے عالم میں اس کے بازوؤں میں کسمسار ہی تھی۔ ڈریکولا نے اسے اپنا شکار بنالیا تھا! پھر ڈریکولا کے تیز خون آشام دانت ہیلن کی خوبصورت گردن میں اترتے چلے گئے اور وہ تڑپتی رہی۔

☆.....☆.....☆

صبح ہو چکی تھی۔ چارلس ابھی تک سویا ہوا تھا کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ یہ ڈیانا تھی اور نہا دھو کر بے حد تروتازہ اور شاداب نظر آ رہی تھی۔ چارلس کو اکثر ڈیانا سے یہی شکایت رہتی تھی کہ بہت صبح سویرے اٹھ جایا کرتی ہے اور پھر اسے بھی جگا دیا کرتی ہے۔ وہ اس وقت بھی بہت چاق چوبند نظر آ رہی تھی۔

”ہوں کیا بات ہے؟“ چارلس نے ناگواری سے کہا۔ ”اٹھو بھی۔ دن کے گیارہ بج رہے ہیں، میں تم کو جگا جگا کر تھک چکی ہوں، خدا کے لئے اٹھو ایلن اور ہیلن دونوں غائب ہیں۔ وہ شاید جا چکے ہیں!“ ڈیانا کی آواز میں تفکر جھلک رہا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... کہاں جا چکے ہیں.....؟“ چارلس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ڈیانا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ”وہ چلے گئے ہیں سامان بھی جا چکا ہے۔ سب کچھ چلا گیا۔“ وہ زور زور سے رورہی تھی۔ چارلس نے صورت حال کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے چادر ایک طرف پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لوگ واقعی اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ کمرے میں بستر پر چادر بڑے سلیقے سے بچھا ہوا تھا۔ آتش دان میں راکھ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن یوں



لگتا تھا جیسے ایلن اور ہیلن بھی بیڈ پر لیٹے ہی نہ ہوں۔ ہر چیز بڑی عجیب اور پراسرار سی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں حیران تھے کہ آخر کلو کہاں جا کر دفنان ہو گیا۔ چارلس فوراً کمرے سے باہر نکلا اور گیلری کی سیڑھیاں اتر کر ہال کے وسط میں کھڑا ہو کر کلو کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو خون اس کی رگوں میں جمنے لگا۔ ڈیانا غائب تھی۔ ”اف خدایا! اس نے سوچا کیا لوگ یہاں ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔“

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا واپس کمرے میں آیا۔ ڈیانا جلدی جلدی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے ٹھونس رہی تھی۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو!“

”میں فوراً یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“ ڈیانا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”لیکن ایلن اور ہیلن کے بغیر ہی.....!“ چارلس نے پوچھا۔

”تو اور کیا وہ بھی تو ہم دونوں کو یہاں چھوڑ کر خود چل دیئے!“ ڈیانا نے بے نیازی سے کہا۔

اب کسی قسم کی بحث کرنی بے کار تھی۔ چارلس نے اس کا ہاتھ بنانا شروع کر دیا۔ ڈیانا زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ سوٹ کیس وزنی تھے پھر بھی دونوں میاں بیوی نے دو دو سوٹ کیس اٹھائے اور ڈمگاتے ہوئے پگڈنڈی پر چل پڑے وہ جلد از جلد اس بھیا تک قلعہ سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ پہاڑی کی ڈھلان سے اتر رہے تھے۔ ڈیانا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انجانی ان دیکھی قوت بار بار انہیں واپس قلعے کی طرف بلا رہی تھی۔

بالآخر وہ چوراہے پر پہنچے۔ دن کے وقت قلعہ اجنبیوں کے لئے خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔ چارلس سوچ رہا تھا اگر اس کے بھائی ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کو کچھ ہو گیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ ڈیانا

نے اس کے چہرے سے اس کے دل کی بات جان لی اور شدت سے اس بات کی مخالفت کرنے لگی کہ چارلس واپس چلا جائے۔

اس نے کہا۔ ”تمہیں میرا کوئی خیال نہیں۔ میری خاطر ہی سہی۔ تم واپس نہیں جاسکتے!“ ڈیانا کا دل بھرا آیا اور وہ سکھنے لگی۔

”اور ہیلن..... اور ایلن کا کیا بنے گا۔ ڈیانا ذرا سوچو تو سہی میں ان دونوں کو وہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں خدا خیر کرے وہاں کیا واقعات پیش آئے ہوں نہیں نہیں مجھے جانا ہی ہو گا.....!“ چارلس نے قطعی فیصلہ دے دیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں جوزف سباد جا کر لوگوں کو مدد کے لئے بلا لینا چاہئے! ڈیانا نے تجویز پیش کی۔

لیکن چارلس کو اس کی تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگ قلعہ کے تذکرے سے ہی خائف ہیں۔ کوئی اس بات کا ذکر بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ ہماری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔“ پھر اس نے ڈیانا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”جان من تم یہاں شام چھ بجے تک میری منتظر رہنا میں ہر قیمت پر چھ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ مجھے پراسرار معمہ ضرور حل کرنا ہے۔ آخر ہیلن اور ایلن کہاں جاسکتے ہیں۔“

ڈیانا بری طرح لرز رہی تھی۔ بے حد خائف تھی وہ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور چارلس اسے الوداعی سلام کر کے قلعہ کی جانب چل پڑا۔ چارلس قلعہ کے صدر دروازے سے ہو کر عمارت کے اندر گم ہو گیا اور ڈیانا جھوپڑی میں آ گئی۔ چارلس نے ایک بار پھر کمروں کا جائزہ لیا، لیکن اسے ایلن اور اس کی بیوی ہیلن کی گمشدگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس نے کچن اور صحن کے علاوہ دوسرے کمروں میں اچھی طرح جھانکا لیکن کسی آدم نہ آدم زاد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خالی کمرے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

ایک ایک ہال میں اس کا ہاتھ ایک دیوار سے لٹکے ہوئے پردے پر پڑا اور..... یہ ایک تہہ خانہ تھا،



اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی جو آگے جا کر تاریکی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً..... یقیناً ایلن اور ہیلن اسی تہہ خانے میں ہوں گے اس نے سوچا اور پھر دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں پایا۔ اوپر کی طرف ایک مچان پر بڑا سا تابوت رکھا تھا۔ وہ تابوت کے قریب گیا اس پر کاؤنٹ ڈریکولا کے الفاظ کندہ تھے۔

وہ اس ماحول سے خود کو خوف زدہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن تھیر اور بحس نے اسے مجبور کر دیا۔ اسی تابوت کے قریب ایک بڑا سا صندوق موجود تھا جس کا ڈھکنا کھلا تھا۔ اس نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا اور پھر تھیرا کر پیچھے ہٹا، ایلن کا بے جان اور سرد چہرہ اسے گھور رہا تھا۔ گردن بے حد غیر قدرتی انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے محسوس کیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ گردن اور دھڑ علیحدہ تھے۔ خون کے دھبے ایلن کے جسم اور کپڑوں پر جمے ہوئے تھے یوں لگتا تھا جیسے ایلن نے بے حد اذیت میں تڑپ تڑپ کر جان دی ہو۔

چارلس بڑے دل گردے والا آدمی تھا لیکن یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی کی ایک لہری اس کے ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں اور وہ زمین پر گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس نے بمشکل تمام اپنے حواس جمع کئے اور دوسرے تابوت کا ڈھکنا اٹھانے کی کوشش کی۔ تابوت کا ڈھکنا بہت وزنی تھا جو نہی اس نے ایسا کیا وہ پھسل کر دوسری جانب جاگرا اور ڈھکنا گرنے کی گونج تہہ خانہ میں پرہول سنائیے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ چارلس کو یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک سنسنی پھیل گئی ہے۔ اس کے سر میں ہتھوڑے سے بجنے لگے اور وہ خوف سے بری طرح کانپنے لگا۔

تابوت کے اندر سیاہ کفن میں ملبوس ایک بلند

قامت لاش رکھی تھی۔ اس کے دونوں استخوانی ہاتھ اس کے سینے پر دھرے ہوئے تھے۔ چارلس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی خبیث روح تھی۔ لاش کے چہرے پر بے حد مکروہ اور غلیظ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور دونوں بھینچے ہوئے جڑوں کے گوشوں میں نوکیلے تیز دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چارلس کو غش آ گیا جو نہی اس کی انگلیاں تابوت کے کونے سے ٹکرائیں تابوت میں لیٹے ہوئے عفریت نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

چارلس کو اپنی چیخ کی آواز دور کسی کنویں میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ جاگرا پھر گھٹن ہوا سیڑھیوں تک پہنچا اور بغیر مڑ کے دیکھے ہوئے تیزی سے گرتا پڑتا تہہ خانے سے باہر کی طرف دوڑا۔ وہ جلد سے جلد تہہ خانے سے نکل جانا چاہتا تھا وہ سمجھ رہا تھا اب اس کی جان پر بن گئی ہے۔

ادھر ڈیانا کافی دیر سے جھوپڑی میں آگ روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گیلی لکڑیوں کی وجہ سے اندر دھواں بھر گیا تھا اور اب رات کی تاریکی بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اس کا دل خوف کی وجہ سے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دور سے اسے گھوڑوں کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کی آواز قریب آتی سنائی دی اور اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

گھوڑے بالکل پرانے انداز میں بگھی کھینچتے ہوئے جھوپڑی کے قریب آ کر رک گئے، ڈیانا کی جان ہی تو نکل گئی۔ پھر جیسے کسی نے اسے سوتے سے چونکا کے جگا دیا ہو۔ جھوپڑی کے دروازہ کھلا اور کلو و اندر آیا۔ ڈیانا کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ”مجھے افسوس ہے مادام کہ میں نے آپ کو پریشان کیا آپ کے خاوند قلعہ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے ڈیانا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر بھی کادروازہ کھول دیا۔ ڈیانا نے غصے سے کلو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں پوچھتی ہوں وہ سب کہاں ہیں۔ ایلن چارلس، ہیلن آخر یہ سب کیا بکواس ہے؟“



کلوو نے احتراماً جھک کر کہا۔ ”آپ کے خاوند آپ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیں گے آپ تشریف لے چلے۔“

ڈیانا کے لئے اس کے سوا کوئی چار نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر قلعہ میں جائے۔ عین ممکن ہے چارلس سے اسے کچھ معلوم ہو سکے۔ وہ آگے بڑھی اور بجلی میں سوار ہو گئی۔ گھوڑے پھر برق رفتاری سے بجلی کو لئے ہوئے قلعہ کی طرف بڑھنے لگے۔

جونہی بجلی قلعہ کے اندر پہنچی۔ کلوو نے تیزی سے اتر کے بڑے ادب سے ڈیانا کے لئے دروازہ کھولا اور ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈیانا کو یوں لگا جیسے کلوو اس کا مذاق اڑانے کی حد تک مودب ہوا جا رہا تھا۔ ڈیانا ہال میں داخل ہوئی اور ہیلن کی بدلی ہوئی اجنبی سی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ”ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ تم کب تک لوٹو گی!“ ہیلن کی آواز بے حد مختلف اور عجیب سی تھی۔ ڈیانا کو یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

ہیلن سیڑھیوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے شب خوالی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں جیسے ابھی ابھی وہ نیند سے جاگی ہو۔ ڈیانا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیلن کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے چارلس کے بارے میں پوچھا۔ اور ہال کے وسط میں جا کر رک گئی۔ ”ہیلن، ایلن کہاں ہے یہ سب کیا ہے۔ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے؟“ ہیلن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”آؤ..... کوئی بات نہیں ہے؟“ لیکن ڈیانا پیچھے ہٹ گئی۔ ”چارلس کہاں ہے؟“ اس نے تشویش سے پوچھا.....

”کیا تم چارلس سے نہیں ملنا چاہتی ہو؟“ ہیلن نے کہا۔ ڈیانا نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہیلن نہیں تھی جسے وہ ایلن کی بیوی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اس کے چہرے پر غباشت اور شیطانیت کے سائے رقصاں تھے۔

وہ فوراً تیزی سے مڑی اور باہر کی طرف دوڑی۔ ہیلن زور سے ہنسی دروازہ بند تھا سرخ دھاریوں والا سیاہ چغہ پہنے ہوئے بلند قامت ڈریکولا نے اپنے بازو اکر دیئے اور ڈیانا کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھا، ہیلن اب بھی ہڈیانی انداز میں ہنس رہی تھی۔

ہیلن کی ہنسی کو نظر انداز کر کے ڈیانا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈریکولا کے چہرے پر پھٹروں کی بارش کر دی لیکن ڈریکولا نے اپنے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط کر دی۔

”ڈریکولا۔ اسے چھوڑ دو!“ یہ چارلس کی آواز تھی۔ ہیلن لپک کر دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی لیکن ڈیانا کی جان میں جان آئی کہ چارلس یہاں موجود تھا۔

ہیلن نے آگے بڑھ کر چارلس کا بازو تھام لیا..... ”پیارے میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں!“

چارلس ہیلن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا وہ بدستور ڈیانا کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ہیلن اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور ڈریکولا سے خود کو چھڑانے کے لئے ڈیانا جدوجہد کر رہی تھی۔

ہیلن کا چہرہ چارلس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے درندگی اور وحشت عیاں تھی۔ چارلس اس سے ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ڈیانا نے بمشکل تمام خود کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑایا اور تیزی سے چارلس کے پاس چلی گئی۔ وہ اس بھیاںک خواب سے بچنے کے لئے خود کو چارلس کی آغوش میں سمودینا چاہتی تھی۔

چارلس نے ڈیانا کو اپنے پیچھے چھپالیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی آنکھیں ڈریکولا پر سے نہیں ہٹائیں پھر وہ چیخا..... ”ڈیانا جاؤ.....“ کبھی لے کر یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤ.....“

”میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی!“ ڈیانا



نے کہا۔

”جو میں کہتا ہوں وہی کرو۔۔۔۔۔“ چارلس

پھر چلایا۔

ڈریکولا حالات سے بے نیازان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی بلی دو چوہوں کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہو۔ جیسے اسے یقین ہو کہ دونوں میں سے ایک چوہے کو شکار تو وہ کر ہی لے گی۔ ڈیانا اس عالم میں چارلس کو تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن چارلس نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ وہاں سے باہر کی جانب لپکی۔ ہیلن اب پھر ہنسی اور آگے جھپٹ کر ڈیانا کا بازو تھام لیا۔ دونوں عورتیں گتھم گتھا ہو کر فرش پر گر گئیں۔ ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چارلس نے ایک دو ہنٹر ڈریکولا کے سینے پر مارا لیکن وہ صاف وار بچا گیا۔ پھر جھک کر کسی بچے کی طرح چارلس کو اٹھالیا اور ہال کی دیوار سے دے مارا۔ چارلس کو خاصی چوٹیں آئیں تھیں وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا پھر بمشکل تمام اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریکولا ہنسا اور پھر اپنے شکار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چارلس نے بے بسی سے دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر کسی ہتھیار کی تلاش میں دیکھنے لگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک زنگ آلود تلواری پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے وہ تلوار اٹھائی اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے ڈریکولا پر ایک زور کا وار کیا۔ ڈیانا بدستور ہیلن سے لڑ رہی تھی، لیکن دونوں عورتوں کی نگاہیں ڈریکولا اور چارلس پر جمی ہوئی تھیں۔

ڈریکولا نے تلوار کا وار بچایا اور تلوار کا پھل اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ہی جھٹکے سے تلوار کھینچ لی اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ چارلس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ وہ تیزی سے چارلس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ چارلس بے بسی سے زمین پر گرجا جا رہا تھا۔

ڈیانا نے ایک چیخ ماری۔ وہ ایک جنونی عورت کی طرح ہیلن سے لڑ رہی تھی۔ وہ دونوں ہال کے وسط میں بری طرح لڑ رہی تھیں ڈیانا کی قمیض تار تار ہو چکی تھی اور جسم پر جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ یکا یک اس کے گلے میں لٹکی ہوئی سونے کی کراس ہیلن کے بازو سے ٹکرائی۔ اس بار ہیلن اور سے چیخی اس نے ہانپتے ہوئے ڈیانا کو چھوڑ دیا اور خوف زدہ ہو کر الگ ہٹ گئی۔

ڈیانا بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ اس نے کراس اپنے ہاتھ میں لی اور اسے ہیلن کی طرف بلند کیا۔ ہیلن تورا کر پیچھے ہٹی وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ چارلس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ ڈریکولا اب بڑے اطمینان سے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اسے اذیت اور تر کلیف میں دیکھ کر لطف اٹھا رہا تھا۔

ڈیانا چیخی۔۔۔۔۔“ چارلس ایک کراس بناؤ جس طرح بھی ہو سکے کہ اس کا نشان بنالو۔“ چارلس ایک طرف جھکا اور ٹوٹی ہوئی تلوار اٹھا کر اس کا نشان بنالیا۔ پھر اس نے یہ نشان ڈریکولا کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ ڈریکولا نے ایک بھیانک چیخ ماری اور چارلس کو چھوڑ کر دور ہٹ گیا۔ وہ بے حد خوف زدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیانا فوراً ہیلن کی طرف دیکھتی ہوئی دوڑ کر چارلس کے قریب پہنچی اور اٹھنے میں اس کی مدد کی۔ وہ دونوں کراس کے نشان اٹھائے ہوئے الٹے پاؤں چلتے ہوئے صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔ یکا یک ہال میں ایک دروازہ کھلا اور کلوو ایک تیز دھار چاقو لئے اندر داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ چاقو اٹھا کر وار کرتا چارلس نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار کا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا، کلوو کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور تلوار کا آدھا سرا اس کے سر میں گڑ گیا۔ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا۔

چارلس نے ڈیانا کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے ہال سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ باہر رات کی دھندلی تاریکی میں کبھی اور گھوڑے نظر آ رہے



تھے۔ بغیر ایک لمحہ ضائع کئے وہ دونوں کبھی میں سوار ہو گئے۔ چارلس نے لگا میں سنبھالیں اور گھوڑے برق رفتاری سے قلعہ سے باہر کی جانب دوڑنے لگے۔ قلعہ کے صدر دروازے میں انہوں نے دوسایوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھا۔ یہ ہیلن اور ڈریکولا تھے جو ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے راز و نیاز کر رہے تھے۔

کبھی بے حد تیز رفتاری سے سڑک پر بڑھکتی جا رہی تھی وہ جلد از جلد موت اور خوف کے اس قلعہ سے دور ہو جانا چاہتے تھے۔ ڈیانا کبھی میں بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور چارلس گھوڑوں کو تیز سے تیز دوڑانے میں مشغول تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں ڈریکولا کسی مافوق الفطرت طریقے سے گھوڑوں کو واپس نہ بلا لے۔

ڈھالان بہت تیکھی تھی۔ ایک موڑ پر کبھی مڑی تو بے قابو ہو گئی گھوڑے فضا میں اپنی انگلی ٹانگیں اٹھا کر ہنہنائے۔ کبھی کا توازن بگڑ گیا اور اس کے سپہ فضاء میں بلند ہو گئے ایک زوردار چیخ فضاء میں بلند ہوئی، یہ ڈیانا کی چیخ تھی جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ کبھی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو چکی تھی اور اب تیزی سے ڈھلان سے نیچے گہری اور تاریک کھائی میں گر رہی تھی۔ لیکن یہ سب ڈیانا کا واہمہ تھا۔ وہ کبھی سے باہر گر چکی تھی۔

پھر جیسے چاروں طرف ہولناک اندھیرا چھا گیا۔ ڈیانا کا جسم بری طرح کسی سخت اور نوکدار چیز سے ٹکرایا اور چھل گیا۔ وہ بے حد زخمی ہو گئی تھی اور بے ہوش ہو کر ایک طرف گر پڑی۔ ہر طرف پر اسرار اور ان سی خاموشی چھا گئی۔

رات کی تاریکی میں بھی خون کی سرخی کا گہرا رنگ شامل تھا۔ چارلس کا سر بری طرح چکرار ہاتھا۔ وہ بھیگی بھیگی گھاس پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔ اس کا سر بری طرح چکرار ہاتھا۔ پھر جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک ہی

سوال گونجنے لگا۔ ”ڈیانا۔۔۔ ڈیانا۔۔۔ ڈیانا کہاں تھی۔“ چند لمحوں تک وہ خالی الذہن ہو کر سوچتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ ڈیانا گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے ایک سسکی لی اور ڈیانا کے بے حس و حرکت زدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ خون اس کے جسم پر جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بولا۔ ”ڈیانا۔۔۔۔۔“ لیکن ڈیانا کے جسم کو کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے ڈیانا کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور یہ بات چارلس کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ چارلس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے ڈیانا کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا، لیکن وہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سوکھی ہوئی پیٹیاں اس کے قدموں تلے چبھ رہی تھیں وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور دل دہی دل میں ڈیانا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی، لیکن پھر بھی کوئی انجانی قوت اسے بار بار آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ڈیانا کا چہرہ زرد اور ستا ہوا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ لگا کر ڈیانا کے زرد اور سرد گال کو چھو کر دیکھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھگ گیا۔

اس لمحے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی انسانی سایہ اس پر جھک رہا ہو۔ اس نے کھڑے ہونا چاہا، لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

ویران سناٹے میں فادر شینڈور کی آواز گونجی۔ ”میرے بچے میں نے تمہیں پہلے ہی وارننگ دی تھی۔ میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ قلعہ کے پاس نہ جانا لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔“

چارلس بڑی دقت سے کھڑا ہوا ساری کائنات اسے گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ فادر شینڈور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تھام لیا۔ جب چارلس کو ہوش آیا تو وہ ایک نرم اور آرام



## زندگی کا فلسفہ

زندگی ایک حقیقت ہے، زندہ دل ایسے جیتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ شخص کتنا خوش ہے حالانکہ اس کے اندر غموں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ زندہ دل اپنے غم، دکھ، کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ زندگی کو صرف خوابوں کے سہارے نہیں گزارا جاسکتا ہے۔ خواب دیکھنا اچھی بات ہے۔ لیکن خوابوں میں اتنا ڈوبنا بھی نہیں چاہئے کہ زندگی مشکل ہو جائے۔ خواب تو تنزیل ہے۔ جس کا تعلق تنزل کی صورت میں اللہ تعالیٰ دکھاتا ہے۔ خواب چند لمحے تسکین تو دے سکتے ہیں۔ مگر زندگی کو اپنے زور بازو اور محنت سے کامیاب کیا جاسکتا ہے۔ یہی زندگی کا خوبصورت فلسفہ ہے۔

(عثمان غنی - پشاور)

لے کر ڈریکولا زندہ ہوا ہے۔ اب ہیلن اور کلو اس کے خاص کارندے بن چکے ہیں۔ یہ کہہ کر شینڈور نے ایک کتاب اٹھائی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”ڈریکولا خون آشام انسانوں کا آخری فرد باقی بچا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈریکولا مر چکا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا لیکن اسے زندہ کرنے کے لئے بھی کسی زندہ انسان کے خون کی ضرورت تھی اور یہ کام ایلن کے خون سے لیا گیا۔“

چارلس نے وعدہ کیا کہ ”وہ ہر قیمت پر ڈریکولا کو نیست و نابود کر دے گا۔“ فادر شینڈور نے اسے بتایا۔ ”اسے ختم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ دن کے وقت اس کی کمین گاہ تلاش کی جاسکتی ہے اور وہ تابوت میں لیٹا ہوا اسی میں اس کے سینے میں میخ گاڑ کر اسے ختم کیا جاسکتا ہے اسے براہ راست دھوپ یا سورج

وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ میں چند اور دوسری ضروریات زندگی رکھی تھیں اور ایک کونے میں چھوٹی سی میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ یہ کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا چارلس اس وقت کلین برگ کے گرجا گھر میں تھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ چیخا۔ ”ڈیانا..... ڈیانا کہاں ہے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش میں ایک بار پھر بستر پر گر پڑا۔

کمرے میں ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک راہب خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ ”مسٹر تمہاری بیوی خیریت سے ہے وہ بہت کمزور ہو گئی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے!“

”میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے بے یقینی سے کہا چند دنوں میں اس پر جو قیامتیں گزر گئی تھیں انہوں نے اس کے دل میں ہر بات کا اعتما د ختم کر دیا تھا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم قطعی مطمئن رہو۔ وہ جیسے ہی اٹھے گی۔ میں فوراً تمہیں اس سے موادوں گا!“ راہب نے بڑے یقین سے کہا۔

پھر اس نے چارلس کو بتایا کہ فادر شینڈور اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں وہ لباس تبدیل کر کے اور تازہ دم ہو کر ان کے پاس چلا جائے۔ خود چارلس کو بھی شینڈور سے ملنے کا اور اس موضوع پر تفصیلی بات چیت کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور فادر شینڈور کی اسٹڈی روم میں اس سے ملنے جا پہنچا۔

اس نے فادر شینڈور کو ساری رام کہانی کہہ سنائی ”ہونہہ“ فادر شینڈور نے سختی سے دانت بچھتے ہوئے کہا۔ ”تو ڈریکولا دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بنی نوع انسان پر ایک بار پھر مردہ خبیث عفريتوں کا راج ہو رہا ہے۔“

فادر شینڈور نے چارلس کو خون آشام درندوں کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ غول کی شکل میں رہتے ہیں۔ تمہارے بھائی کی جان



کی شعاعوں کے سامنے لا کر ختم کیا جاسکتا ہے۔ کراس کے ذریعے جلا کر ہلاک اور خاکستر کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ اسے تباہ کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ وہ غیر فانی ہرگز نہیں ہے۔“

فادرشینڈور نے چارلس کو بتایا کہ ”یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ قلعہ سے متعلق بہت سے لوگ ڈریکولا کی مدد کریں گے اور ویسے بھی اس کا خاص مصاحب کلود ہر قیمت پر اپنے آقا کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھے گا۔“ شینڈور نے کہا۔ ”ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ خون آشام انسان بڑھنے نہ پائیں۔ انہیں محدود رکھنے اور ختم کرنے کے لئے ڈریکولا کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ اس حیوانی نسل کے خاتمے میں ہی بنی نوع انسان کی عافیت ہے۔“

پھر شینڈور چارلس کو ڈیانا کے پاس لے گیا۔ چارلس نے محسوس کیا کہ خون آشام لوگوں سے بچنے کے لئے اس گر جاگھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں تھی! ڈیانا ایک پلنگ پر ہلکا سا کمبل اوڑھے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی زردی موجود تھی۔ چارلس کا دل بھر آیا۔۔۔۔۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی اس نے تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر فادرشینڈور کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ”آپ۔۔۔۔۔ آپ تو کہہ رہے تھے وہ بالکل ٹھیک ہے!“

”ہاں میرے بچے میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد وہ اس قابل ہو جائے گی کہ تم اس سے دل بھر کر باتیں کر سکو! تمہیں فکر مند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں جو یہاں ہوں۔!“

چارلس چند لمحوں کے کچھ سوچتا رہا، پھر یک لخت اس نے پشیمان ہو کر فادر کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

اسی گر جاگھر کے ایک راہب لڈوگ نے بھی چارلس کو تفصیلی طور پر ان سب باتوں کے بارے میں بتایا کہ ”کس طرح خون آشام درندے دن کے وقت

اپنی کمین گاہوں میں آرام کرتے ہیں اور کیسے رات کے وقت تاریکی میں اپنے شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔“

اسی دوران برادر مارک (ایک اور راہب) نے فادرشینڈور کو کسی گاڑی بان کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”فادر ایک گاڑی بان آیا ہے وہ کہتا ہے میں بہت تھکا ہوا ہوں رات یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔“

فادرشینڈور مسکرایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”درست ہے عام حالات میں شاید گر جاگھر کے دروازے ہر آدمی کے لئے ہر اجنبی کے لئے کھلے تھے۔ لیکن اب حالات بہت سنگین اور مختلف ہیں۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہو سکتا ہے رات کو ڈریکولا ادھر آنکے لیکن وہ اندر گر جاگھر میں آنے کی جرأت ہرگز نہیں کر سکے گا۔“

پھر اس نے چارلس سے کہا۔ ”گزشتہ شب ڈریکولا اپنے شکار یعنی ڈیانا سے محروم رہ گیا تھا۔ ہیلن بھی اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی تھی۔ اس لئے وہ ڈیانا کو اپنا شکار بنانے کے لئے تڑپ رہا ہوگا۔ بہر حال اگر وہ یہاں آ بھی گیا تو اندر نہیں آئے گا۔ تم نے دیکھا ہوگا اس قصبے کے لوگ کس قدر احقانہ انداز میں سوچتے ہیں۔ محض لہسن کے پھول ہی لٹکا دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پہلے ہی عمارت میں موجود کوئی بدروح کسی خون آشام کو بلانا چاہے تو پھر دنیا بھر کے لہسن کے پھول بھی اسے وہاں آنے سے نہیں روک سکتے۔“

کچھ وقت گزرنے کے بعد چارلس دوبارہ اپنی بیوی ڈیانا کو دیکھنے گیا وہ ابھی تک آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ چارلس اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈیانا نے آنکھیں کھولیں اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی اس نے چارلس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے گال کے ساتھ رگڑ کر رونے لگی۔ چارلس نے جھک کر اس کے بال چوم لئے۔ گھر جانے کا تذکرہ سن کر ڈیانا کے چہرے پر رونق آئی، لیکن جب چارلس نے دوبارہ اسے بتایا کہ وہ واپس قلعہ میں ایک بار ضرور جائے گا



اور ڈریکولا سے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لے گا۔  
 ”وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی.....“ نہیں نہیں تم  
 ہرگز وہاں نہیں جاسکتے۔ میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں  
 وہاں نہیں جانے دوں گی۔ وہ بری طرح بلک بلک  
 کر رہی تھی۔

فادر شینڈور نے کمرے میں آ کر اسے  
 دلاسا دیا۔ ”چپ ہو جاؤ میری بچی اس حالت میں تمہیں  
 زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ تم سکون سے  
 سو جاؤ۔“ پھر فادر نے چارلس کا بازو تھاما اور اسے باہر  
 لے گیا۔ ڈیانہ نے انہیں آواز دینی چاہی پھر تھک کر اپنا  
 سر تکیے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فادر نے چارلس سے کہا کہ ”وہ جا کر سکون سے  
 سو جائے۔ گر جا گھر ایک قلعہ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ  
 ہے اور اسے یا اس کی بیوی ڈیانہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“  
 باہر برف گر رہی تھی اور ہر طرف ہوکا عالم طاری  
 تھا۔ رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔  
 دروازوں کو سختی سے بولٹ کر دیا گیا اور کھڑکیوں پر  
 پردے گرا دیئے گئے تھے۔

ڈیانہ کے لئے یہ پناہ گاہ ایک قید خانہ بن کر رہ گئی  
 تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دوبارہ  
 ڈریکولا کے قلعہ میں قید کر دی گئی ہو۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی  
 اوپر چھت کی طرف نمٹتی باندھے گھور رہی تھی کہ کھڑکی  
 کے شیشوں پر کسی کی دستک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے  
 تین بار کھڑکی پر دستک دی۔ ڈیانہ خوف زدہ ہو کر کھڑکی  
 کی طرف دیکھنے لگی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔  
 باہر ہلکی ہلکی دھند سی تھی اور اس دھند میں کھڑکی  
 کے قریب ایک بیمار اور ستا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ہیلن  
 تھی۔ ڈیانہ کا پنپنے لگی وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ساکت سی  
 ہوئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز اس کا ساتھ  
 نہیں دے رہی تھی۔

”پلیز..... پلیز۔“ ہیلن کے خون آلود ہونٹ  
 کانپے، ڈیانہ بیڈ سے اتری۔ اس کے پاؤں ٹھنڈے  
 فرش پر لگے تو اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈیانہ

کسی غیر مرئی کشش کے زیر اثر کھڑکی کے قریب کھنچتی  
 چلی گئی۔ ہیلن کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کی آواز شیشوں  
 میں سے سرگوشی کی طرح اندر آرہی تھی۔ ”پلیز..... ڈیانہ  
 میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ مجھے اندر آ جانے دو میری  
 اچھی بہن باہر بہت سردی ہے میں مرجاؤں گی؟“

ڈیانہ جھجکی وہ سوچ رہی تھی کاش اس وقت  
 چارلس یا فادر شینڈور اس کے قریب ہوتے، ہیلن  
 بدستور آواز دینے میں مصروف تھی۔ اب سب ٹھیک  
 ہو گیا ہے میں ڈریکولا کی قید سے فرار ہو گئی ہوں۔ مجھے  
 بچا لو مجھے اندر آنے دو! ہیلن پھر گھکھائی۔

ڈیانہ نے بے اختیار کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔  
 برفانی ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا اور ایک تیز طرار بلی کی  
 طرح ہیلن لپک کر اندر آئی۔ اندر آتے ہی اس نے  
 سفاکی اور درندگی سے ڈیانہ کی کلائی جکڑ لی اور اس سے  
 پہلے کہ ڈیانہ چیخ سکتی۔ اپنے دانت اس کی کلائی میں گاڑ  
 دیئے۔ ڈیانہ زور سے چیخی۔ ہیلن نے اس کا بازو چھوڑ دیا  
 اور جیسے فضا میں تحلیل ہو گئی۔

اسی لمحے کھڑکی کے فریم میں ڈریکولا کا خبیث  
 سراپا نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے  
 تھے جیسے ڈیانہ کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے بے  
 تاب ہو۔

ڈیانہ فرش پر گرنے لگی اس نے خود کو چارلس کے  
 بازوؤں میں گرا ہوا پایا کیا ہوا؟ یہ فادر شینڈور کی آواز تھی  
 فادر نے آگے بڑھ کے کھڑکی بند کر دی۔ پھر وہ مڑا  
 اور ڈیانہ کے دونوں شانے پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا  
 وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ ڈیانہ نے بے بسی سے  
 اپنی کلائی فادر کی طرف بڑھادی۔ چارلس کی آنکھیں  
 فرط حیرت اور خوف سے باہر کی جانب اٹلی ہوئی تھیں۔

فادر شینڈور نے چارلس سے ڈیانہ کو تھامنے کے  
 لئے کہا۔ ڈیانہ کی کلائی پر دانتوں کے دو گہرے نشان تھے  
 جن پر خون کی دو بوندیں سرخ یا قوت کی طرح چمک  
 رہی تھیں۔ فادر نے کونے میں رکھا ہوا الیمپ اٹھایا اور ان  
 نشانوں پر الیمپ کی لور کھدی۔ ڈیانہ کا چہرہ درد اور تکلیف



بڑھا۔ جونہی ڈیانا اندر داخل ہوئی اس نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

دیوار کی طرف منہ کئے..... ڈریکولا..... کھڑا تھا۔ ڈیانا کا منتظر اور عیا ڈریکولا مڑا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور اپنی مقناطیسی آنکھیں ڈیانا کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ڈیانا بے بسی کے عالم میں اس کی مقناطیسی آنکھوں والی قوت سے مسحور اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈریکولا نے ہاتھ بڑھایا اور سامنے سے ڈیانا کی قمیض ناف تک پھاڑ دی۔ پھر اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا سینہ لہولہا کر دیا۔ ڈیانا کی چھاتیوں سے خون رسنے لگا۔ ڈریکولا نے اپنا بازو ڈیانا کی کمر میں حائل کر دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا سر اس کے سینے پر جھکا دیا۔ پھر اس نے اپنے بھیا نک اور خبیث ہونٹ ڈیانا کے سینے پر رکھ دیئے۔ خون کا تیز ذائقہ اس کی زبان پر چر کے لگانے لگا۔

ڈیانا اب اپنے آپ کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنی پوری قوت یکجا کر کے مدد کے لئے چیخی، دور گر جا کے کسی کونے میں چارلس کی آواز ابھری۔ ”ڈیانا..... ڈیانا!“ پھر کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور فرش پر شیشے کی کرچیاں بکھرنے لگیں۔ یہ سب کچھ ڈیانا کو ایک بھیا نک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

ڈریکولا اسے دور بہت دور لئے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ چارلس کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس سے کبھی نہ مل سکے گی۔ ڈریکولا کی جہنمی رفاقت اور شیطانی دنیا اس کی منتظر تھی۔ اس نے ایک اور چیخ ماری اور اس کی چیخ راہداری میں دور تک گونجتی چلی گئی۔ فادر شینڈ ور چارلس کو لئے ہوئے گر جا گھر کے صحن میں چلا آیا یہاں ایک بگھی پر دو تابوت رکھے ہوئے تھے۔ ان تابوتوں میں فادر نے دو کراسیں رکھ دیں تاکہ دن کے وقت ڈریکولا اور ہیلن اپنی کمین گاہوں کو استعمال نہ کر سکیں۔ فادر شینڈ ور نے بڑی

کی شدت سے سیاہ ہو گیا، یہ تکلیف اور اذیت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ خود کو چارلس اور فادر کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے تڑپنے لگی۔ ”فادر بس کیجیے۔ خدا کا واسطہ اس پر رحم کیجیے۔“ چارلس نے شینڈ ور سے التجا کی لیکن فادر شینڈ ور ڈیانا اور چارلس کی التجاؤں اور چیخوں سے بے نیاز اپنے کام میں تندی سے مگن رہا۔ سرد ہوانے زخم میں جیسے مرچیں سی بھر دیں تھیں اور اب آگ سے جھلس جانے کے بعد جلد میں خوف ناک جلن ہو رہی تھی! ڈیانا نے ایک سسکی لی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ذرا ہوش آیا تو برادر مارک اور فادر شینڈ ور اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی کلائی میں اب پہلی سی آگ نہیں تھی۔ اس پر کوئی ملائم ٹھنڈی اور سکون بخش سی مرہم لگا دی گئی تھی۔ ”کیا گر جا گھر میں کوئی اور اجنبی موجود ہے؟“ فادر شینڈ ور نے سختی سے پوچھا۔ برادر مارک نے نرمی سے انکار میں سر ہلایا۔ ”ہم نے آپ کے احکامات پر سختی سے عمل کیا ہے۔“ پھر مارک جھک کر ڈیانا کی کلائی پر پیٹی باندھنے لگا۔ اور فادر شینڈ ور چارلس کو مطمئن رہنے کی تسلی دینے لگا۔ ”خطرہ ٹل گیا ہے میرے بچے، ڈیانا بالکل ٹھیک ہے تم کوئی فکر نہ کرو۔“ شینڈ ور کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

شینڈ ور اور چارلس کے جانے کے بعد کمرے میں ڈیانا کے پاس بچھی ہوئی ایک کرسی پر برادر مارک بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مارک نے دروازہ کھولا لولڈوگ اندر آیا۔ اس نے بتایا کہ ”شینڈ ور نے ڈیانا کو اپنی اسٹڈی میں بلایا ہے۔ وہ اور چارلس ڈیانا کو کسی خاص معاملے پر بات چیت کرنے کے لئے وہاں بلا رہے ہیں۔“ مارک نے اس بات پر احتجاج کیا، لیکن فادر شینڈ ور کے حکم سے سرتابی کی مجال اسے نہیں تھی۔ بادل نخواستہ اس نے ڈیانا لولڈوگ کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی لڈوگ تیزی سے ڈیانا کو لے کر فادر شینڈ ور کی اسٹڈی کی طرف



سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے کوچوان کو گھر جا گھر کے باہر بھی آخر کیوں ٹھہرنے دیا۔ یہ سب کچھ اس مردور ڈریکولا کے خبیث ملازم کلوو کا کیا دھرا ہے۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ ہیلن بھی یہیں کہیں چھپی ہوگی۔ ہمیں جلد از جلد اسے بھی تلاش کرنا ہواگ۔ اگر اس سے پہلے اس نے کسی اور کو کاٹ لیا تو وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہو جائے گا۔ ہم اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتے۔“

اسی اثناء میں دو پادریوں نے آ کر بتایا کہ ”ہیلن کو تلاش کر لیا گیا ہے وہ اصطبل میں چھپی ہوئی تھی۔“

فادرشینڈور نے ہیلن کو لڈوگ کے تہہ خانے میں لے جانے کا حکم دیا اور چارلس کو لے کر پھر گر جا کی طرف چل دیا۔ اندر پہنچ کر جو نہی چارلس کی نگاہ ہیلن کے دہشت ناک چہرے پر پڑی وہ ہر چیز بھول گیا۔ اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی یہ کسی زندہ عورت کا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی مانند تھی، اپنی ان دیکھی قوتوں کے ساتھ خود کو چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ چار آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آخر اسے کھینچ کر ایک چوڑی سی میز پر گرا دیا گیا۔

چارلس نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس نظارے کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ فادرشینڈور نے کونے میں رکھی ہوئی تقریباً ایک فٹ لمبی لکڑی کی نوکیلی اور تیز میخ اٹھائی اور ہیلن کی بائیں چھاتی پر دل کے قریب رکھ دی پھر آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کچھ دعائیں پڑھیں اور کونے میں رکھی ہوئی وزنی ہتھوڑی اٹھا کر فضا میں بلند کی، ایک بھیا تک چیخ نے پوری عمارت کو لرزادیا۔ چارلس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھوس لیں ہیلن کا جسم بجلی کی تنگی تاریکی طرح تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس دوسرے پادریوں کے ساتھ ہیلن کی لاش کے قریب گیا، اب وہ بے حد پرسکون نظر آ رہی تھی

اس کے چہرے پر ایک معصوم اور دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور اس جہنمی ہیلن کا کوئی پتہ نہ تھا جو چند لمحے پہلے ان لوگوں سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی؟ ابھی وہ لوگ کمرے سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ فادرشینڈور کا پاؤں لوہے کی ایک سلاخ سے ٹکرایا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ ”ہونہہ۔“ تو یہ لڈوگ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ ”شینڈور نے کھڑکی سے اکھڑی ہوئی سلاخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ لوگ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ دور گر جائیں کسی کی چیخ نے ان کے قدم روک لئے۔ یہ ڈیانا کی آواز تھی۔ چارلس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ سب تیزی سے اندر کی طرف دوڑے، فادرشینڈور نے اپنی اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔ اندر ڈریکولا ڈیانا کو اپنے بازوؤں میں سنبھالے کھڑکی سے باہر کودنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایک زقند لگائی اور باہر کھڑی ہوئی کبھی میں چڑھ گیا۔ کوچوان کی سیٹ پر کوئی آدمی منہ ڈھانپے بیٹھا تھا۔ یہ کلوو تھا جو اپنے آقا کی خدمت بجالانے کے لئے یہ کبھی یہاں لایا تھا۔ ڈریکولا نے تیزی سے ڈیانا کو کبھی میں پھینکا اور کلوو کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے گھوڑوں کی لگا میں سنبھال لیں، چابک فضا میں لہرایا اور گھوڑے برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ کچھ فاصلے پر لڈوگ کھڑا ڈریکولا سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی ہمراہ لئے جائے، لیکن ڈریکولا نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ایک طرف اونڈھے منہ جاگرا اور ذرا سی دیر میں کبھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

فادرشینڈور نے لڈوگ کو مارک اور دوسرے لوگوں کے حوالے کیا اور چارلس کے ہمراہ اندر گر جا گھر میں آ گیا۔ ”اس وقت صبح ہونے والی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دن کے اجالے میں ڈریکولا اپنے تابوت میں آرام کرے گا اور یہ تابوت کلوو اس کے لئے تیار کرے گا۔ جب تک شام کی تاریکی نہ پھیل جائے ڈریکولا ڈیانا کے پاس نہیں جائے گا۔ اس وقت تک کلوو ڈیانا کا پہرہ



دیتا رہے گا۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ڈریکولا کا قلعہ یہاں سے پورے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔“

پھر شینڈور نے چارلس کی رائفل بھری اور اسے دے دی۔ پھر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کلو کو ہم اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکیں۔ بہر حال ہمیں کچھ اور میٹھوں کی ضرورت بھی ہوگی تم اور مارک گھوڑے سنبھالو اور میں اپنی تیاری کرتا ہوں۔“

دن کی روشنی آہستہ آہستہ ہر طرف پھیل رہی تھی اس ہلکے اجالے میں آگے بڑھتے ہوئے کبھی کے نشانات انہیں باآسانی نظر آ رہے تھے۔ چارلس کے دل و دماغ میں سوائے ڈیانہ کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ وہ بدستور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چارلس بہت تیزی سے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اس کے دل کو عجیب سی بے چینی اور بے قراری نے گھیر رکھا تھا، انہیں سفر کرتے ہوئے دوپہر ہو گئی تھی۔ گھوڑے تھک کر بری طرح ہانپ رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت روشنی آہستہ آہستہ کم ہونی شروع ہو گئی۔ چارلس نے سسکی لی۔ ”ہم وہاں کبھی نہیں پہنچ سکیں گے..... اف میرے خدایا..... ڈیانہ کی حفاظت کرنا۔“

کبھی ناقابل یقین رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شینڈور نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے ڈھلان کو دیکھا اور گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ برف پوش پہاڑوں سے اتر کر ان ڈھلوانوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فادر شینڈور اور چارلس نے اپنے گھوڑے درختوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ابھی وہ سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ قلعہ کی طرف جانے والی سڑک پر کبھی کے پہیوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز ابھرنے لگی۔ کبھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ کلو اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے کبھی پر تابوت رکھے ہوئے تھے۔ چارلس نے رائفل کا رخ کلو کی طرف کر دیا۔ کلو کا منہ اس غیر متوقع صورت حال پر کھلا رہ گیا۔ اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں، شینڈور نے اسے کبھی سے نیچے آنے کا حکم دیا۔ لیکن کلو اپنی سیٹ پر

سے ہلے بغیر ہی پلک جھپکتے میں شینڈور کی طرف کود کر لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر تھا۔ چارلس نے فوراً ٹریگر دبا دیا۔ گولی کلو کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر آگرا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگرا۔ دونوں گھوڑے کبھی کو کھینچتے ہوئے برق رفتاری سے ان کے قریب سے گزرے اور قلعہ کی طرف چل دیئے۔ بجلی کی سی تیزی سے چارلس اور فادر شینڈور نے اپنے گھوڑے کھولے اور کبھی کے تعاقب میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

کبھی ایک طرف کو جھکی اور اس پر رکھا ہوا ایک تابوت زمین پر جاگرا۔ چارلس اور شینڈور نے اپنے گھوڑے روکے اور تابوت کے قریب جا کر اس کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ تابوت میں ڈیانہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ چارلس نے سمجھا کہ شاید وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہو چکی ہے۔ لیکن اسی لمحے ایک آنسو ڈیانہ کے رخسار پر بہہ نکلا اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس اس کی طرف لپکا۔ لیکن فادر نے اس کا بازو تھام لیا۔ ”تم جاؤ میں اس کی حفاظت کروں گا! جاؤ جلدی کرو روشنی کم ہوتی جا رہی ہے۔“ شینڈور نے تقریباً چیخ کر کہا۔

چارلس زمین پر گرے ہوئے دوسرے تابوت کی طرف بڑھا۔ تابوت برف کی موٹی سی تہہ پر پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈریکولا کا تابوت تھا ڈریکولا رات اور تاریکی کے سحر کا عفریت۔

اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ چارلس تابوت کے قریب پہنچا اور دونوں کندھے کھول دیئے۔ فادر شینڈور پل کے قریب ڈیانہ کے ہمراہ کھڑا ہوا تشویش ناک انداز میں چارلس کی طرف ٹٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا۔ لوہے کی طرح سرد اور سخت انگلیاں چارلس کے ہاتھ سے ٹکرائیں۔ ڈیانہ نے ایک زوردار چیخ ماری چارلس نے قدم جمائے تاکہ



ڈریکولا سے دست بدست لڑائی کر سکے۔

”گولی چلاؤ..... تم گولی کیوں نہیں چلاتے!“ فضا میں ڈیانا کی چیخ گونجی۔ لیکن چارلس جانتا تھا کہ گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا چارلس نے دیکھا کہ ڈیانا نے شینڈور کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ اسی دوران ڈریکولا تابوت سے باہر آچکا تھا اور اب اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ پوری طرح چارلس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

ڈریکولا نے چارلس کا بازو جکڑ لیا اور اسے برف پر گھسیٹنے لگا، گولی چلنے کی آواز آئی اور ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک تو دسے میں بڑا سا شگاف پڑ گیا۔ پانی کا ایک فوارہ اس شگاف میں سے پھوٹنے لگا۔ فادر شینڈور چلایا۔ ”ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے ایک گولی اور چلاؤ.....“ اور ڈیانا نے لگاتار فائرنگ کرنی شروع کر دی۔ وہ اندھا دھند گولیاں برس رہی تھیں۔

ڈریکولا نے چارلس کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر فادر شینڈور اور ڈیانا کو زور سے دھکا دیا۔ اسی دوران ایک گولی اور چلی۔ چارلس برف پر پھسل کر گرا پھر اٹھ کر دوڑا اور پھر گر پڑا اگر تا پڑتا وہ ڈیانا اور شینڈور کی مدد کے لئے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جونہی وہ ڈریکولا کے نزدیک پہنچا۔ برف کا تو دہ گرنے کی کراخت آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ جگہ جہاں ڈریکولا کھڑا ان لوگوں پر نیا حملہ کرنے کے لئے پرتول رہا تھا ایک بھیاٹک آواز کے ساتھ شق ہو گئی۔ ڈریکولا ڈوبنے سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ایک اور گولی چلی برف کا ایک اور تو دہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا تو نیچے سے تھنڈا پانی ابل ابل کر اوپر آ رہا تھا۔

جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے اور ہر طرف پانی کے فوارے ابل رہے تھے۔ چارلس بری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اوپر ڈیانا کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ شیطانی طاقتوں سے برسر پیکار رہنے کے بعد اس

میں اب پل تک جانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

شینڈور نے بندوق ڈیانا کے ہاتھ سے چھین لی اور نشانہ لے کر ایک اور دھماکہ خیز فائر کیا۔ اس بار گولی بہترین جگہ پر لگی کہ برف کا وہ تو دا جس پر ڈریکولا کھڑا تھا۔ درمیان سے شق ہو گیا، خون آشام ڈریکولا نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور اپنی استخوانی بانہیں پل کی طرف پھیلا دیں۔ وہ اس چھوٹے سے پل کا کوئی نہ کوئی سرا پکڑنے کے لئے بری طرح کوششیں کر رہا تھا لیکن موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔

ڈیانا نے شینڈور کی مدد سے چارلس کے بازو دھامے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ڈریکولا تاریکی کا عفریت بے بسی اور لا چاری سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ برف درمیان سے چنختے ہی وہ نیچے ہی نیچے کھینچا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے برف کے پانی پر اس کا مکروہ چہرہ سطح پر ابھرا۔ اس نے منہ کھولا اور بھیاٹک انداز میں بین کرنے لگا جیسے وہ ہزاروں بدروحوں کو اپنی مدد کے لئے پکار رہا ہو۔

پھر پانی کا ایک زوردار ریل آ یا اور ڈریکولا برف کے اس بھنور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا۔ برف کا بڑا سا گلشیئر تیرتا ہوا اس خلا میں آ گیا اور برف کی سطح برابر ہو گئی چارلس، ڈیانا اور شینڈور بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جو کہ اب ڈریکولا کا مدفن بن چکی تھی۔

وہاں اب سطح پر سرخ دھاریوں والا ایک سیاہ چغہ تیر رہا تھا۔ وہ لوگ سوچ رہے تھے۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ کارپتھیا کا یہ عفریت مکمل تباہی سے اب بھی بچ نکلا ہو۔“ لیکن کچھ لمحے بعد برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے وجود نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا کہ کاؤنٹ ڈریکولا ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی نہ آنے کے لئے جا چکا تھا اس جہنم میں جہاں ہزاروں بدروحیں خدا کے عذاب میں گرفتار اس کے خیر مقدم منتظر تھیں۔





# کمرہ نمبر 78

ضرغام محمود۔ کراچی

تین سال پہلے مردے کو دفنایا گیا تھا مگر اچانک ایک روز وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر روبہ صحت موجود تھا، دیکھنے والا کسی صورت بھی اپنی آنکھیں جھپک نہیں سکتا تھا، حقیقت کھانی میں موجود ہے۔

دماغ میں نہ آنے والا حیرتناک اور خوفناک واقعہ مگر حقیقت کو دیکھ کر کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا

انتظار نے جلدی سے اپنی گاڑی کو اس جگہ پارک کیا جہاں سے تھوڑی دیر قبل ہی لال گاڑی نکل کر گئی تھی، گاڑی پارک کرنے کے بعد دونوں بھائی گاڑی سے نیچے اترے اور ہسپتال کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھے، ہسپتال کے دروازے کے سامنے پہنچ کر انتظار نے منتظر کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”منتظر۔۔۔ گلدستہ کہاں ہے؟“

”ارے۔۔۔ گلدستہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو گاڑی ہی میں رہ گیا۔۔۔ بھائی۔۔۔“ منتظر نے بوکھلا کر جواب دیا تو انتظار کا منہ بن گیا۔

”جاؤ جلدی سے گلدستہ لے کر آؤ۔۔۔“ انتظار نے گاڑی کی چابی منتظر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو منتظر نے اپنے بھائی کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لی اور دوڑتا ہوا واپس پارکنگ ایریا کی جانب چلا گیا، تھوڑی دیر میں منتظر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خوبصورت گلدستہ تھا۔ انتظار کے پاس آ کر منتظر نے گاڑی کی چابی اپنے بھائی کو واپس کی، چابی لیتے ہی انتظار نے ہسپتال کے اندرونی حصے کی جانب اپنے قدم بڑھا دیئے، منتظر بھی گلدستہ سنبھالتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے پیچھے چل دیا۔

**انتظار** رضانے اپنی گاڑی سٹی ہسپتال کے پارکنگ کی جانب موڑی اور پارکنگ ایریا میں داخل ہو گیا۔

”اوہ۔۔۔ پارکنگ تو مکمل بھری ہوئی ہے یہاں تو گاڑی کھڑی کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔“ انتظار نے پارکنگ ایریا میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے برابر بیٹھے اپنے چھوٹے بھائی منتظر سے کہا۔

”واقعی بھائی۔۔۔ پارکنگ میں تو کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم اپنی کار پارک کر سکیں۔“ منتظر نے گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ہسپتال کی پارکنگ میں ہر طرف مختلف اقسام کی گاڑیاں کھڑی تھیں، ابھی دونوں بھائی اپنی گاڑی پارک کرنے کے لئے جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے کہ اچانک منتظر بول اٹھا۔

”بھائی۔۔۔ وہ دیکھئے۔۔۔ وہ لال کار باہر نکل رہی ہے۔۔۔ آپ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر گاڑی پارک کر سکتے ہیں۔۔۔“ منتظر نے اپنے بڑے بھائی کی توجہ پارکنگ ایریا کے ایک جانب دلاتے ہوئے کہا جہاں سے ایک لال رنگ کی کار گاڑیوں کے جھوم سے باہر نکل رہی تھی۔





کرنے کے لئے یہاں تک آئے تھے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ہسپتال سے جا چکا ہے۔ دونوں بھائی دیر سے ہسپتال آنے کے لئے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، منتظر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ سامنے رکھی بیچ پر رکھ دیا، دونوں بھائیوں کے چہرے کا تبادلاً آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور ان کے سانس بھی معمول پر آ گئیں پھر منتظر نے ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا اور ایک انوکھے جذبے کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ دباتے ہوئے دیکھی مگر پر جوش آواز میں بولا۔

”بھائی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ وہ ہی وارڈ نہیں ہے۔۔۔“

”آ۔۔۔ ہاں۔۔۔“ انتظار ایسا لگا جیسے گہری

نیند سے جاگا ہو اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھیچ لیں پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور وارڈ کو چاروں طرف سے دیکھنے لگا اس کی نظریں ہر کمرے کے دروازے پر چند لمحوں کے لئے رکتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔

”وہ۔۔۔ وہ کمرہ۔۔۔ کونے والا۔۔۔ ہاں

۔۔۔ کیا نمبر تھا۔۔۔ ہاں یاد آیا اٹھتر نمبر کمرہ۔۔۔ ہاں کمرہ

نمبر 78 تھا۔۔۔“ انتظار غائب دماغی کی عالم میں

”کون سے فلور پر ہیں عبدالحلیم صاحب؟“ چلتے

چلتے انتظار نے منتظر سے پوچھا۔

”سیونٹھ فلور پر۔۔۔“ منتظر نے اپنی سانسیں

درست کرتے ہوئے جواب دیا، پارکنگ ایریا تک بھاگ کر جانے اور واپس آنے کی وجہ سے منتظر کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

دونوں بھائی انتظار اور منتظر ہسپتال میں اپنے ایک کولیگ کی عیادت کے لئے آئے تھے جو کچھ دنوں پہلے ہی السر کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ منتظر سے سیونٹھ فلور کا سن کر انتظار سر ہلاتے ہوئے لفٹ کی جانب بڑھا منتظر بھی بیماری سا گلدستہ سنبھالتے ہوئے بھائی کے پیچھے لفٹ کی جانب چل دیا۔ لفٹ کے سامنے پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ لفٹ خراب ہے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ زینہ استعمال کیا جائے اور سیڑھیاں چڑھ کر ساتویں منزل تک پہنچا جائے لہذا دونوں بھائی زینے کی جانب بڑھ گئے۔

جب دونوں بھائی ساتویں منزل پر اپنے مطلوبہ

کمرے کے سامنے پہنچے تو پسینے میں شرابور ہو چکے تھے اور زور زور سے سانس لے رہے تھے اس پر ستم یہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ جس شخص کی عیادت



بڑا یا۔

”ہاں۔۔۔ وہی کمرہ ہے کمرہ نمبر اٹھتر۔۔۔“ منتظر کی سانسیں پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔

”ہاں۔۔۔ اٹھتر نمبر کمرہ ہی تھا۔۔۔ اوہ۔۔۔ آج۔۔۔ آج تین برس بیت گئے ہیں۔۔۔ لگتا ہے۔۔۔ کل کا واقعہ ہے۔۔۔“ انتظار ماضی میں کھو گیا۔

انتظار کی بات سن کر بے اختیار منتظر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔“ منتظر نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے چھپا لیا اور رونے لگا۔

منتظر کی یہ حالت دیکھ کر انتظار کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور اس نے آگے بڑھ کر منتظر کو اپنے سینے سے لگا لیا، منتظر کے آنسو انتظار کی قمیض گیلی کرنے لگے خود انتظار کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔“ منتظر کے منہ سے روتی ہوئی آواز نکلی تو پاس سے گزرنے والے ایک آدمی نے رکتے ہوئے کہا۔

”اللہ نے ماں بڑی عجیب چیز بنائی ہے جو اولاد کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہیں، شاید ہی دنیا میں کوئی انسان ایسا ہوگا جس کے آنسو ماں کی موت پر بے اختیار نہ بہہ نکلے۔۔۔“

اس آدمی کی بات سن کر وہ دونوں ذرا سنبھلے وہ آدمی دونوں بھائیوں کا کندھا تھپکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ انتظار نے عجیب سی نظروں سے جاتے ہوئے آدمی کو دیکھا وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دونوں اس آدمی کو کیسے بتاتے کہ ان کی ماں آج نہیں مری بلکہ تین سال پہلے اس وارڈ کے کونے والے کمرہ نمبر اٹھتر میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور۔۔۔ اور ان دنوں دونوں بھائی اتنے مجبور اور بے بس تھے کہ ہسپتال کا بل بھی ادا نہیں کر سکے تھے اور۔۔۔ انہیں اپنی ماں کی لاش کو ہسپتال میں چھوڑ کر فرار ہونا پڑا تھا۔

اس بات کو آج تین سال گزر چکے ہیں اور اب دونوں بھائی ایک نئی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدوں پر کام

کر رہے ہیں، اب ان کی جیب میں پیسہ ہے مگر۔۔۔ مگر اب ماں نہیں ہے۔

”بھائی۔۔۔ وہ کمرہ دیکھ لیں جہاں امی بیٹھی ہمارا انتظار کرتی رہی ہوں گی۔۔۔“ منتظر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انتظار نے اقرار میں سر ہلا دیا، پھر دونوں بھائی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کمرہ نمبر اٹھتر کی جانب بڑھے، ان کے سر جھکے ہوئے تھے ان کا سارا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان کے کندھوں پر ان کی ماں کا جنازہ ہو۔ کمرہ نمبر اٹھتر کے سامنے پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ گھومنے لگا۔

کمرہ نمبر اٹھتر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دروازے پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ منتظر نے آگے بڑھ کر دروازے کا لہراتا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر جھانکا۔

”بھ۔۔۔ بھائی۔۔۔“ منتظر نے کمرے کا پردہ چھوڑا اور دبی آواز میں انتظار کو پکارا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ دھپ سے ہسپتال کے فرش پر بیٹھ گیا۔ انتظار نے آگے بڑھ کر منتظر کو سہارا دیا اور اسے کھڑا کیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا

”اند۔۔۔ اندر۔۔۔“ منتظر کے منہ سے ٹوٹے ہوئے الفاظ نکلے۔ انتظار نے دیوار کے سہارے سے منتظر کو کھڑا کیا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر پڑا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر جھانکا۔۔۔ تو بے اختیار اس کے منہ سے بھی ایک دبی دبی چیخ نکل گئی اور وہ پردہ چھوڑ کر منتظر کے پاس آ گیا، دونوں بھائی خوفزدہ نظروں سے کمرہ نمبر اٹھتر کے دروازے پر پڑے پلتے ہوئے پردے کو گھور رہے تھے، دونوں کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا ان کی آنکھوں میں خوف کا سایہ صاف دیکھا جا سکتا تھا، ان کا چہرہ سفید پڑنے لگا، وہ دونوں بے جان جسموں کی طرح کھڑے کمرہ نمبر اٹھتر کے دروازے پر پڑے پردے کو گھور رہے تھے۔

اتنے میں کمرہ نمبر اٹھتر کے دروازے کا پردہ ہلا اور ایک نرس ہاتھ میں ٹرے لئے کمرے سے باہر نکلی اس



## قول حضرت علی

کوئی چیز اس عقل سے بہتر نہیں جس کی زینت علم سے ہو اور کوئی چیز اس علم سے بہتر نہیں جس کو علم اور بردباری نے زینت بخشی ہو اور کوئی چیز اس صداقت اور سچائی سے بہتر نہیں جس کو نرمی نے حسن بخشا ہو اور کوئی چیز اس نرمی سے خوب تر نہیں جس کو تقویٰ سے آراستگی ملی ہو۔ بلاشبہ اخلاق کریمانہ اور عقلمندی کا دار و مدار آبرو کی حفاظت، فرض کی ادائیگی اور عہد کی پابندی اور وعدوں کو پورا کرنے پر ہے۔

(شاہد علی شاہد - کراچی)

جاسکتی ہوں۔۔۔ وہ کئی بار بل کی ادائیگی کا تقاضہ بھی کر چکی ہے۔۔۔" ماں نے اپنی عادت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر جملہ مکمل کیا۔

"وہ۔۔۔ امی۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔" انتظار نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔

"نرس۔۔۔" ماں نے کمزوری کے باوجود تیز آواز میں نرس کو پکارا تو ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی۔

"جاؤ نرس بل لے آؤ۔۔۔ دیکھو میرے بیٹے

مجھے لینے آئے ہیں، اب میں گھر جاؤنگی، صبح سے تم مجھے

طعنہ دے رہی تھی کہ "میرے بیٹے ہسپتال کا بل ادا

کرنے کے قابل نہیں تھے، لہذا وہ مجھے چھوڑ کر فرار

ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔" اب تم خود دیکھ لو میرے بیٹے

معاملات کے کتنے سچے ہیں وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں

کہ ان کی ماں پر ہسپتال کا قرض باقی رہ

جائے۔۔۔۔۔ اور ہاں ڈاکٹر ارسلان کو میرا سلام کہنا وہ تو

شاید اب ڈیوٹی پر نہیں ہونگے، انہوں نے نہایت توجہ

سے میرا علاج کیا ہے، کل جب وہ ڈیوٹی پر آئیں تو تم

میری جانب سے ان کا شکریہ ادا کر دینا۔" ماں نے

طویل جملے بغیر کسی دقت کے نہایت روانی سے ادا کئے۔

نے دونوں بھائیوں کو سر جھکا کر سلام کیا اور راہداری میں آگے بڑھ گئی۔

انتظار نے اپنے بھائی منتظر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور آگے بڑھ کر ایک بار پھر کمرہ نمبر اٹھتر کے دروازے پر پڑا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر دیکھا، کمرے کے اندر پلنگ پر۔۔۔ ان کی ماں۔۔۔

ہاں وہ ان کی ماں ہی تھی ان کی ماں پلنگ پر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں کھانا تھا، ماں کے دوسرے ہاتھ میں ایک چمچ تھا جس سے ماں پلیٹ میں رکھا کھانا کھا رہی تھی۔ وہ ان کی ماں تھی۔

یا ان کی ماں کی طرح کی کوئی اور عورت تھی۔ وہ دونوں دنیا جہاں کی حیرت اپنی آنکھوں میں سمیٹے سامنے بیٹھی اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے، ماں کا چہرہ جھریوں بھرا تھا، ان کی آنکھوں کے پونے ڈھلکے ہوئے تھے روئی کی طرح سفید بال چھت پر لگے پنکھے کی ہوا سے ماں کے ماتھے پر لہرا رہے تھے، اس ہاتھ میں جس سے ماں نے چمچ پکڑا ہوا تھا اس ہاتھ میں ہلکا سا ریشہ تھا۔ مگر اس کے باوجود ماں کا چہرہ حسب معمول پرسکون تھا، ماں نہایت اطمینان سے کھانا کھا رہی تھی۔

دونوں بھائی بت بنے کھڑے ماں کو دیکھ رہے تھے، جب پلیٹ میں کھانا ختم ہو گیا تو ماں نے پلیٹ سائیڈ پر رکھی اور نظر اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا، ان دونوں پر نظر پڑتے ہی ماں کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جل اٹھے۔

"انتظار اور منتظر بیٹا۔۔۔ تم دونوں باہر کیوں کھڑے ہو اندر آؤ۔۔۔" ماں نے نرمی سے دونوں کو کہا تو وہ دونوں تیزی سے ماں کے پلنگ کی جانب بڑھے۔ وہ دونوں ماں کے پلنگ کے پاس پہنچے تو ماں نے دونوں کا چہرہ باری باری اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر ان کی پیشانی پر پیار کیا، ماں کی یہ خاص عادت تھی وہ اسی طرح دونوں کی پیشانی پر پیار کرتی تھی۔

"تم دونوں نے بہت دیر کی آنے میں۔۔۔ نرس کئی بار کہہ چکی ہے کہ اب میں ٹھیک ہو گئی ہوں اور گھر



ماں کی بات سن کر نرس نے جواب میں ٹھیک ہے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

دونوں بھائی اتنے خوفزدہ تھے کہ بے حس جسموں کی طرح کھڑے رہے، تھوڑی دیر میں نرس بل لے کر آگئی اور اس نے بل ماں کے حوالے کیا۔

”یہ لو انتظار تم دیکھو۔۔۔“ ماں نے بل انتظار کو پکڑا دیا، انتظار نے بل ہاتھ میں لیا اور اس پر لکھی رقم دیکھی اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کا اپنا بٹوان نکالا، انتظار کو آج ہی تنخواہ ملی تھی لہذا اس کے پاس کافی رقم تھی، اس نے اپنے بٹوے میں سے رقم نکالی اور رقم گن کر نرس کو بل کی ادائیگی کی، نرس نے رقم لینے کے بعد ادائیگی کی، رسید انتظار کو دی، نرس سے ادائیگی کی رسید لے کر انتظار نے جیب میں رکھ لی۔

بل ادا کر کے دونوں بھائیوں نے ماں کو سہارا دے کر پلنگ سے نیچے اتارا، ماں دونوں بھائیوں کے سہارے سے کھڑی ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر کی جانب چل دی، وہ دونوں ماں کو سہارا دے کر راہداری میں لائے اور لفٹ تک پہنچے، اب لفٹ ٹھیک ہو چکی تھی لہذا انہیں نیچے اترنے میں چند سیکنڈ لگے۔

جب وہ سب ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلے تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا، سڑکوں پر برقی فمقے روشن ہو چکے تھے۔ انتظار نے جلدی سے ہسپتال کی پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور منتظر نے سہارا دے کر ماں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا، چند قدم کی مسافت سے ماں بہت تھک گئی تھی لہذا سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ سیٹ پر لیٹ گئی۔ منتظر نے ماں کو آرام سے سیٹ پر لیٹا دیا اور دروازہ بند کر دیا اور خود گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر انتظار کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی منتظر نے گردن گھما کر ماں کو دیکھا، ماں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے سانس لے رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ منتظر کے بیٹھتے ہی انتظار نے گاڑی آگے بڑھا دی،

گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور روشنی میں راستہ صاف نظر آ رہا تھا، انتظار نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کے اندر کی لائٹ بند کر دی تو گاڑی کے اندر اندھیرا چھا گیا۔

انتظار اپنی نظریں سڑک پر جمائے گاڑی چلا رہا تھا، سڑک پر ٹریفک معمول سے کم تھا لہذا تھوڑی ہی دیر میں گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے پہنچ گئی جہاں ان کا فلیٹ تھا، انتظار نے بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر گاڑی کو بریک لگائے تو گاڑی ہلکی سی جرجر اہٹ کے ساتھ رک گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی دونوں بھائی گاڑی سے نیچے اترے، منتظر نے نیچے اترتے ہی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تاکہ ماں کو سہارا دے کر نیچے اتار سکے مگر دروازہ کھولتے ہی اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ چکرا کر سڑک پر گرنے لگا، انتظار جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے گرتے ہوئے منتظر کو سنبھالا دیا تو منتظر، انتظار کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

”کیا ہوا؟“ انتظار نے پوچھا۔

”اند۔۔۔ اند۔۔۔“ منتظر نے نے گاڑی کے اندر کی جانب اشارہ کیا تو انتظار نے منتظر کو گاڑی کے سہارے سے کھڑا کیا اور جلدی سے گاڑی کے کھلے دروازے کے اندر سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دیکھا۔

”امی۔۔۔“ انتظار کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اندر گاڑی کی پچھلی سیٹ خالی تھی، ماں کا کہیں پتا نہیں تھا، ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ جیسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا تھا۔

انتظار نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی انگلیاں ہسپتال کی رسید سے ٹکرائیں انتظار نے رسید اپنی جیب سے نکالی اور رسید پر نظر دوڑائی تو وہ حیران رہ گیا۔

رسید پر تین سال پہلے اس دن کی تاریخ پڑی ہوئی تھی جب ان کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔







## بریکنگ نیوز

ناصر محمود فرہاد - فیصل آباد

شہرت کی بھوکی خوبرو دوشیزہ جذبات کے تھپیڑے میں بھتی چلی گئی اسے اپنے روز و شب کا بھی خیال نہ رہا کہ حالات اسے کس طرف لے جا رہے ہیں اس نے بریکنگ نیوز کی مکمل تیاری کر لی تھی لیکن افسوس کہ وہ خود بریکنگ نیوز کا حصہ بن گئی

خراں خراں دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی دلکش و فریب و نشیں انوکھی کہانی

کی دلکش جوانی کو سنبھالنے میں بظاہر ناکام نظر آ رہے تھے اوپر تک بند تھے۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی تاکہ آئینے میں اپنے پورے جسم کا عکس دیکھ سکے۔ وہ پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ اس کا انداز اتنا ہی سنجیدہ تھا جتنا ایک نیوز رپورٹر کا ہو سکتا ہے۔

”میں ہوں کرن چوہدری..... اور آپ دیکھ رہے ہیں برق نیوز۔“

**کرن** چوہدری نے برق نیوز کی وین میں لگے آئینے میں اپنے دلکش سراپا پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ اس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ لپ اسٹک نیچرل شیڈ کی تھی، لمبے چمک دار ریشمی بال ایک سادہ جوڑے کی شکل میں گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

وہ اپنا یہی انداز پسند کرتی تھی جو اس کے لباس میں بھی نمایاں تھا۔ چست مگر سادہ شرٹ کے بٹن جو اس



اس نے یہ لائیں ایک دو دفعہ دہرائیں۔ ہر دفعہ آواز کا اتار چڑھاؤ مختلف تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آج رپورٹ پیش کرتے ہوئے کون سا انداز مناسب رہے گا۔ کرن چوہدری برق نیوز پر موسم کے متعلق اسٹوری پیش کیا کرتی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ اور دلکش انداز خوف ناک طوفان کی خبر کو بھی لوگوں کے لئے دل چسپ بنادیا کرتا تھا۔

وہ برق نیوز سے گزشتہ پانچ سال سے منسلک تھی اور اپنے کام میں دل چسپی بھی لیتی تھی مگر وہ کچھ مزید کرنا چاہتی تھی اس نے صحافت کی ڈگری اس لئے نہیں لی تھی کہ ٹی وی اسکرین پر لوگوں کو صرف موسم کا حال سنایا کرے۔ وہ تحقیقاتی رپورٹر بننا چاہتی تھی اور سنسنی خیز خبریں لانا چاہتی تھی۔ اس بارے میں اس نے اپنے اسٹیشن منیجر بابر وحید سے بھی بات کی تھی۔ اس نے کرن کو اپنے دفتر میں بلایا تو کرن نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا مگر اس نے کرن کی پوری بات سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

”مس کرن چوہدری.....! آپ کا موجودہ کام بھی کچھ اہم نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ لوگ آپ سے موسم کا حال سننا چاہتے ہیں۔“

”مگر..... میں اسٹوڈیو تک محدود رہ کر اکتا گئی ہوں۔ میں اب معاشرتی طوفانوں کی خبر بھی لینا چاہتی ہوں۔“

”ہم اس پر غور کریں گے۔“ اسٹیشن منیجر بولا۔ ”ابھی تو میری توجہ شہر میں ہونے والی ان وارداتوں کی طرف ہے جس میں کوئی جنونی قاتل اور سیریل کلاں جو ان لڑکیوں کو قتل کر کے اور ان کی گردن کاٹ کر سمندر کنارے پھینک رہا ہے۔“ اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر کرن غصے سے کھول اٹھی۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور آنسو آنکھوں میں بھرے پڑے تھے۔ وہ اپنے ڈریسنگ روم کی طرف جاتے ہوئے خود کو حوصلہ دے رہی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی کہ منیجر نے اس کی بات کیوں نہیں سنی۔ اسے اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ منیجر کے سامنے اپنا مسئلہ پوری طرح بیان نہیں کر پائی۔

انہی سوچوں میں گم وہ ایک راہداری میں مڑی تو سیدھی رانا نوید سے جا ٹکرائی۔ اس اچانک ٹکراؤ سے وہ سنبھل نہ پائی اور اگر رانا نوید پھرتی سے اسے اپنی بانہوں میں سنبھال نہ لیتا تو وہ یقیناً زمین پر گر پڑتی۔ جب وہ پھسلی تو اس کا ٹخنہ تھوڑا سا مڑ گیا اور پاؤں دہرا ہوا تو درد کی ایک تیز لہر ٹخنے کی ہڈی میں ابھری۔

”کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ رانا نوید نے پوچھا۔

کرن نے رانا نوید کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔ کرن کے آنسو بہہ نکلے۔

”ارے ارے..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ تسلی دیتا ہوا بولا۔ ”کیا آپ ٹھیک ہیں..... ہڈی تو نہیں ٹوٹ گئی۔“

کرن بلک اٹھی منیجر سے ملاقات کا سارا غصہ آنسو بن کر بہہ نکلا اور وہ سسکنے لگی۔

رانا نے ادھر ادھر مدد کے لئے کسی کو دیکھا مگر راہداری بالکل خالی پڑی تھی۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... مس کرن میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیں اور اپنا بوجھ اس پر ڈال دیں۔“

کرن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رانا کا سہارا لیا اور آہستہ آہستہ اپنے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی۔ اندر پہنچ کر رانا نوید نے کرسی پر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اگلے بعد اس نے میز پر پڑا ٹشو کا ڈبا اٹھایا اور ایک ٹشو نکال کر کرن کی طرف بڑھا دیا۔

کرن کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ زخمی ضرور تھی مگر خوش قسمتی سے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ وہ پاؤں کو ہلا جلا کر تھوڑا گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

رانا نوید خاموش کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آہستگی سے کرن کو متوجہ کیا۔

”کیا تم اب ٹھیک ہو؟“

اس کو اس طرح وہاں کھڑے رہنا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ کرن نے چند ایک گہرے سانس لئے



ملاقات نہیں تھی۔ اس نے سوچا کاش اس آدمی سے کبھی پہلے اور بہتر حالات میں ملاقات ہوئی ہوتی۔

اس واقعہ کے تقریباً دو ماہ بعد ایک روز کرن کے ڈرینگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے رانا نوید کھڑا تھا۔ اس دن کے واقعہ کے بعد کئی دفعہ ٹی وی اسٹیشن کی راہداری میں ان کا آنا سامنا ہوا تھا مگر ملاقات پائے۔ ہیلو اور مسکراہٹوں کے تبادلے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔

”ہیلو مس کرن۔۔۔ کیا تمہارے پاس میری بات سننے کا کچھ وقت ہوگا۔“ اس کی آواز میں جوش نمایاں تھا۔

کرن اپنے پروگرام کی تیاری کر رہی تھی جو کچھ ہی دیر میں آن ایئر ہونے والا تھا مگر اس کے جوش کو دیکھتے ہوئے وہ منع نہ کر سکی۔

”میرے پاس صرف چند منٹ ہیں۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔“

رانا نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ کچھ محتاط نظر آ رہا تھا پھر اندر آ کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

”میرا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔“ وہ بولی۔ ”میری میرامیک اپ کرنے آنے والی ہے اس لئے جلدی بناؤ کیا بات ہے؟“

رانا نے سر ہلاتے ہوئے ایک نظر دیوار گیر گھڑی کو دیکھا پھر کہنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تو جلدی جلدی سنو۔“ اس نے کرن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ آواز ہلکی مگر لہجہ تیز تھا۔

”مس کرن۔۔۔۔۔ مجھے ایک اسٹوری مل گئی ہے۔ ایک اسٹوری۔۔۔۔۔ تمہارے لئے اسٹوری۔ جو تہلکہ مچا دے گی۔ ہر ایک کی نظر تم پر ہوگی پھر وہی تمہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔“

کرن نے غیبی نشانی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جوش کے سائے

اور اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

”مجھے بہت افسوس ہے آپ کو زحمت ہوئی۔“

”افسوس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ

بولی۔ ”میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں۔“

”میرا خیال ہے میں اب ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ وہ کچھ رکی پھر رانا نوید کی طرف دیکھ کر دوبارہ کہنے لگی۔

”مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے پریشان ہونا پڑا دراصل میں اسٹیشن منیجر سے میٹنگ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اب تو حد ہو گئی ہے۔ میرا صبر ختم ہو رہا ہے۔“ کرن کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔

”وجہ کوئی بھی ہو۔۔۔۔۔ مسئلہ کوئی بھی ہو۔۔۔۔۔ اسٹیشن منیجر سے ملاقات کے بعد کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔“ رانا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

کرن بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔ ”تم نہیں جانتے میں کیا محسوس کر رہی ہوں وہ مجھے موقع نہیں دے رہا۔“

”کیسا موقع۔۔۔۔۔؟“

اس سادہ سوال کے جواب میں کرن نے اپنے دل کا سارا حال بیان کر دیا۔ اپنے خوابوں کے متعلق بتا دیا۔ دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔

رانا کے جانے سے پہلے اس نے ساری بات سننے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ رانا نے بھی جوابی مسکراہٹ اچھال دی۔ پھر باہر نکلنے سے پہلے رک کر ایک بار مڑا، اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”مس کرن۔۔۔۔۔! اپنے خوابوں کو ٹوٹے مت دینا۔ تم بہت خاص ہو۔ لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“ پھر وہ ہاتھ ہلاتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد کرن سوچنے لگی کہ یہ اچھا آدمی ہے۔

وہ رانا نوید کے متعلق اس سے زیادہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس اسٹیشن پر کیمرہ مین تھا اور اس کو یہاں کام کرتے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ کرن کی اس سے زیادہ



حرکت کرنے لگے۔

”میں اپنا آپ منوانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں میں دنیا کو۔۔۔ اور اسٹیشن منیجر کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے اندر کتنا ٹیلنٹ ہے۔ جلدی بتاؤ کیا خبر ہے۔ کیا اسٹوری ہے؟“

اس سے پہلے کہ رانا کچھ بولتا اسی وقت ڈریسنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں نے بیک وقت مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ چونک گئے تھے۔ کرن کو اس وقت یہ دخل اندازی بری لگی۔

”تم پہلے اپنا پروگرام کرو میں تفصیل بعد میں بتاتا ہوں۔ فارغ ہو کر پہلی منزل کے میننگ روم میں مجھے ملو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔“ اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔

اس دوران ایک بار پھر باہر دروازے پر دستک ہوئی اور کرن کی میک اپ گرل کی آواز ابھری۔ ”کرن۔۔۔ کیا تم اندر ہو؟“

”ہاں۔۔۔ بس ایک سیکنڈ ماریے۔“

”کرن جلدی سے مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

رانا اسی طرح دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں تمہیں ایک بڑی اسٹوری دوں گا اور تم مجھے وہ دوگی جو میں چاہوں گا۔“

”یقیناً۔۔۔ یہ ہم دونوں کے لئے ایک بڑی کامیابی ہوگی اور میں تمہیں نہیں بھولوں گی۔“

”وعدہ۔۔۔؟“

”وعدہ۔۔۔۔۔ کرن کا لہجہ مستحکم تھا۔

وہ مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دباتے ہوئے بولا۔

”تھوڑی دیر بعد پھر ملتے ہیں۔“ اس نے مڑ کر دروازہ کھول دیا اور ماریہ کو اندر آنے کا موقع دیا پھر وہ خود باہر نکل گیا۔

کرن کے اندر ایک جوش بھر گیا اور وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہو گئی۔ پروگرام ختم ہوتے ہی اس نے جلدی سے لباس تبدیل کیا وہ رانا سے اسٹوری کی تفصیل جاننے کے لئے مری جا رہی تھی۔ جلدی سے لفٹ کی

طرف بھاگی۔ ایک دو لوگوں نے بات کرنے کے لئے اس کو روکا مگر وہ ہاتھ لہرا کر نکل گئی۔ مطلوبہ منزل پر پہنچ کر جونہی لفٹ کا دروازہ کھولا وہ باہر نکل کر بھاگی۔ راہداری میں دائیں مڑی اور پھر ہال میں آ گئی۔ میننگ روم کے دفاتر خالی پڑے تھے اور پورا ہال تاریک اور پران پڑا تھا۔ صرف کمپیوٹرز چلنے کی ہلکی آواز آرہی تھی۔ میننگ روم کے ایک کونے والے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

رانا نے بھی اس کو آتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنا بیگ لمبے چوڑے میز پر پھینکا، خود ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور رانا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کا جوش اور تجسس صاف عیاں تھا۔

”مجھے ایک بہت عمدہ اسٹوری ملی ہے۔“ رانا نوید مسکراتے ہوئے بولا۔

کرن دل چسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ منتظر تھی کہ وہ پوری بات تفصیل سے بتائے۔

”تم جانتی ہو کیسے اس شہر کا میئر شہر میں چلنے والے مساج سینٹر اور بازار حسن کو بند کرنے کی پورے زور و شور سے کوشش کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہی نعرہ ہے

کہ شہر کو اپنے بچوں کے لئے صاف اور پاک بنادو۔ اس کی یہ مہم شروع ہو چکی ہے۔“

کرن نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے اپنا سر ہلادیا اور بولی۔ ”ہاں۔۔۔ شاید اس لئے کہ انتخابات کا موسم قریب آ رہا ہے۔“

”ہاں یہی بات۔“ رانا بولا۔ ”اور۔۔۔ اب اگر میں تمہیں اس پاک صاف میئر کا ایک گنداز بتاؤں تو۔۔۔ وہ اتنا پاک صاف نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔“

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ اس کا انداز ڈرامائی تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔“ کرن نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا یہ بات اس کے لئے ایک دھماکے سے کم نہ تھی۔

رانا مسکراتے لگا وہ سمجھ گیا کہ کرن اب پوری طرح



اطلاع دے گا۔

”تب..... تب..... ہم ایک کیمبرہ لے کر رپورٹ کی طرح وہاں چھاپہ ماریں گے۔ ساری کارروائی براہ راست ٹی وی پر دکھائیں گے اور میسر کو رگے ہاتھوں پکڑیں گے۔“  
کرن سب کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔ وہ تو خود اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی جب وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکے اور لوگوں سے اپنا آپ منواسکے۔

”کب مجھے بتاؤ گے؟“ وہ رانا سے پوچھنے لگی۔  
”میں رابطے میں رہوں گا۔ جو نبی اطلاع ملی تمہیں بتا دوں گا۔“ رانا نے کہا پھر دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ کرن پہلے وہاں سے نکلی پھر اس کے بعد رانا گیا تاکہ کوئی ان کو ایک ساتھ دیکھ کر کسی شک میں نہ پڑ جائے۔  
اگلے چند دن تک کرن اونچی ہواؤں میں اڑتی رہی اور خوب بنتی رہی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ڈرینگ روم کے آئینے اور گھر میں واش روم کے آئینے کے سامنے اپنے لباس اور بولنے کے انداز کی پریکٹس کرتی رہی۔

کئی روز تک کوئی خبر نہ آئی۔ اس نے کئی بار رانا کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا وہ عموماً ہاتھ ہلا کر گزر جاتا تھا۔ کرن کو بے چینی لگی ہوئی تھی۔ تقریباً پانچ روز بعد کا واقعہ ہے راہداری میں سے گزرتے ہوئے رانا نے اسے چپکے سے ایک رقعہ تھما دیا۔ وہ جلدی سے اپنے ڈرینگ روم کی طرف بھاگی اندر سے دروازہ بند کیا اور کاغذ کی تہہ کھولی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاغذ پر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔  
”آج رات..... آٹھ بجے..... گورنمنٹ اسکول کے عقب میں۔“

کرن نے اس جملے کو بار بار پڑھا۔ دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رات آج کی رات بھی اور وہ تیار تھی۔

اسکول کے قریب پہنچ کر رانا کی تلاش میں اس نے محتاط انداز میں اسکول کے گرد ایک چکر لگایا پھر واپس اپنی گاڑی میں آ کر اس کا انتظار کرنے لگی کیونکہ وہ اس کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے عقبی آئینہ دوبارہ

اس کی طرف متوجہ ہے۔ وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔  
”دوست انڈر ورلڈ کے لئے کام کرتا ہے۔  
وہ اس کے لئے وہ کام کرتا ہے ان میں سے ایک کا بظاہر ہوٹل کا کاروبار ہے مگر درپردہ وہ ایک ٹائٹ کلب چلاتا ہے جس کا تعلق بازار حسن کے لوگوں سے ہے۔“

کرن اس کے ایک ایک لفظ پر توجہ دے رہی تھی۔ ایک توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ ”اس کلب کی خاص بات یہ ہے کہ شہر کے بڑے بڑے رؤساء اور میدان سیاست کے کئی اہم کھلاڑی اس کلب کے رکن ہیں مگر کوئی بھی دوسرے کو نہیں جانتا کہ وہ بھی اس کلب کا رکن ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور..... اس سے بھی بڑھ کر خاص بات.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا ایک وقفہ لیا اور پھر کرن کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہنے لگا۔

”یہ کلب ایک رہائشی علاقہ میں بنایا گیا ہے اور میرا اس کا خاص رکن ہے۔“

”نہیں.....“ کرن حیرت کے مارے اچھل پڑی۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں پورے یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ میں نے وہ عمارت دیکھی ہے جہاں یہ کلب قائم ہے مگر صرف باہر سے۔ میں نے ایک دوبار میسر کو بھی اس عمارت کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دوست کی خبر جھوٹی نہیں کہ اس عمارت کے اندر کیا ہو رہا ہے۔“

”اوہ میرے خدا..... رانا یہ صرف ایک استوری نہیں..... یہ ایک دھماکہ ہے۔ یہ خبر سارے شہر کو ہلا کر رکھ دے گی۔“

”ہاں..... اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اس استوری کو رپورٹ کرو۔ تم اس کا انتظار کر رہی تھیں اور یہ تمہارا.....“ رانا بولا۔

”ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

رانا اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا کہ انہیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب میسر اس عمارت کے اندر جائے اور یہ وقت اس کا دوست اسے بتائے گا اور اس کی



ایڈ جسٹ کیا اور اس میں اپنے آپ کو دیکھ کر جملوں کی ادائیگی کی ریہرسل کرنے لگی۔

”میں ہوں کرن چوہدری۔ براہ راست آپ سے مخاطب ہوں برق نیوز سے۔“

کرن نے کھٹکھار کر دوبارہ اپنا گلا صاف کیا اس کا خیال تھا کہ آواز صاف اور واضح نہیں ہے۔ دوبارہ کوشش کی۔

”میں ہوں کرن چوہدری براہ راست برق نیوز سے۔“

اس بار وہ مسکرائی اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دینے لگی۔ اسی وقت اس نے برق ٹی وی کی دین کو اسکول کے ایک کونے سے گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ وین اس کی کار کے سامنے آئی بہت تیزی سے مڑی اور اس طرح قریب آ کر رکی کہ دونوں گاڑیوں کی کھڑکیاں پہلو بہ پہلو آ گئیں۔

وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر رانا نوید بیٹھا ہوا تھا اس نے کھڑکی کھول کر کرن کی کار کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرانے کو کہا۔ وہ پر جوش نظر آ رہا تھا۔ کرن نے کار کی کھڑکی کا شیشہ تیزی سے نیچے کیا۔

”اپنا سامان سمیٹو اور جلدی سے وین میں آ جاؤ۔ مجھے اپنے دوست کی کال کا انتظار ہے پھر اس کے بعد چلتے ہیں۔“ رانا فوراً ہی تیزی سے بولنا شروع ہو گیا۔

”اوکے۔۔۔۔۔“ کرن نے سر ہلادیا۔ شیشہ واپس چڑھایا۔ چابی انکیشن سے نکالی۔ اپنا بیگ سمیٹا۔ آئینے میں ایک نظر اپنا چہرہ دیکھا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ گھوم کر وین کی طرف آئی اور پسینجریٹ پر بیٹھ گئی۔

”سب ٹھیک ہے نا۔۔۔۔۔“ اس کے بیٹھتے ہی رانا نے سوال داغ دیا۔

”میرا خیال ہے ہاں۔“ وہ بولی۔

”مجھے ایک فون کال کا انتظار ہے فون آنے کا مطلب ہے کہ میسر بلڈنگ کے اندر ہے۔ ہم دروازے پر پہنچیں گے۔ تیزی سے اندر داخل ہوں گے اور اس کے

سر پر پہنچ جائیں گے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ ایک عام سا گھر ہے۔ سارا مکروہ دھند اتہہ خانے۔۔۔۔۔“

”ہمیں کچن سے ہو کر ایک سفید دروازے تک پہنچنا۔“

”ہمیں ہماری منزل تک پہنچائے گا۔ ہم صدر دروازے پر براہ راست سین شوٹ کریں گے۔ دروازہ کھولیں گے اور اتہہ خانے کی سیڑھیاں اتریں گے وہاں میسر ایک سیاہ رنگ کے دروازے والے کمرے میں موجود ہوگا۔“

کرن کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا، وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کرن یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی دھڑکن سنبھلنے لگی۔

رانا اٹھا اور وین کے عقبی حصے میں آ گیا۔

”ایک دفعہ اپنا سامان چیک کر لیں۔ میں ایک چھوٹا کیمرہ لایا ہوں۔ بڑے کیمرے کو دیکھ کر وہ لوگ خبردار اور محتاط ہو سکتے ہیں اس لئے چھوٹا کیمرہ مناسب رہے گا۔“

”یہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔“ کرن یہ کہتے ہوئے اٹھ کر وین سے باہر آ گئی۔ آئینے میں دیکھ کر دوبارہ اپنے جملوں کی ریہرسل کی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کو قابو میں کیا۔ اسی وقت اس نے رانا کے فون بجنے کی آواز سنی تو کرن کی سانسیں رکنے لگیں۔ چند لمحے بعد رانا نے وین کا دروازہ کھولا اور سرگوشی کی۔

”چلو۔۔۔۔۔ وقت آ گیا۔“

رانا نے اسے ایک ٹوپی والی لمبی سی جیکٹ تھما دی اور بولا۔

”مکان کے اندر گھسنے تک اسے اوڑھ لو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا کہ مشہور کرن چوہدری اس وقت ان گلیوں میں پھر رہی ہے تو لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔“

کرن نے نہ چاہنے کے باوجود ہاتھ بڑھا کر جیکٹ تھام لی۔ اس کو پہنا اور اس کا ہڈ اس طرح سر پر چڑھا لیا کہ بال خراب نہ ہونے پائیں۔ وہ کیمرے کے سامنے نفس نظر آنا چاہتی تھی۔ رانا نے



اسے ایک مائیکروفون تھما دیا جسے کرن نے جیکٹ کی جیب میں چھپا لیا۔

رانا کے پاس موجود کیمرہ اپنے بیگ میں تھا اور وہ ایک بڑا سا بریف کیس نظر آ رہا تھا۔ رانا نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پوچھنے لگا۔

”تم تیار ہو؟“

”تم جانتے ہو۔“ کرن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تم بہت اہم کام کرنے جا رہی ہو۔ بہت خاص۔“ جواب میں کرن صرف مسکرا دی۔ رانا نے کیمرے والا بریف کیس اٹھایا اور دونوں چل دیئے۔

”اپنا وعدہ بھولنا نہیں۔ جب تم مشہور ہو جاؤ تو میرا حصہ مجھے ملنا چاہئے۔“ وہ اسے یاد دہانی کراتے ہوئے بولا۔

”فکر مت کرو۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں ہی وہ کچھ حاصل کر لیں گے جو ہم چاہتے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے بولی۔

”ہمیں ٹھیک گیارہ بجے اپنا کام شروع کرنا ہے۔“ وہ بولا۔

مطلوبہ گھر تک پہنچتے پہنچتے ان کو مزید پانچ منٹ لگ گئے۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ دروازے پر پہنچ کر رانا نے سرگوشی کی۔

”اب تم جانتی ہو جو تمہیں کرنا ہے۔ پورچ میں پہنچ کر ہم ایک ابتدائی سین شوٹ کریں گے جلدی سے ”انٹرو“ دینا شروع کر دینا۔ کیمرہ پر لگی روشنی جلد ہی کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ وہ بولی۔

”جب ہم اندر پہنچ گئے تو میں کیمرہ آن کر دوں گا جلدی کرو ہمیں ان کے سنبھلنے سے پہلے سب کام کرنا ہے۔“ رانا کا لہجہ تیز تھا۔

کرن نے جیکٹ کی ٹوپی سر سے اتار دی مائیک نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا پھر جیکٹ بھی اتار دی اور اسے میز ہیوں کے قریب گھاس پر ڈال دیا۔ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سنوارنے کی کوشش کی۔ آہستگی

سے سے کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔ ایک گہری سانس لی اور سر ہلا کر رانا کو اشارہ کیا۔

رانا نے بریف کیس سے کیمرہ نکال لیا۔ پھرتی سے اس کو چیک کیا اور بولا۔ ”میں بھی تیار ہوں چلو شروع کرو۔“

کرن قدم بڑھا کر پورچ میں پہنچ گئی۔ گلا ایک بار پھر صاف کیا اور دروازہ کے سامنے ایک خاص انداز سے کھڑی ہو گئی۔ انگوٹھے کو اوپر اٹھا کر رانا کو اشارہ کیا تو اس نے کیمرہ اپنے کندھے پر رکھ لیا اس میں سے پہلے منظر کو دیکھا پھر کرن کو دیکھا۔ اب اس نے الٹی گنتی شروع کی۔

”پانچ، چار، تین، دو.....“

ایک پر اس نے روشنی آن کر دی اور کرن کی طرف کیمرہ کا رخ کر کے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ کرن نے ایک دفعہ اپنی آنکھیں جھپکائیں ان کو کیمرہ کی روشنی سے ہم آہنگ کیا گہری سانس لی اور بولنا شروع کر دیا۔

”میں ہوں کرن چوہدری اور آپ دیکھ رہے ہیں برق ٹی وی..... براہ راست..... آج رات ہم آپ کو آپ کے اس شہر کے میسر کا وہ غلیظ راز اور رخ دکھانے جا رہے ہیں جو وہ خود کبھی دکھانا پسند نہیں کرے گا اور یہ سب ہو رہا ہے آپ کے پڑوس میں۔ اس شہر کے وسط میں..... شرافت داروں کی اس بستی کے بچوں بچ۔“

کرن ایک لمحہ کور کی پھر اس نے رانا کو ایک مخصوص اشارے سے سین کٹ کرنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ اس کی طرف امید افزاء نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا سب ٹھیک ہو گیا؟“

رانا نے کیمرے کی روشنیاں بند کر دیں اور بولا۔ ”بہت عمدہ..... آؤ اب اندر چلیں۔“

کرن نے مکان کا دروازہ کھول دیا اور رانا کو کیمرے سمیت پہلے اندر جانے کا موقع دیا۔ اس کے بعد خود اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کرن کمرے کی حالت دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ دیواروں کا رنگ دھبوں اور میل کے نیچے چھپ چکا تھا۔ قالین جو شاید کبھی



سبز تھا اب کالا نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں موجود واحد صوفہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کا کپڑا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ دو چھوٹی کرسیاں ایک کالے رنگ کے چوبلی میز کے گرد پڑی تھیں۔ اس میز کا اوپری حصہ سگریٹ کی راکھ سے جلا پڑا تھا اور جا بجا چائے کی گرم پیالیاں رکھنے کی نشانات تھے۔ میز پر ایک اش ٹرے اور کافی کا کپ بھی نظر آ رہا تھا۔ فضاء میں سگریٹ کے دھوئیں کی بورچی ہوئی تھی۔ کرن ایسے ماحول کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

کرن رانا کی طرف مڑی تو اس نے دیکھا وہ دروازے کو اندر سے تالا لگا رہا تھا۔ کرن اس کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہاں سے بھاگے یا باہر سے ہمارے پیچھے اندر آئے۔ اب شروع ہو جاؤ۔ تم تیار ہو؟“

”ہاں..... میں تیار ہوں۔“ وہ کمرے کا ماحول نظر انداز کرتے ہوئے بولی اور دوبارہ اپنی خبر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر گلے کو صاف کیا اور انگوٹھے سے رانا کو اشارہ کیا۔ رانا نے کیمروہ کدھے پر رکھا اور روشنی آن کر دی پھر پانچ تک گنا اور بٹن دبا دیا۔

”میسر اپنی انتخابی مہم اپنی شخصیت کے بل پر لڑ رہا ہے۔ خاندانی اقدار کا فروغ اس کا موقف ہے۔ وہ فحاشی اور عریانی کے خلاف ہے لیکن..... ہماری یہ رپورٹ آپ کو بتائے گی کہ میسر کے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے۔ آج برق نیوز پر ہم میسر کی شخصیت کا یہ دوسرا اور گھناؤنا رخ آپ کو دکھائیں گے کہ وہ جس غلاظت کو ختم کرنا چاہتا ہے خود وہ اس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اب دیکھئے اس بند دروازے کے پیچھے میسر کا ایک گندا راز.....“ کرن نے ڈرامائی انداز میں اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دقت سے دوبارہ بولی۔ ”یہ ایک ایسا گھر ہے جو آبادی کے بچوں بچ ہے اور بچوں کے اسکول سے صرف چند قدم کے فاصلے پر اس گھر میں عریانی کے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ دراصل یہ گھر نہیں بلکہ ایک کلب ہے، ایک ایسا

خفیہ کلب جس کا میسر رکن ہے اور اکثر یہاں آتا ہے۔ یہاں راتیں بکیتی ہیں اور خریدار ہوتے ہیں نام نہاد شرفاء، ہمارے ساتھ آئے ہم براہ راست آپ کو دکھاتے ہیں اس فحش خانے میں کیا ہوتا ہے۔“

کرن اپنی ایڑیوں کے بل گھومی۔ اس کا لہجہ پیشہ ورانہ مہارت سے بھرپور تھا۔ اس کی زبان رواں تھی وہ میسر کے چہرے پر ابھرنے والے خوف اور پریشانی کو ابھی سے صاف دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کی حالت پر من ہی من ملاحظہ ہو رہی تھی۔

رانا کیمروہ سمیت اس کے پیچھے تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے آگے ایک کچن تھا۔ کیمروہ کی روشنی میں کچن کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔ کچن سے نکل کر ان کو تہہ خانے میں جانے والا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے پر وہ رکی کیمروہ کی طرف رخ کیا اور بولی۔

”میسرے ساتھ آئیے۔“ پھر اس نے دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہاں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ کرن کی توقع سے زیادہ سرانڈاٹھ رہی تھی۔ اس کو اپنی ناک پر رومال رکھنا پڑ گیا مگر اس کو اطمینان تھا کہ کیمروہ اس کے چہرے پر نہیں درنہ سب کچھ ریکارڈ ہو جاتا اس کے چہرے کے تاثرات بھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ کسی کو چوکنا اور خبردار ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی مگر حیرت کی بات تھی کہ ان کا ابھی تک اس عمارت میں کسی انسان سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی حرکت کی کوئی آواز سنائی دی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تہہ خانہ ایک عام سا تہہ خانہ تھا کوئی خاص قابل ذکر چیز وہاں نہ تھی سوائے ایک کالے رنگ کے دروازے کے۔

یہاں نیچے بدبو زیادہ تھی۔ کرن نے اپنا ایک ہاتھ کالے رنگ کے دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔ ان کی توقع اور اطلاع کے مطابق اس کالے دروازے کے پیچھے اس شہر کا میسر کسی جسم فروش عورت کے ساتھ موجود تھا۔

”آئیے دیکھتے ہیں کیا میسر اندر ہے.....؟“ وہ



بولی اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ کمرہ کیمرے کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔

کرن نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنا سر موڑ کر کمرے کے اندر جھانکا۔ اس کو وہی نظر آیا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ سامنے ایک بڑا سا میز تھا جس پر ایک خوب روٹو جوان لڑکی مکمل برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں سیاہ چمڑے کی مد سے میز کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ لڑکی کے منہ میں ایک سرخ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ بری طرح کسمسار ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔ یہ چیز کرن کے لئے غیر متوقع تھی۔

وہ لڑکی چیخا چاہ رہی تھی مگر اس کی آواز منہ میں ٹھنسا کپڑے کی وجہ سے گھٹ رہی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ پوری قوت سے اپنی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

”میسر کہاں ہے؟“ کرن نے سوچتے ہوئے گہری نظر سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکی خوف زدہ تھی مگر اس کی نگاہیں کرن پر نہیں تھیں بلکہ اس کی نظریں کرن کے پیچھے کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کرن کے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔

کرن مڑی اور لڑکی کی نظروں کا تعاقب کیا۔ کرن کے عقب میں رانا بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس نے اپنا کیمرہ نیچے رکھ دیا تھا اور اب وہ اس کے اور دروازے کے بیچوں بیچ رکاوٹ بن کر کھڑا تھا۔ مگر کیمرے کی روشن لائٹ بتا رہی تھی وہ اب بھی آن ہے اور ریکارڈنگ کر رہا ہے۔ بندھی ہوئی لڑکی کی خوف زدہ نظریں رانا پر جمی ہوئی تھیں۔

کرن نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں رانا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رانا نوید..... یہ سب کیا ہے..... کہاں ہے میسر.....؟“ اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی کیونکہ اس نے دیکھا کہ رانا کے ہاتھ میں ایک بڑا چاقو تھا اور وہ

آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔

”میسر اپنے گھر..... یا..... اپنے دفتر میں ہوگا..... اور جو تم دیکھ رہی ہو..... یہ سب وہ کچھ ہے جو تم چاہتی تھی کرن..... ایک بریکنگ نیوز..... میں تمہیں شہر سے دے رہا ہوں اور تم ایک بڑی خبر کا حصہ بننے جا رہی ہو۔ تم نو جوان لڑکیوں کے سیریل کٹر کی شناخت جاننے جا رہی ہو۔“ وہ بولا تو اس کے چہرے پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ تھی۔

کرن بے ساختہ چیخ اٹھی۔ وہ اس کے قریب آیا اور چاقو بلند کرتے ہوئے بولا۔

”یہ سب وہ ہے کرن..... جو تم چاہتی تھی۔ معاہدہ ہوا تھا تم سے..... اب مجھے میرا حصہ دے دو۔ تم نے وعدہ کیا تھا اس کا۔“ پھر اس نے چاقو کرن کی گردن کے پاس اس کے کندھے پر رکھ کر دبا دیا۔

”مجھے تمہارا خون چاہیے۔“ اس نے ایک جھٹکے سے چاقو کرن کے جسم میں گھونپ دیا۔

کرن کی گردن سے خون پھوٹ پڑا۔ سرخ، گرم اور تازہ خون۔ رانا نے چاقو کے پھل پر لگا خون چاٹ لیا اور زبان ہونٹوں پر پھیر کر مزے لینے لگا۔

”میں جانتا ہوں کرن تم بہت خاص ہو، اور تمہارا خون بہت زیادہ مزیدار ذائقے والا۔“ اس کے لہجے میں عجیب ہوس تھی۔

کرن سسک اٹھی۔ پھر رانا نے ایک دم چاقو کے پے درپے تیز وار کئے اور کرن کے جسم کو چھلنی کر دیا۔ چاروں طرف خون پھیل گیا۔ کرن کی چیخیں دم توڑنے لگیں۔ رانا کو جو چاہئے تھا اس نے حاصل کر لیا۔

زمین پر گرے ہوئے کرن نے ایک دفعہ کیمرے کی طرف دیکھا جو ابھی بھی آن تھا۔ پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی زندگی کا کیمرہ ہمیشہ کے لئے کٹ ہو گیا اور وہ خود ایک بریکنگ نیوز کا حصہ بن گئی۔





صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کھانی

سوچ کے نئے درتے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لا جواب اور دلفریب کہانی

اور میں اسے ثنا کے گھر والوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ثنا کے روپ میں کئی دن ان کے ساتھ گزار چکی ہے پھر بھی انہیں نہیں پہچان سکی۔ ”تو میں کون سی ثنائی۔ ویسے ایک بات کہوں۔ جب میں ثنا کے روپ میں تھی تو تم..... بہت خوش تھے۔“

پہلے تو میں اس کی بات نہیں سمجھا لیکن جب اس کی بات سمجھ میں آئی تو مجھے اس سے بڑی نفرت محسوس ہوئی۔ تاہم میں نے اسے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہاں بھی مجھے عورت کی فطرت کا ایک اور اندازہ ہوا۔ وہ کسی بھی شکل میں اپنا رقیب برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے پھر کہا۔

”چلو۔ تمہارے کھانے پینے کا تو بندوبست ہوا۔“  
”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہی کسر رہ گئی تھی کہ اب خیرات کا کھانا کھاؤں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”تمہارا ہی شوق تھا بھکاری بننے کا۔ میرے لئے سرد خانے میں ایک بھکارن کی لاش ہی رہ گئی تھی۔ کوئی اور بھی بدن لے سکتے تھے۔ اب بھی پیشکش کرتی ہوں کوئی بہت اچھی فیملی تلاش کرتے ہیں۔ میں وہاں کسی خوبصورت لڑکی کو تازوں کی۔ تمہارے بھی عیش ہو جائیں

**لیکن** کمال تھا۔ اس شخص نے چلتی کار سے مجھے پہچان لیا تھا۔ دل اندر سے چیخ رہا تھا کہ بھاگ جاؤں، لیکن یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتا۔ کار کے اندر عبدالکیم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اشتیاق احمد نے کہا۔

”برتن ہے تمہارے پاس۔“  
”اس؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
”یہ ناشتہ لے لو..... ہماری بچی کا چالیسیواں ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا کرنا۔“ اس نے کہا۔ ایک لمحے تک تو اس کی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جب ان کے ملازموں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں آگے بڑھائیں، تب سب کچھ سمجھ گیا۔ برتن نہیں تھے وہ بھی انہوں نے خود دیئے اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

میں سنائے میں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا انوکھا تھا کہ میرے اعصاب ابھی تک کشیدہ تھے۔  
”کیا ہوا، کیا بات ہے۔؟“ کوروتی نے آواز دی تو میں چونکا۔ ”کیا ہوا اتنے پریشان کیوں ہو گئے۔ وہ دوبارہ بولی۔“

”ان لوگوں کو پہچانا نہیں تم نے۔“  
”نہیں۔ کون تھے۔“ اس نے حیرانی سے کہا۔







گے۔“ وہ فرمائی انداز میں ایک آنکھ دبا کر بولی۔  
 ”اور تم اس خوبصورت لڑکی کو قتل کرو گی۔“  
 میں نے کہا۔

”کیا کروں۔ یہ میری مجبوری ہے۔“  
 ”کوروٹی۔ مجھے پاگل مت کرو۔“ میں نے  
 شدید غصے سے کہا۔

”کیوں۔ آخر کیوں تم چاہتے ہو میرے ساتھ  
 جو کچھ ہوا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ گو تم بھنسا لی  
 میرے ساتھ ایسا سلوک صدیوں نہ کرتا۔ اگر وہ تم سے  
 رقابت کا شکار نہ ہو جاتا۔“  
 ”آہ۔۔۔۔۔ کاش میں تمہیں قانون کے حوالے  
 کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”قانون میرا کیا بگاڑ لیتا۔“  
 ”تمہارے لئے ایک ایسا قید خانہ بنا دیتا۔  
 جہاں تم زندہ تو رہتیں، وہاں سے باہر نہ نکل سکتیں۔“  
 ”خام خیالی ہے تمہاری۔ میں وہاں سے نکلنے کا  
 کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتی۔ آخر میں نے اتنے علوم  
 سیکھے ہیں۔“ وہ مجھے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔  
 بھکارن کی حیثیت سے اس کے چہرے پر شرارت کے  
 آثار تھے۔

”تم اب ایک بھی قتل نہیں کرو گی سمجھیں“  
 ”ایک شرط پر۔“  
 ”کیسی شرط؟“

”تم مجھے اس حیثیت میں بھی قبول کرو گے۔  
 میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ مجھے خاموش ہونا پڑا تھا۔  
 وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کر سکتی تھی اور میں اسے نہیں روک  
 سکتا تھا۔ لیکن میں اپنے وطن کی معصوم اور پیاری بچیوں  
 کو موت کے گھاٹ اترتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے  
 لئے مجھے قربانی دینی ہوگی۔ اپنے طرف کی، اپنے  
 ہر احساس کی بظاہر اس بلا سے پیچھا چھڑانے کے  
 امکانات نہیں نظر آ رہے تھے۔ کوئی معجزہ ہی اب مجھے  
 اس سے بچا سکتا تھا۔ ابھی تو اسے ہوش میں لانا ضروری  
 تھا۔ اس کے علاوہ ثناء کے رشتے دار کر دیکھ کر میری جان

نکل گئی تھی۔ اشتیاق احمد امیلی جنس کا آدمی تھا اور پولیس  
 بے وقوف نہیں ہوتی۔ اس وقت بھیک دیتے ہوئے بھی  
 اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ممکن ہے اسے  
 میرے خدو حال پر شک ہوا ہو۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔

”اٹھو۔۔۔۔۔“ میں نے بدحواسی سے کہا۔  
 اور کوروٹی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اٹھا تو وہ بھی  
 بادل نحو استہ اٹھ گئی۔

بتاؤ تو۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“ وہ بولی لیکن میں نے قدم  
 آگے بڑھا دیئے تھے۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے میرے  
 ساتھ چلتی رہی۔ پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں  
 چلتا رہا، میرا ذہن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا میں سوچ رہا تھا  
 کہ اب میں کہاں جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ کسی اسی جگہ  
 جہاں اور بھی بہت سے فقیر پائے جاتے ہیں۔

اپنے شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر ایک ایسا مزار  
 شریف تھا جہاں دو تین بار جانا نصیب ہوا تھا بڑے پہنچے  
 ہوئے بزرگ کا مزار تھا اور وہاں عقیدت مند منتیں  
 مرادیں پوری کرانے جاتے تھے۔ میں نے وہاں  
 فقیروں کے ڈیرے دیکھے تھے۔ مزار کے اس پاس  
 لاتعداد درخت تھے۔ جن کے نیچے فقیر اور دوسرے  
 حاجت مند قیام کرتے تھے اور وہاں کافی رونق رہتی تھی۔

بس یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ گیا کہ مجھے  
 وہاں جانا چاہئے جس حلقے میں اس وقت تھا اس کے  
 لئے وہ مناسب ترین جگہ تھی۔ پہلے جب بھی وہاں جا  
 اپنی کارلے گیا تھا لیکن اکثر میں نے وہاں بسیں  
 اور وگینیں جاتے ہوئے دیکھی تھیں۔ مجھے ان بسوں کے  
 روٹ اور نمبر بھی یاد تھے۔ چنانچہ کافی پیدل چل کر میں  
 نے ان بسوں کے اڈے کے پاس پہنچ گیا۔

”اب بھی کچھ نہیں بتاؤ گے۔“ کوروٹی نے کہا۔  
 ”کوروٹی۔ تم جانتی ہو ہمیں پولیس کا خطرہ ہے۔“  
 ”ہاں۔ جانتی ہوں۔“

”ہم ایک ایسی جگہ چل رہے ہیں جہاں اس  
 حلقے میں آسانی سے رہ سکتے ہیں۔“ میں نے مختصراً اسے  
 مزار کے بارے میں بنایا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی۔



”وہاں تو میں خوشی سے جاؤں گی۔“

”کوئی خاص وجہ۔“

”تمہیں بتایا نہیں تھا۔“ کوروتی نے کہا۔

”کیا؟ دوبارہ بتاؤ۔“

”میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کی کہانی مجھے نہیں

بھولنی جس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے تھے اور جسے کسی

بزرگ کے بتائے ہوئے تیل نے ٹھیک کر دیا تھا۔ میں

نے تم سے کہا تھا کہ مجھے بھی کسی ایسے ہی بزرگ کے مزار

پر لے چلو۔ ہو سکتا ہے میرے لئے بھی ایسا کچھ

ہو جائے۔“

مجھے ہنسی آگئی تو اس نے حیرت سے مجھے

دیکھا۔ پھر بولی۔ ”کیوں..... ہنسے کیوں؟“

”وہ لڑکی بعد میں مر گئی تھی۔“

”یہی تو افسوس ہے۔“

”کیا؟“

”کاش یہ آسانی مجھے بھی حاصل ہوتی، کاش

میں بھی مرجاتی۔“ اس کے لہجے میں اتنی حسرت تھی کہ

میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ قدرت آہ قدرت کتنی مہربان

ہے۔ موت بھی انسان کے لئے ایک نعمت ہے۔ نہ ہو

مرنا تو جینے کا مزہ کیا۔

بس آگئی اور ہم اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔

اچھا خاصا طویل سفر تھا جو آخر کار طے ہو گیا۔ میں نے یہ

جگہ پہلے دیکھی ہوئی تھی۔ سب کچھ حسب معمول تھا۔

عقیدت مندوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ فقیر بھی مزار

پاک پر مکھیوں کی طرح بھنھنار ہے تھے اور لوگوں کو تنگ

کر رہے تھے۔ ہم نے بھی ایک درخت کے نیچے ڈیرہ

ڈال لیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے

کھانے پینے کی وہ اشیاء نکال لیں جو مجھے وہ لوگ دے

کر گئے تھے۔ پیٹ بھرا تو وہیں لیٹ گیا۔ کوروتی نے بھی

درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ذہن میں پھر خیالات کا چرخہ چل پڑا۔ کاش کسی

رائٹر کے بجائے کسی دفتر میں کلرک کی نوکری کر رہا ہوتا یہ

حال تو نہ ہوتا..... انہیں سوچو میں نیند آگئی۔ جاگا تو شام

ہو چکی تھی۔ درگاہ پر خوب رونق تھی کوروتی وہ سب دیکھ

رہی تھی مجھے جاگتا دیکھ کر بولی۔

”وہ سامنے پانی ہے۔ منہ ہاتھ دھو لو۔“

چشمہ جیسی جگہ تھی، پانی ابل رہا تھا اور نیچے جمع

ہو کر ایک چوڑی لکیر بناتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ وہاں

جا کر منہ ہاتھ دھویا واپس آیا تو کوروتی نے ایک دستر

خوان سا بچھا رکھا تھا۔ اس پر مختلف چیزیں بچی ہوئی

تھیں۔ نمکین پیٹھے چاول، کھیر کے دو پیالے، جلیبیاں

وغیرہ۔

”ارے..... یہ کہاں سے آئے۔“

”جو بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ دے کر چلا جاتا ہے۔

یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ کاش میں بھی یہ سب کھا سکتی

مگر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔“

”تمہارے دھرم میں نہیں کرتے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... اسے پر ساد کہتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”ہمارے ہاں اسے لنگر کہتے ہیں۔“

”عالی، تمہیں میری بات یاد ہے۔“ وہاں

بزرگ کے دوار اکب چلو گے؟

”جیسے تم کہو۔“ آج ہی چلتے ہی۔ مگر کسی بات کی

گارنٹی تو نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔

”چلو تو سہی، یہاں کچھ نہ ہوا تو کہی اور چلیں

گے۔“ ان مہاراج کو تلاش کریں گے جنہوں نے ان

بنجاروں کو تیل بتایا تھا۔ کوروتی نے کہا اور میں خاموش

ہو گیا۔

رات ہو گئی۔ یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں

تھی۔ مزار پر قوالیاں، شروع ہو گئیں قوال سازوں پر

سر ملار ہے تھے۔ کوروتی نے اس بارے میں پوچھا

تو میں نے اسے تفصیل بتائی۔ مزار کی بلندیوں پر جانے

کے لئے تین طرف سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں سامنے والی

سیڑھیوں سے زائرین اوپر جا رہے تھے۔ بلندی پر پہنچ کر

بہت کشادہ جگہ تھی جہاں قوالیاں ہو رہی تھیں۔

ہم دونوں تیار ہو کر چل پڑے۔ سیڑھیوں کے

سامنے کے حصے پر داخلی دروازہ تھا جس سے زائرین



اندر جا رہے تھے یہی مین دروازہ تھا جبکہ دوسری سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور ان پر اندھیرا بھی تھا ہم دونوں میں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ہم نے اندر قدم رکھا تھا کہ دونوں طرف سے دو غلام جو سبز بھارے پہنے ہوئے تھے نکل آئے ان کے ہاتھوں میں لمبی نوکدار چھریاں دبی ہوئی تھیں جنہیں انہوں نے سیدھا کر کے ہمارے سینوں پر رکھا اور ہمیں اندر جانے سے روک دیا۔

”کافر..... کافر..... پیچھے ہٹو..... پیچھے ہٹو.....“ دونوں بیک وقت بولے۔

”کون کافر.....؟“ میں نے کہا۔

”یہ..... یہ..... کافر..... کافر..... باہر جاؤ۔“

”اور میں.....؟“ میں نے کہا۔

”بے دین..... بے دین..... مشرک، مشرک پیچھے ہٹ جاؤ۔ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تم مزار پاک کو ناپاک کرنے جا رہے ہو تو تمہیں مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ چلو، باہر نکلو۔“ انہوں نے چھری سے اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے سینے میں سخت تکلیف کا احساس ہوا۔

ہم باہر آ گئے۔ کوروتی بھی صورت حال سمجھ گئی تھی۔ اس نے حیرانی سے کہا۔ ”انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں ہندو دھرم سے ہوں۔“

”یہ مزار پاک ہے۔ یہاں کیا کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ اور پھر بات ہندو مسلمان کی نہیں ہے۔ بہت سے مزارات پر ہندو عقیدت مند بھی جاتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں لیکن تمہارا ماضی جادوؤں سے بھی منسلک رہا ہے اور جادو ہر مذہب میں حرام ہے۔“

”اور تمہیں کیوں روک دیا گیا۔“ تم تو مسلمان ہو۔“

”مجھے آج ایک اور غم ملا ہے کوروتی۔“ میں نے

مغموم لہجے میں کہا۔

کوروتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”کیوں؟ تمہیں کیا غم ملا؟“

”تمہارے ساتھ رہ کر میں بھی بے دین اور مشرک ہو گیا۔ آہ میرا ایمان بھی گیا۔“ میں نے مغمو

میں کہا۔ بات سچ تھی نادانستہ ہی یہی کوروتی کے ساتھ رہ کر میں نے جو کچھ کیا تھا وہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہم مایوس وہاں سے واپس چل پڑے۔ اچانک کوروتی نے کہا۔ ”عالی، ہم مایا دوارا ضرور جائیں گے۔“

”کیسے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ دوسری سیڑھیاں، ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وہاں اندھیرا بھی ہے۔ اس نے ان سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔“

”وہ بری طرح ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ ادھر سے کوئی

اوپر نہیں جاتا۔“

”ہم جائیں گے۔“

”یہ غلط ہوگا کوروتی۔ مجھے منع کر دیا گیا ہے۔

میں یہ گناہ نہیں کروں گا۔“

”میں کروں گی میں ان سیڑھیوں کے اوپر جاؤں گی۔ پہلے میں جاؤں گی اور اگر میں اوپر پہنچ جاؤں تو پھر تم بھی آ جانا۔“ اس نے منہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانی، میں نے دل میں سوچا کہ بھاڑ میں جائے مرنے ہے تو مرے۔ اسے جو بھی نقصان پہنچا اس کی وجہ میں نہیں ہوں گا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اوپر چڑھنے لگی۔ میں نے نیچے کھڑا اسے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ اوپر..... بالکل اوپر مزار پاک کے گنبد پر روشنی کے بلب لگے ہوئے تھے جن سے کچھ روشنی اس طرف آرہی تھی وہ کوئی بسی فٹ اوپر پہنچ گئی اچانک میں نے اسے ٹھکرتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر ٹھٹھکنے کی وجہ بھی مجھے نظر آ گئی۔ وہ ایک کالا ناگ تھا جس نے اس کا راستہ روکا تھا۔

کوروتی رک گئی تھی۔ کالے ناگ نے پوری سیڑھی پر اپنا پھن پھیلا رکھا تھا۔ اچانک مجھے کوروتی کی آواز سنائی دی۔ ”میں بابا دوارا ضرور جاؤں گی ناگ مہاراج۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے ڈس لو گے مگر میرا کیا بگڑے گا تم اتنا بھی نہیں جانتے میں۔“ ”امر“ ہوں۔

لیکن اس کی امر تا دھری رہ گئی۔ سانپ نے اپنا



تھی کچھ سے کچھ بن گئی تھی بس فٹ کی بلندی سے نیچے  
گری تھی لیکن نہ جانے اس وقت اسے میری کون سی  
بات پسند آگئی تھی کہ ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اور اس  
کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

”آؤ نا.....“ اس نے تازہ بھرے انداز میں کہا۔

”اب کہاں جا رہی ہو؟“

”بس تھوڑی دور۔“

”یہاں کیوں نہیں؟“

”اب یہاں کیا کریں گے، جس کام سے آئے

تھے وہ نہیں ہوا۔ بابا جی نے سونیکار نہیں کیا۔ ہر کوشش

کر لی۔ اب یہاں نہیں رکھیں گے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے قدم

آگے بڑھا دیئے۔ وہ پتہ نہیں ان راستوں کے بارے میں

کیسے جانتی تھی۔ ہم بہت دور نکل آئے۔ میں بری طرح

تھک گیا تھا۔ ایک جگہ میں رک گیا۔ تو وہ بھی رک گئی۔

”میں تھک گیا ہوں کوروتی۔“ اب آگے نہیں جاؤں گا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ اور ہم ایک جگہ

منتخب کر کے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ ”بھوک لگی ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ ”اتنے اونچے سے میں گری

ہوں اور ناراض تم ہو رہے ہو۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک عجیب سی شرم کا احساس ہو رہا تھا وہ ہندو تھی،

دوسرے مذہب سے تعلق رکھتی تھی مجھے اس مزار پاک

پر اسے لے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ پتہ نہیں دل میں یہ

خیال کیوں نہیں آیا۔ کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ تمہیں

ایک گندی اور ناپاک روح کو مزار مقدس پر لے جانا ہی

نہیں چاہئے تھا خود تمہارا بھی ایمان خراب ہو چکا ہے۔

میں نے اس بات کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اچانک

اس نے مجھے آواز دی۔

”عالی۔“

”ہوں۔“ میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

”ایک بات کہوں۔“

پھن او نچا اٹھا کر اس کے سینے پر مارا اور میں نے اسے فضا  
میں اچھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بیس فٹ کی بلندی سے نیچے  
آ رہی تھی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا کہ کہیں

میری ہڈیاں پسلیاں ایک نہ ہو جائیں۔ وہ دھب سے

نیچے آ گری تب میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

”میں نے منع کیا تھا کوروتی، آؤ اٹھو۔ تمہیں

چوٹ تو لگی ہوگی۔“ میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دینا چاہا

مگر اس نے قبول نہیں کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”چوٹ لگی

ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں..... میں جھٹکے دار آواز میں بولی اور اٹھ

کھڑی ہوئی۔ بیس فٹ سے گری تھی اور انسانی بدن میں

تھی۔ چوٹ لگنا تو فطری بات تھی۔ گروہ بھی ہٹا بھرم

تھی۔ اس نے میرا سہارا بھی قبول نہیں کیا اور آگے

بڑھنے لگی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ اس

درخت کے پاس نہیں رکی جہاں میں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

”سنو کوروتی۔“ میں نے اسے آواز دی۔

”خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔“ اس کی

آواز میں ایک حکم تھا۔ میرے قدم رک گئے مجھے اس

کے لہجے پر غصہ آ گیا تھا۔ میں اس کا محکوم تو نہیں

ہوں۔ وہ تھوڑی سی آگے نکل گئی پھر اسے احساس ہوا کہ

میرے قدم اس کے ساتھ نہیں اٹھ رہے۔ اس نے رک

کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”ارے۔ کیا ہوا۔“

”کہاں جا رہی ہو۔“

”آگے کہیں رکھیں گے۔“

”کیوں..... یہاں کیوں نہیں..... میں نے

سرد لہجے میں کہا۔ اور وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر ہنس پڑی۔

”بڑے کٹھور ہو تم۔ مجھے بد صورت بھکارن

بنادیا اور خود۔“

”خود کیا؟“ میں نے بدستور غصے سے کہا۔

”اتنے کے اتنے سندر ہو۔“ وہ پیار بھری

نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

عورت کیا شہ ہے۔ برے حالات سے گزر رہی



”بولو۔“

”میں نے ہندو دھرم کا اپمان تو نہیں کیا ہے۔“  
”کیا مطلب؟“

”تمہارے دھرم کے بزرگ نے تو میری مشکل دور نہیں کی۔ لیکن ہمارے دھرم میں بھی تو بھگت ہوتے ہیں۔ دھرماتما ہوتے ہیں سادھو سنیا سی ہوتے ہیں۔ اور کالے جادو والے ہوتے ہیں کیوں نہ اب کسی ایسے مہاتما کو تلاش کیا جائے۔“  
”تم چاہو تو ایسا کرلو۔“

”صرف میں؟“

”تو پھر کیا؟“

”نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اور ایسی بات مت کرو، میں تم سے دور بھی ہوگئی تو بھی اب تو تم مجرم بن گئے ہو۔“ تمہارے اپنے ہی تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے میں تو پھر بھی تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہوں گی۔  
”مجھ پر احسان مت رکھو۔“

”پریم احسان نہیں ہوتا۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ میں خاموش ہو گیا، ایک طرح سے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے پاس اب کیا رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ جان بچانے کے لئے چھپتا پھروں۔  
نہ ذیشان رہا نہ عالی۔

بہت دیر گزر گئی تو میں نے کہا۔ ”تو تم اب کسی مہاتما کو تلاش کرو گی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کہاں ملے گا وہ تمہیں۔“

”تلاش کرنے سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے۔“ اس نے کہا۔

دوسرے دن ہم چل پڑے۔ فقیروں کے تو بڑے مزے ہوتے ہیں۔ یہ اب پتہ چلا تھا۔ ہم ترس کھا کر اور خدا کے خوف سے انہیں اپنی ضرورتیں روک کر دیتے ہیں اور یہ پیش کرتے اور ہم پر ہنستے ہیں۔ ہمیں بھی خوب بھیک مل رہی تھی حالانکہ ہم بٹے کٹے تھے کسی سے مانگتے بھی نہیں تھے۔

میرادل ہر وقت کنتار ہتا تھا۔ آہ کیا حسین زندگی تھی اور اب۔۔۔۔۔ واہ ذیشان عالی واہ۔ آوارہ گردی، صرف آوارہ گردی، کہیں بھی بسیرا کر لیتے، کہیں بھی نکل چلتے۔ میری حالت بھی بس عجیب تھی، کبھی کوئی پولیس والا نظر آ جاتا تو جان نکلنے لگتی۔ حالانکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو اس بار پھانسی کی سزا سنائی جائے گی۔ ان سوچوں کے درمیان دم گھٹتا تھا۔ کم بخت کوروٹی ان حالات میں بھی خوش تھی اور مجھ پر اپنی اوادوں کے تیر برساتی رہتی تھی۔

اس دن بھی ہم ایک بستی کی طرف سفر کر رہے تھے۔ اب کہیں ایک جگہ تو نکتے نہیں تھے۔ بس کوروٹی کو کسی بھگت کی تلاش تھی اور مجھے زندگی کی۔ اس دن ہم نے ابتداء میں ایک بس سے سفر شروع کیا تھا ہم ایک بستی جا رہے تھے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بس راستے میں خراب ہوگئی۔ بستی زیادہ دور نہیں تھی اس لئے بس کے مسافروں نے بس ٹھیک ہونے کا انتظار نہیں کیا اور چل پڑے۔ ہم دونوں بھی چل پڑے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ ہم پریشان ہو گئے۔ پھر ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آئی تو ہم اس کی طرف دوڑے۔ عمارت بہت پرانی اور کاہی زدہ تھی لیکن اس میں بارش سے پناہ مل گئی۔ اور ہم دونوں ایک چھت کے نیچے بیٹھ گئے۔

بارش کا زور بڑھتا گیا۔ پھر کسی اور نے بھی اس عمارت کے نیچے پناہ لی۔ یہ ایک جٹا دھاری سادھو تھا کوروٹی اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔  
”جے رام جی کی مہاراج۔“

”جے درگا کنڈنی، جے کرم کنٹھالی۔“

”آپ درگا پنتھ سے ہیں؟“ کوروٹی نے پوچھا۔  
”ہاں درگامائی کا درس۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مہاراج۔“

”تو کون ہے۔؟“ سادھو نے پوچھا۔

”بس ایک دکھوں کی ماری ہوں۔ جیون کوروگ

لگ گیا ہے۔ کسی رشی منی کی تلاش میں ہوں۔“



میں خاموش ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ دوسری صبح بارش رک گئی تھی۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں جو ہمیں خیرات میں ملی تھیں کوروٹی کو تو کچھ کھانے پینے کی حاجت نہیں ہوتی تھی میں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ہم سادھو کے ساتھ چل دیئے۔

سفر زیادہ لمبا نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت ہم اس پرانے مندر کی عمارت کے پاس پہنچ گئے جو دیرانے میں تھی اور بہت بھیا تک نظر آ رہی تھی۔

”یہ تلک مہاراج کا استھان ہے۔“ سادھو نے بتایا۔  
”وہ یہاں رہتے ہیں؟“

”ہاں پاتال میں۔“

”پاتال میں؟“

”ہاں..... مندر کی اس عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے۔ وہیں پر وہ درگاد یوی کے جاپ کرتے رہتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔“

”ہمیں ان کے پاس لے چلے مہاراج۔“  
”تھوڑا سے بتالو۔ سورج ڈوب جانے دو۔“ سادھو نے کہا۔

مندر کی اس بھیا تک عمارت کو دیکھ کر میرے دل پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ لیکن بس تقدیر پر گزارہ کر رہا تھا جو بھی تقدیر میں لکھا ہو۔

شام ہو گئی اور سادھو ہمیں تلک کشوری سے ملانے لے چلا۔ مندر کے ایک گوشے میں نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سادھو نے کہا۔ ”میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ.....“ یہ کہہ کر وہ تہہ خانے میں اتر گیا میں اور کوروٹی دس کے پیچھے چل رہے تھے۔

سیڑھیاں جو کہ کہ شیطان کی آنت۔ کم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اوپر سے گھور اندھیرا۔ نہ جانے کتنی دیر ہم سیڑھیاں اترتے رہے۔ تب کہیں جا کر روشنی نظر آئی۔ یہ مشعلوں کی روشنی تھی جو تہہ خانے کی دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ آخری سیڑھی عبور کر کے ہم تہہ خانے میں بیچ گئے۔ یہاں مشعلوں سے کافی روشنی ہو گئی تھی اور اس

”پنڈت تلک کشوری سے بڑا اودانی کون ہو سکتا ہے دیوی، ان کے پاس سارے دکھوں کے علاج ہیں۔“  
”اچھا..... کہاں ملیں گے پنڈت تلک کشوری۔“

”یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ میں انہیں کے دوارا جا رہا تھا کہ راستے میں برکھارانی آ گئیں اور میں یہاں گھس گیا۔“ سادھو نے بتایا۔

”وہ بھی درگا پنتھی ہیں۔؟“ کوروٹی نے پوچھا۔  
”کچے درگا پنتھی۔ پر تمہیں کیا روگ ہے دیوی۔“  
”آپ مجھے ان سے ملا دیں گے مہاراج۔“ کوروٹی نے سادھو کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

”ادھر ہی جا رہا ہوں۔“ میرے ساتھ چل پڑنا۔“ سادھو نے کہا۔

رات ہو گئی۔ سادھو ہم سے دور ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔ ہم دونوں نے بھی ایک گوشہ اپنا لیا۔ میں نے کوروٹی سے پوچھا۔

”تم تلک کشوری کو اپنے بارے میں کیا بتاؤ گی؟“

”پہلے تو یہ دیکھوں گی کہ وہ خود کتنا گیانی ہے۔“  
میرے بارے میں اس کا گیان اسے کچھ بتاتا ہے یا نہیں پھر کوئی فیصلہ کروں گی۔“  
”یہ درگا پنتھی کیا ہوتا ہے۔“

”پنتھ مسلک کو کہتے ہیں۔ کالے جادو کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ اور اسے سیکھنے والے جادو کے دیوی دیوتاؤں کے داس ہوتے ہیں۔ ان کا واسطہ کالے جادو کے تمام استھانوں سے پڑتا ہے۔ پہلے درجے کے ”دیر، چھر، بیر، جھیر، دس، لونا چھاری، سرکے، پھر پدما، شنکھا اور کھنڈوے، بھوت اور چڑیل دوسری آتما میں ہوتی ہیں۔ جس طرح کالی دیوی کلکتے والی کالے جادو کی کھنڈولی ہے اسی طرح درگاد یوی کا پنتھ الگ ہے اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔“

”تو تلک کشوری کالے جادو والا ہے۔“  
”ہاں.....“



روشنی میں تہہ خانے کے پتوں بیچ ایک اور سادھو ایک مرگ چھالہ پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔

”جے درگا مائی کی۔“ ہمارے ساتھ آنے والے سادھو نے دوسرے سادھو کو ڈنڈوت کیا۔

مگ چھالا پر بیٹھے سادھو نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔ ”اس مسئلے کو بھی ساتھ لے آئی کوروتی۔“

میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ مسئلے، یعنی مسلمان، تلک کشوری کو کیسے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ دوسری طرف کوروتی بھی دنگ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اسے تو سادھو نے اس کا نام بھی لے کر پکارا تھا۔ دوسرے لمحے وہ پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھی پھر سجدے میں چلی گئی۔

”امبھو چون۔“ تلک کشوری نے پکارا۔

”جی مہاراج۔“

”یہ لونڈا مسلمان ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا مہاراج۔“

”ہمیں معلوم ہے۔“

”بھول ہو گئی مہا لکھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہمارے دوارا سب کے لئے

جگہ ہے۔ بیٹھ جاؤ کے۔“ تلک کشوری نے کہا۔ میرے پیروں کی جان نکل رہی تھی اس لئے میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ کوروتی اب تک سجدے میں پڑی تھی۔ تب تلک کشوری نے کا۔ ”اٹھ جا کوروتی۔“ تب کوروتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”دیکھا جیون مرن کا کھیل کوروتی۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چولی نہ ہو تو دامن بیکار ہے اور دامن نہ ہو تو چولی۔“

”جی مہاراج۔“

”تو امرت جل پی کر امر تو ہو گئی، پر اب جیون

کے نہ کور میں جلتی رہ۔“ تلک کشوری نے کہا۔

میں حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ یہ سادھو تو کوروتی کی پوری کہانی سن رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ کوروتی حیران تھی اور دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

”میں کیا کروں مہاراج۔“ کوروتی نے کہا۔

”اپنے کئے کا پھل بھوگ اور کیا کرے گی۔“

”میرے ساتھ اور جو کچھ ہوا ہے اس کے لئے کیا کروں گرتھی۔“

”اپائے ہے اس کا۔“

”میں واری جادوں مہاراج۔ میری سہائتا کریں۔“ کوروتی بولی۔

”آپ مجھے جو بتائیں گے کروں گی۔“

”وجہن دیتی ہے۔“

”جی مہاراج۔“

”پھر تجھے اس مسئلے کا خون پینا پڑے گا۔“ تلک کشوری نے کہا اور ہم دونوں دھک سے رہ گئے۔ کچھ منٹ خاموشی رہنے کے بعد سادھو نے کہا۔ ”بول کرے گی ایسا؟“

”نہیں مہاراج۔“ کوروتی نے سرد لہجے میں

کہا۔ اور میرے دل پر ایک عجیب سا احساس ہوا۔

کوروتی نے جواب دینے میں ایک لمحہ تاخیر نہیں کی تھی۔

”پھر ہمیشہ اسی میں رہے گی۔“

”ٹھیک ہے مہاراج اسی میں رہ لوں گی۔“

”بہت پریم کرتی ہے اس سے؟“

”ہاں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اور سادھو

خاموش رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔

”اپائے یہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔؟“ اس

کے ان الفاظ پر کوروتی چونک پڑی۔ ”ہم نے بس تیرا

امتحان لیا تھا کہ تو اس مسئلے سے کتنا پریم کرتی ہے۔“

”میں اسے بہت چاہتی ہوں مہاراج۔“ اس کا

بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

”چل چھوڑ۔ اپائے یہ ہے کہ تجھے پورا ایک

چندر ماہ ایک قبر میں دفن رہنا پڑے گا پورے ایک ماہ

تو اس اندھیری قبر میں رہے گی اس کے بعد جب اس

سے نکلے گی تو تیرا گوشت پوست واپس آ جائے گا

اور تیرا اثر پر پہلے جیسا ہو جائے گا۔“ سادھو نے کہا۔

”میں اس کے لئے تیار ہوں۔“ کوروتی جلدی



”جے ہومہاراج کی۔“ کوروتی نے کہا۔

”تم تیار ہو۔“

”ہاں بھگو کی پورن۔“ وہ بولی۔

”امبھو چرن۔“ تلک کشوری نے ہمارے

ساتھ آنے والے سادھو کو آواز دی۔

”جے بھگو کی۔“ وہ بولا۔

”اس کے لئے قبر تیار کر۔ ہمارے بیروں

کو ساتھ لگا لے۔“

”جو آ گیا پر بھو۔“ سادھو نے کہا اور وہاں سے

چلا گیا۔

”تم لوگ بھی باہر جا کر بیٹھو۔“ اور غور کر لو۔

ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ نہ جانے مجھے کیا

ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں ایک ایک لمحہ کوروتی سے جان

چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا لیکن اس وقت کچھ

عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ آخر کار امبھو چرن آ گیا۔

”چلو دیوی، تمہارا استھان تیار ہو گیا ہے۔ تم

بھی آؤ۔“ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بھی اٹھ گیا

بہت برا وقت تھا مجھ پر وہ کچھ دیکھنے جا رہا تھا جس کا

خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

امبھو چرن پھر ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں

سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور یہ سیڑھیاں واقعی تخت الثریٰ

تک گئی تھیں۔ ہمیں سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں اترنا

پڑا تھا۔ پھر ہم جس ہال نما جگہ پہنچے وہاں خوب روشنی تھی،

یہ روشنی مشعلوں کو جلا کر کی گئی تھی۔ یہاں انتہائی بھیا تک

شکلوں کے بے شمار مجسمے نظر آ رہے تھے۔ ہال میں کئی

کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر تلک

کشوری بیٹھا ہوا تھا۔ تلک کشوری سے کچھ گز کے فاصلے

پر زمین پر ایک قبر کھدی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

تلک کشوری نے کہا۔ ”یہ تیری قبر ہے کوروتی

جس میں تو مہینہ بھر رہے گی۔ تو بتا دے۔“

”جی مہاراج۔“

”چل پھر اس میں اتر جا۔“ تلک کشوری نے کہا۔

بھکارن کے روپ میں کوروتی نے آخری بار

سے بولی۔

”تو قبر میں رہے گی۔“ سادھو نے پوچھا۔

”ہاں مہاراج۔“ کوروتی نے جواب دیا۔

میرے دل پر اس وقت ایک عجیب اثر ہوا تھا۔

اس سے پہلے میں کوروتی سے نفرت کرتا آیا تھا۔ اور

ہر وقت اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا

رہتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے میرے لئے جس ایثار کا

اظہار کیا تھا وہ قابل قدر تھا۔ میں بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

”نہیں کوروتی، یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ایک قبر میں

زندہ دفن رہو۔“

”میں جہاں بھی رہوں گی عالی، جیتی رہوں گی

، کیونکہ موت مجھ سے دور چلی گئی ہے تم اس کی چننا مت کرو۔“

”لیکن کوروتی۔“ میں نے کہا۔

”میری بات سن لو۔ جیسا کہ بھگت مہاراج نے

کہا اس کے بعد جب میں قبر سے نکلوں گی تو پہلے جیسی

ہوں گی۔“

”مگر میری بات سنو۔“

”نہیں عالی۔ میں خوشی سے تیار ہوں، لیکن مجھ

سے ایک وعدہ کرو۔“

”کیا.....؟“

”جب میں پہلی جیسی ہو کر آؤں گی تو تم پیار

سے میرا سوا گت کرو گے۔ اس بیچ تم میری لگن لگا کر

یہاں مندر کے آس پاس میرا انتظار کرو گے۔ ایک

چندر ماں، ایک مہینے کی ہی تو بات ہے آنکھ بند کئے بیت

جائے گا۔“

”تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو.....؟“

”تمہارے یہ شبد میرے لئے نئے جیون جیسے

ہیں۔ تمہیں میرے نقصان کی فکر ہے، یہ میرے پریم کی

جیت ہے۔ پورے مہینے قبر میں دفن رہ کر میں تمہارے

ان شبدوں میں کھوئی رہوں گی میں سخت پریشان

ہو گیا تھا۔“

اس وقت بھگت کی آواز ابھری۔

”تمہاری پریم کتنا ختم ہو گئی۔“



میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور قبر کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت میرے دل کی حالت کیا ہو رہی تھی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کوروتی آرام سے قبر میں اتر گئی میں زندگی میں پہلی بار کسی زندہ انسان کو دفن ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قبر میں لیٹی چاروں طرف سے کوئی ڈھائی فٹ کے قد والے بونے نکل آئے۔ ان کی تعداد کافی تھی۔ وہ قبر کے نزدیک آ کر اس پر مٹی ڈالنے لگے۔ اور کچھ ہی منٹ میں قبر برابر ہو گئی۔

تب تلک کشوری اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کسی دھات سے بنا ہوا ایک ترشول، قبر کے نیچوں بیچ گاڑ دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”کام پورا ہو گیا میاں جی۔“ مجھے اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔ میں نے کہا۔

”اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔“

”اس کا جواب، مہالکھ تر و تیری سنگھان شری دیں گے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میری نظریں اس کے اشارے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میری رگوں میں خون جمادیا۔ سامنے کی دیوار میں ایک درندہ نمودار ہوا اور اس سے..... گوتم بھنسا لی باہر نکل آیا۔ رنگین دھوتی میں ملبوس تھا اوپری جسم پر ہنہ تھا اور اس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پیٹھ پر ابھرے کو بڑ پر بارہ سنگھے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بے حد بھیا تک نظر آ رہی تھی۔

میرے بدن میں ایک لمحے کے لئے تھر تھری دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہے۔ گوتم بھنسا لی اور یہاں؟ اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔

تلک کشوری، اور امھو چرن مودب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بونے بیر بھی ایک قطار میں کھڑے ہو گئے تھے، گوتم بھنسا لی آگے بڑھا۔ قبر کے پاس پہنچا اور خاموش کھڑا ہو گیا کچھ دیر کھڑا رہا پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”کوروتی۔ اس سنسار میں جتنا پریم میں نے تجھ

سے کیا ہے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا۔ میں اب بھی تجھ سے پریم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ صدیاں بیت گئیں تو نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی، مگر پریم کا کی نفرت بھی محبت کی جگہ ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے مگر کسی اور سے پریم بھی نہیں کرتی یہ بات میرے لئے اطمینان والی تھی، لیکن۔“

اس نے قبر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولا۔ ”اس پاپی نے میری برسوں کی تپسیا بھنگ کر دی۔ ارے میں تو اسے سدا سے چاہتا تھا۔ وہ مجھے نہیں چاہتی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، تو نے اس سے وہ سب کچھ لے لیا ہے جسے میں نے اپنا بھگوان مان رکھا تھا اور میں، میں راکھ ہو گیا۔ ہائے تو نے مجھ سے میرا مان چھین لیا۔ میں نے، میں نے مجبور ہو کر وہ کیا اس کے ساتھ جو، جو.....“

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میری تو آواز ہی بند ہو گئی تھی۔ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ”میں نے اس کا شریر بھسم کر دیا۔ اس پاپن نے میری امانت کسی اور کو دیدی تھی میں نے اسے خاک میں ملا دیا جبکہ میں نے اس کے سر سے ٹوٹ کر گرے ہوئے ایک بال کو بھی دھرتی سے اٹھا کر کلیجے سے لگا کر رکھا۔ میں نے..... میں نے اسے مٹا دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے گہری سرخ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ اس کا کارن تو ہے۔ صرف تو، اور میں۔ میں تجھے ماروں گا نہیں پاپی ہتھیارے وہ سزا دوں گا تجھے..... کہ، کہ..... وہ ہنس پڑا۔

میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو رہا ہے۔ بہت بڑا جال پھیلا یا گیا تھا میرے بعد کوروتی کے گرو۔ اور کوروتی اس جال میں پھنس گئی تھی وہ ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ ”وہ جو کہتے ہیں سو سنار کی ایک لوہار کی۔ میں نے جیون بھر اس کے دار صرف بچائے اس پر کوئی وار نہیں کیا مگر..... وہ میرے پہلے وار میں چت ہو گئی۔ ہائے، مگر..... سن بتاؤں۔ میں نے کیا۔“



وہ رکا پھر بولا۔

”بڑا کام کیا ہے میں نے۔ بڑا کام کیا ہے۔“

میں خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اب اس نے اپنی حالت سنبھال لی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ ”ہر ترکیب ناکام ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں تو نے اس کے من میں کیا پھونک دیا تھا۔ میں نے اس کا شریرانہ کر دیا۔ کیونکہ مجھے اس کا شیر نہیں آتا پیاری ہے جب کچھ باقی نہ رہا تو میں نے یہ کیا۔ میں اس کے سامنے کسی بھی روپ میں آتا وہ مجھے پہچان لیتی کیونکہ ہماری صدیوں کی شناسائی ہے۔ اس لئے میں نے ان دونوں کو تیار کیا۔ یعنی تلک کشوری اور امبھو، اور تم پر جال ڈالا، تم دونوں یہاں آ گئے۔ آہ..... میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ صرف تیرا کر یا کرم کرویتا مگر اس نے اپنے گیان سے تجھے میرے ساتھیوں سے محفوظ کر دیا۔ میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا یہ میری سب سے بڑی مجبوری تھی لیکن میرا بھی ایک گیان ہے۔ میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا ہے وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی جب تک میں اسے نہ نکالوں اسے وہاں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا بلکہ اس کے شریر کو کڑے مکڑے ٹھیک کر دیں گے۔ وہ اس کے پنجر میں اپنے گھر بنالیں گے اور اس کا شریر بھر جائے گا۔ جب وہ اس قبر سے نکلے گی تو پہلے جیسی ہوگی لیکن تو.....“ اس نے ایک ہدیا نی قہقہہ لگایا۔ ”تو اس سے تک مر چکا ہوگا۔ مر چکا ہوگا تو..... پھر دیکھوں گا وہ کسے چاہتی ہے۔ میرے من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“

میرا سر بری طرح چکرار ہا تھا۔ آہ، وہ شیطان کا دوسرا روپ تھا۔ کم بخت نے کیا عمدہ ترکیب سوچی تھی وہ پھر بولا۔

”اب تو اپنے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ کہ تیرا کیا ہوگا کالیا۔“

”کیا ہوگا میرا.....“ میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔ اب میرے دل سے خوف دور ہو چکا تھا۔

”وہ جو کسی کا نہ ہوا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟“

”جئے گا تو، جئے گا، لیکن۔ مر مر کر جئے گا۔“

”وہ کیسے.....؟“ میں نے پوچھا۔

”بتاؤ رے اسے، وہ کیسے.....؟“ گوتم بھنساالی نے ان ننھے بھیا تک ہونوں کو اشارہ کر کے کہا۔ اور اچانک وہ اس طرح منتشر ہوئے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں پتھر مار دیا جائے۔ لیکن کم بخت مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ننھی ننھی لائیں، گھونے پھٹر، بظاہر تو سب کچھ ننھا ننھا تھا لیکن میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ خوب مرمت کی انہوں نے میری اور میرے حواس جواب دینے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اور پھر یہ یہ اندھیرا مستقل ہو گیا۔

آنکھ ہی کھلی تھی نہ جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کا احساس بھی بدن کی تحریک سے ہوا تھا۔ کیونکہ ایسا بھیا تک اندھیرا تھا کہ شاید اس سے گہری تاریکی کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ بدن کے نیچے پکی زمین تھی جس کا احساس ٹول کر کیا۔

کیا کم بختوں نے میری آنکھیں نکال لیں۔ میں نے سوچا اور میرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر چلا گیا۔ میں نے انہیں اچھی طرح چیک کیا دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔

پھر یہ تاریکی اپنی حیات سے یہ انداز لگانے کی کوشش کی کہ اس تاریکی کا راز کیا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات بھی یاد آئے۔ انہوں نے کوروتی کو قبر میں دفن کر دیا تھا۔ تو کیا مجھے بھی کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے؟ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اتنی گہری تاریکی قبر کی ہی ہو سکتی ہے۔

جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں سے ٹول کر پھر اندازہ لگایا کہ کیا یہ قبر ہے۔ لیکن فرش تو پکا تھا۔ اور آس پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ قبر اتنی کشادہ کہاں ہوتی ہے۔ نہیں یہ قبر نہیں ہے کوئی تاریک کمرہ۔ لیکن روشنی کیوں نہیں ہے۔

”کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے؟“ میں نے آواز لگائی اور یوں لگا جیسے میری آواز دور تک گونجی ہو۔ کافی



بڑی جگہ تھی۔ آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہوتی گئیں۔ کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ ایک لمبی سرنگ نما جگہ تھی۔ جو دور تک چلی گئی تھی۔ اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ کھڑا بھی نہیں ہوا جاسکتا تھا۔

میں نے کچھ توقف کیا۔ کھڑے ہونے کی کوشش کی تو صاف اندازہ ہو گیا کہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جھکے جھکے چلتا ہوا اس سرنگ کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے پلٹا تو دوسرے سرے تک آیا عجیب و غریب جگہ تھی۔ ناقابل یقین حد تک عجیب ہو سکتا ہے مندر کے نیچے کوئی اور تہہ خانہ ہو۔

لیکن اس کا دروازہ کہاں ہے؟..... آہ کم بخت بھنسا لی نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی عذاب بنا دے گا۔ اور اس عذاب کا آغاز ہو گیا۔ تہہ خانے میں ایسے دوزن بنے ہوئے تھے جن سے ہوا اندر آسکے، رات اور دن کا تعین ہو سکے اس وقت گہری رات تھی میں تھک کر زمین پر ایک جگہ لیٹ گیا۔ اور میرے ذہن پر سوچوں کی یلغار ہو گئی۔ پھر نیند آ گئی۔

دوسری صبح جاگا تو سورج کی ایک کرن ایک دوزن سے سیدھی میری آنکھ پر پڑ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شدید پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن پوری سرنگ میں کچھ نہیں تھا کافی دیر تک اس طرح بیٹھا رہا۔ اچانک دور سے ایک کھڑکھڑکی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ایک چوہا تھا۔ جو بل میں گھس گیا تھا۔

دوپہر ہو گئی، پھر شام، آہ انداز ہو گیا تھا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح بھوک پیاس سے جان دینی پڑے گی۔

دوسرا دن، تیسرا دن اب زمین پر لیٹ گیا تھا۔ موت کی آہٹیں آس پاس سے گزرتی محسوس ہو رہی تھیں بس انتظار تھا۔ موت کا انتظار تھا نیم غشی کے عالم میں کروٹ بدلی تو ہاتھ کسی شے پر پڑا۔ کوئی برتن تھا۔ وہم ہے، میں نے دل میں سوچا۔ لیکن وہم نہیں تھا برتن ہی تھا اور برتن میں کوئی سیاہ شے موجود تھی بس کوئی سیال شے ہے چاہے وہ زہر کا پیالہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اٹھا اور اسے منہ سے اگالیا۔

کیا مر رہا ہے۔ کیا شے ہے۔ کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہاتھ پیروں میں شدید سنسنی ہو رہی ہے۔ پلکیں جھکی آ رہی ہیں۔ اور پھر دماغ سو گیا۔ پھر دو دن، رات، یہ گزرے دن رات مجھ سے میری ذہنی قوتیں چھین رہے تھے۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ وقت کا احساس بھی ختم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں تھا کہ اب کیا ہوگا، یا آگے کیا ہونے والا ہے۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا گلے سڑے پھل، سبزیاں، پینے کے لئے عجیب عجیب سیال آ جاتے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کون لاتا تھا اب تو یہ خیال بھی دل سے نکلتا جا رہا تھا۔

یوں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اب مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ سب کچھ بھول گیا تھا کیا کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں، کہاں سوتا ہوں، لباس کی کیا کیفیت ہے، دماغ سن ہو رہا تھا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں تقریباً ختم ہو گئیں تھیں، بس کبھی کبھی خیالات کی ہلکی لکیروں میں اپنا تصور جاگ اٹھتا تھا۔

بہت دن گزر گئے، پھر ایک دن جب آنکھ کھلی تو ماحول بدلا بدلا سا تھا۔ میرے بدن کے نیچے کھردری زمین نہیں تھی بلکہ ایک جانی پہچانی سی نرمی تھی۔ یہ نرمی..... میں نے سوچا، پتہ نہیں کیا ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جہاں بیٹھا تھا اور اس پر نرم گدا بچھا ہوا تھا۔ اور..... اور میرے بدن پر..... میرے بدن پر نیا لباس تھا مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی میں اس غار میں نہیں تھا بلکہ یہ ایک کمرہ تھا۔ ہاں اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ یہ ایک کمرہ ہے۔ اور میں یہاں موجود ہوں۔

کچھ فاصلے پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا۔

نہ جانے کیوں مجھے ایک بات ضرور محسوس ہو رہی تھی، وہ یہ کہ مجھے اس جگہ سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے اور یہ کوئی نامانوس جگہ ہے۔

پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میرے جیسا انسان تھا بس کچھ عجیب سا تھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، قد



چھوٹا سا تھا پیٹھ پر جیسے گٹھری سی بندھی ہوئی تھی وہ میرے پاس آ گیا۔  
”کیسے ہو عاشق نامراد.....؟“ اس کی آواز ابھری۔

”اچھا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔  
”ویسے عاشق نامراد تو میں ہوں۔ تم نے تو گھر بیٹھے ساری مرادیں پوری کر لیں۔ اب بھی یاد آتی ہے۔“

”کون؟“ میں غیر اختیاری طور پر بول رہا تھا۔  
اب جبکہ اس نے مجھ سے باقاعدہ باتیں شروع کی تھیں تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔  
”کوروٹی کی بات کر رہا ہوں۔“

”کوروٹی.....؟“ میں نہ سمجھنے والے لہجے میں بولا۔  
”بھول گیا اے۔“ اجنبی کبڑے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”میں کسی کوروٹی کو نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔  
”بھول مجھ سے ہوئی تھی۔“ وہ بولا۔ نہ جانے کیوں اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ یہ منحوس شکل کا کبڑا بکواس کئے جا رہا ہے۔ اس کی بکواس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرا سر بھی چکرار ہا تھا اور شاید مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

”میں بھوکا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”چل ٹھیک ہے۔ پہلے تیری پیٹ پوجا کرادی جائے اس کے بعد تجھ سے باتیں کریں گے۔ اب مزہ آئے گا تجھ سے باتیں کرنے کا۔ اور سن یہاں سے باہر جانے کی کوشش مت کرنا مزید جو کچھ ہوگا اس کا ذمہ دار تو خود ہوگا۔“

کبڑا کمرے سے باہر نکل گیا۔  
میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھیں لیکن میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں کون ہوں کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ وہ گندی جگہ مجھے یاد تھی جہاں میں رہتا تھا، وہ تاریک سی جگہ جہاں بدبو پھیلی ہوئی تھی، یہاں ایسا نہیں ہے۔ تاریکی بھی نہیں ہے، بدبو بھی نہیں

ہے، اور یہ سب اچھا ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔  
کیا میں اس جگہ کو پہلے سے جانتا ہوں؟ کیا میں پہلے بھی کسی ایسی ہی جگہ رہتا تھا؟ مگر کہاں اور یہ بد شکل انسان؟ اس سے بلاوجہ نفرت محسوس ہوتی تھی یہ کون ہے۔ اور یہ ایک نام لے رہا تھا۔ وہ کون ہے۔ کیا نام تھا.....؟ ہاں کوروٹی ضرور کہیں یہ نام سنا ہے۔  
ساری باتیں اپنی جگہ، کوئی اہم بات یاد نہیں آ رہی تھی لیکن ایک احساس ضرور تھا کچھ ضرور تھا جو میرے دماغ میں کھو گیا ہے۔

دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ میرے لئے کھانا لائے تھے۔ آیا کیا عمدہ کھانا ہے۔ کیسی اچھی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ پیٹ بھر گیا اور آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔  
میں مسہری پر جا کر سو گیا۔ جاگا تو پھر وہی اندھیرا تھا۔ لیکن یہ اندھیرا اس غار کا نہیں تھا۔ بلکہ رات کا وقت تھا اور میں اسی نرم گدے والے بستر پر سو رہا تھا۔

میں نے سست انداز میں نرم تکیہ بازوؤں میں لیا اور پھر سو گیا۔ پھر نہ جانے کب جاگا تھا۔ یہ سب مجھے برا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ ہی دل میں کوئی احساس تھا کہ کہیں جاؤں۔ یہاں سب ٹھیک تھا۔ اس وقت خوب تیز روشنی تھی جب وہی کبڑا منحوس میرے کمرے میں آ گیا۔ مجھے بیشک اس کی شکل سے چڑھوتی تھی۔ لیکن اس وقت وہی میرے لئے سب سے مہربان شخص تھا وہی میری ضرورتیں پوری کر رہا تھا۔

”کیسے ہو شیاام سندر جی۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔  
”مجھ سے کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔  
”ہاں۔ یہاں اور کون ہے۔“  
”میرا نام شیاام سندر ہے؟“

”ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ چلو اپنا نام خود بتاؤ۔“  
”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔  
”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ بولا۔  
”کیا مطلب؟“  
”کہ تمہیں اپنا نام نہیں معلوم۔“  
”مجھے میرا نام بتاؤ۔“ میں نے غصے سے کہا۔



”سندر تو تم ہو، میں نے شام لگا دیا ہے۔ تمہارا نام شام سندر ہی ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے۔“ میں نے پوچھا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر گردن ہلاک کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے تم سوچ سکتے ہو۔ اور کیا کیا سوچ سکتے ہو، تمہیں کوروتی یاد ہے؟“

”نہیں۔ یہ نام تم پہلے بھی لے چکے ہو۔“

”ہائے..... ایسا پہلے ہو جاتا۔ وہ اپسرا ہے، سنسار کا سارا حسن اس کے اندر رہتا ہے۔“ وہ رکا پھر بولا۔ ”رہتا تھا.....“ اس کے لہجے میں درد تھا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔“

”سمجھتا ہوں۔ سمجھانے ہی آیا ہوں۔ وہ اپسرا تھی راجہ اندر کی سبھا میں بھی اس سے سندر اپسرا نہیں ہوگی کوئی۔ میں اس سے پریم کرتا تھا۔ بھگوان بھی وہ میری۔ مگر اسے اپنی سندرتا پر بہت گھمنڈ تھا۔ اور میں، بد صورت تھا پھر اسے امرت جل مل گیا وہ اسے پی کر امر ہو گئی، مگر..... مجھ سے بھول ہو گئی۔ بہت بڑی بھول۔“

وہ خاموش ہو کر رکو میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ کہانی اچھی لگی تھی۔ میں کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”آگے کہو۔“

”ہاں۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔“

”کیسی بھول؟“

”بچا کچھا امرت جل میں نے پی لیا۔“

”امرت جل کیا ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سنسار کی سب سے بڑی چیز، بھگوان نے جیون، مرن رکھا، جیون اس لئے دیا کہ منش بھگوان کے بنائے ہوئے سنسار سے مزے لے، اس میں رہ کر جیون کے سکھ اٹھائے اور پھر دوسروں کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ بھگوان کے سنسار کو چھوڑ کر نہ رکھ، یا سورگ میں چلا جائے۔ مگر کچھ ”جیون کے موبھی“ (زندگی کے لالچی) سنسار کی جان نہیں چھوڑنا چاہئے۔ وہ موت سے

ڈرتے ہیں اور جیون سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بھگوان کے اصولوں سے اس کے وچاروں سے منہ پھیرنے والی بات ہے۔ اس نے ترازو کھڑی کر دی۔ سچ بولو، پورا تو لو اگر اس کے وچاروں سے منہ پھیرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ جیون تو دیا گیا ہی مرنے کے لئے ہے۔ بھگوان نے امرت جل بھی بتا دیا کہ پیو گے تو تمہیں موت نہیں آئے گی۔ پرنو، لمبا جیون سنسار کی سب سے بری چیز ہے۔ ہائے کوئی موت کے مزے کو جانے۔

اس کی آنکھیں نشلی ہو گئیں جیسے وہ موت کی شراب پی رہا ہو۔

دوسری طرف اس کی باتیں کافی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھیں۔

”کیا نام ہے تمہارا۔“

”ایں.....؟“ وہ جیسے سوتے سے جاگ گیا۔ پھر بولا۔ ”دھت تیرے کی، سارے سپنے توڑ دیئے۔“

”تم پسند دیکھ رہے تھے۔“

”ہاں رے۔ بڑا ہی سندر پسند۔“ پتہ ہے کیا دیکھ رہا تھا میں؟

”تمہارے سپنوں کا مجھے کیا پتہ۔“ میں نے کہا۔ اس سے بات کر کے مجھے مزہ آرہا تھا۔

”میں دیکھ رہا تھا کہ میرا دیہانت ہو گیا ہے۔“

”دیہانت کیا.....؟“ میں نے کہا۔

”ابے میں دیکھ رہا تھا کہ میں مر گیا ہوں۔“ اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو اردو میں مروتا۔“ میں بولا۔

”اردو کا بچہ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”تو تم نے دیکھا کہ تم مر گئے ہو۔“

”ہاں اور میری ارتھی رکھی ہے۔ میرے کریا کرم کی تیاری ہو رہی ہے۔ مجھ پر سیندور اور گلاب کا عرق چھڑکا جا رہا ہے۔ لوگ رورہے ہیں اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے ہیں۔“

”یعنی تم اپنی موت پر تم خوشی سے رورہے ہو؟“

”تو اور کیا۔ مرنے کے کتنے مزے ہوتے ہیں



اور... وہ ہو گیا جو جیون بھر نہیں ہوا تھا۔ ہائے جو میرا تھا وہ تیرا ہو گیا ہائے ہائے، تو نے مجھے مار دیا پاپی، جب تک برداشت ہوا کرتا رہا۔ پھر..... پھر.....! ”اچانک اس کا سانس میری طرح پھولنے لگا۔“

”بتا رہا ہوں ہتھیارے۔ بتا رہا ہوں۔ میں نے تیرا روپ دھارن کر کے اس کا شریر گلا دیا۔ اس سے اس کی سندرتا چھین لی جو میرا تھا اس پر تیرا قبضہ ہو گیا تھا۔ اب نہ کچھ تیرا رہا نہ میرا، وہ ڈھانچہ بن گئی۔ مگر اس نے تیرا پیچھا چھوڑا نہ تو نے اس کا۔ وہ جس میں نے لاکھوں سال پوجا کی اسے میں نے جیل بنادیا۔ جیل بنادیا میں نے۔ پر اس نے تجھے حاصل کرنے کا کام جاری رکھا اور سندرناریوں کی جان لے کر ان کے ذریعہ تجھے خوش کرنے لگی تو خود سوچ مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچانے کے لئے اپنے گیان سے کام لیا اور اک ایسی چال چلی کہ میں تجھے نہیں مار سکتا ورنہ اب تک تو تیری ہڈیاں بھی بھسم ہو گئی ہوتیں اور پھر میرا صبر ختم ہو گیا۔ میرے من کی آگ نے مجھے پھونک دیا اور میں نے وہ قدم اٹھالیا۔

اس کی آواز لرز گئی۔  
”کون سا قدم؟“ میں سوال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔  
”بتا تو چکا ہوں تجھے ہتھیارے۔ میں نے اسے گلا کر ڈھانچہ بنادیا۔ اب وہ تیری رہی نہ میری مگر مجھے لگتا ہے میں نے اب ٹھیک کام کر دیا ہے۔“  
”وہ کیا.....؟“

”میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا ہے اور تجھے۔ تجھے میں نے مہان بے کال کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تو بے کالی بن کر رہے گا۔ گیان گرد دھاری کا داسی کال منی کالی دیوی کا بھر منگی، سادھو منش، میا منی کے چرنوں کی دھول پھانک لے گا تو لوگ تجھے سادھو منت سمجھ کر تیری سیوا کریں گے، تجھے تو روکھی سوکھی کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی..... پھر..... پھر تو مر جائے گا اور..... اور ہم جیتے رہیں گے۔ میں بھی..... اور کوروتی بھی، میں

تو کیا جانے پاپی۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔  
”میں نے تمہارا نام پوچھا تھا۔“ میں نے کہا۔  
یہ حقیقت ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ میں نے خود کو بھولے ہوئے گزارا تھا لیکن بعد میں جب میری یادداشتیں واپس آئیں تو مجھے گزرے ہوئے یہ لمحے بھی من و عن یاد آ گئے جو میں نے اس لمحے میں گزارے تھے۔ اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

”گو تم بھنسالی ہے میرا نام۔“  
”اوہ ٹیڑھا نام ہے۔“ میں نے کہا۔  
”سب بھول گیا سرے۔ اچھا ہوا۔ اب مزے کر، میری محبوبہ قبضے میں کر لی تھی۔ مجھے جو کرنا پڑا ہے۔ تیری وجہ سے کرنا پڑا ہے۔ ورنہ اور کچھ نہیں تو..... تو..... وہ کسی اور کی تو نہیں تھی۔“  
”کون.....؟“ میں نے پوچھا۔  
”کوروتی، کوروتی، کوروتی۔“

”میں کسی کوروتی کو نہیں جانتا، میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔“ وہ سوچتا رہا، پھر بولا۔

”تو میں بتا رہا تھا کہ بچا کچھا امرت جل میں پی گیا۔ ہائے کتنا اچھا ہوتا، میں اسے پریم تو کرتا تھا مگر اسے صدیوں جیتا نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بھی مرجاتی میں بھی مرجاتا، پریم کہانی ختم ہو جاتی۔ مگر دونوں کشت میں آ گئے۔ میں اس پر جان دیتا تھا اور وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی، وہ بھی صدیوں کا سفر کرتی رہی میں بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ بہت چالاک تھی، اس نے بڑے بڑے رشی، میلوں سے گیان سیکھے، گیان چھینے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے بھی کچھ گیان سیکھے مگر اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ پھر ہم تیرے ہاتھ لگ گئے اور برا سے آ گیا۔

”میرے ہاتھ؟“ میں نے حیرت سے کہا۔  
”جانے دے جانے دے۔ شام، سندر، آخر تیرا کھیل تو ہو گیا مگر تو پوری کہانی سن۔ وہ پتہ نہیں کیسے تیرے پریم جال میں پھنس گئی اور.....



اسے قبر سے نکال لوں گا۔ اور تو میری مان لے ایک دن وہ پکھل جائے گی۔۔۔۔۔ وہ سوچے گی کہ گوتم بھنسا لی بد صورت ہے تو کیا مجھ سے لاکھوں سال سے پریم تو کر رہا ہے۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ وہ مجھے سو بیکار کر لے گی۔“ اس کے چہرے پر پھر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ میری ذہنی حالت جوں کی توں تھی۔ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ ذہن پر کچھ مٹے مٹے سے نقوش تو ضرور تھے۔ یہ احساس تھا کہ میں شام سندر نہیں کچھ اور ہوں۔ لیکن کچھ اور کیا ہوں، یہ یاد نہیں تھا۔

”جا اور دے دعا دے کہ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچا دیا ہے۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر مجھے اس کی فضول باتیں یاد آنے لگیں۔ پتہ نہیں کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔

”آپ سچ ہے ہوں گے کہ یادداشت گم ہو جانے کے دوران باتیں مجھے کیسے یاد رہ گئیں اور میں ان کے بارے میں کیسے لکھ رہا ہوں تو میں اس کے بارے میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گا پہلے سے بتانا قبل از وقت ہوگا۔“

غرض یہ کہ وہ شخص جس نے مجھے اپنا نام گوتم بھنسا لی اور مجھے میرا نام شام سندر بتایا تھا وہ گیا، قبول اس کے کہ وہ دونوں جو مجھے اس مندر میں ملے تھے اس کے ہر کارے تھے جنہوں نے اس کا کام اس لئے کیا تھا کہ وہ عورت کو روٹی گوتم کو آسانی سے پہچان تھی اور پھر اسے قبر میں اتارنا ممکن نہ ہوتا۔

سب کچھ بھاڑ میں جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں کیا کروں۔ پتہ نہیں یہ کون سی عمارت ہے کہاں واقع ہے میں اس عمارت میں کسی کے قبضے میں ہوں۔ یا آزاد ہوں۔ اور کہیں بھی جاسکتا ہوں۔ جب اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکی تو جا کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دماغ کسی بھی قوت کی میراث نہیں ہوتا۔ اس پر صرف مندر کی قوت حاوی ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے۔ باقی سب اس کی غلط کاریاں ہوتی ہیں جو اس سے محبت

چھین لیتی ہیں۔

میں سو گیا، اللہ کی عطا کی ہوئی ساری قوتیں میرے ساتھ تھیں جن میں نیند بھی ہے۔ کیسی مزے کی بات ہے شیطان انسان کو بہکا تو سکتا ہے اس سے گناہ تو کرا سکتا ہے لیکن اس پورے وجود کے ساتھ جو اللہ کی عطا ہے وہ اس سے نیند نہیں چھین سکتا بھوک نہیں چھین سکتا یہاں وہ بے بس ہے۔

خوب جی بھر کر سویا۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ وہی کمرہ تھا، وہی جگہ تھی۔ لیکن رات ہو چکی تھی ماحول پر اندھیرا طاری تھا۔ پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”تم جاگ گئے؟“

سوال مجھ سے ہی تھا۔ میرے سوا یہاں کون تھا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ مندر میں کی دیو داسی جیسی ایک عورت تھی جو پہلے نے مندر اندہ طرز کے لباس میں ملبوس تھی۔ وہی مجھ سے مخاطب تھی۔ اس نے پھر سوال کیا۔

”تم جاگ گئے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں جاگ رہا ہوں۔“

”اٹھو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں۔۔۔۔۔؟“

”رہنوں کنڈ میں۔ میامنی گیان گروہارن کے دور۔ تاکہ تم ان کے چرنوں میں جا کر پوتر استھان حاصل کر لو۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن ان کے درمیان تھا۔ اور ایک بڑی اذیت ناک جگہ سے نکلا تھا اور دوبارہ اس جگہ نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ ان کے ساتھ تعاون ضروری تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

لباس وغیرہ تو انہوں نے دوسرا پہنا ہی دیا تھا۔ اور میں صاف ستھرا ہی تھا چنانچہ میں اس عورت کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی۔ اس ہال کے بارے میں کیا بتاؤں تاحہ نظر پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں بے شمار سادھو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں نہیں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کی مدھم



اذان کی آواز سنائی دی اور میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔  
”تو نے سنائیں شیا م سندر۔ سجدہ کر میا منی کے سامنے۔“

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔ یہ آواز مولوی قدرت اللہ کی تھی جو ہمارے محلے کی مسجد کے پیش امام تھے اور جب بھی کسی کے ہاں بیٹے یا بیٹی کی ولادت ہوتی تھی مولوی قدرت اللہ ہی اس کے کان میں اذان دیتے تھے۔ بڑے ہو کر میں نے اکثر سوچا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ بھلا اس آواز کو کیا سنتا ہو گا وہ تو دنیا سے ناواقف ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ آواز مجھے بتا رہی تھی کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اسی کو سجدہ جائز ہے۔ ایسے بت، اور پتھر کے ٹکڑے لاکھوں ہیں انہیں سجدہ کرنا حماقت ہے، گناہ ہے، شرک ہے۔

بہت سی آوازیں ابھریں۔

”کیا یہ میا منی کو سجدہ نہیں کرے گا۔ کیا یہ میا منی کا اپمان کرے گا۔ یہ ادھرمی ہے، یہ ہمارا دھرم سو یکا نہیں کر رہا ماروا سے جیتا جلا دو۔ مارو پاپی کو، اس نے گیان گردھاری کا اپمان کیا ہے اس نے۔“

”خاموش۔“ بادلوں میں جیسی گرج ابھری۔ اور آوازیں بند ہو گئیں۔ ”یہ دوسرے دھرم کا ہے۔ مہامنی کا دھرم سو یکا کرنے میں اسے سے لگے گا۔ ہم کون ہوتے ہیں اسے سزا دینے والے جس کا مجرم ہے وہ جانے۔“

یہ آواز جسے کے پیروں میں بیٹھے بھگت کی تھی جسے یہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے مخاطب کر رہے تھے۔ ”تم لوگ اپنی بھگتی کرو، یہ ٹھیک ہو جائے گا اور ایک دن تمہارے ساتھ تمہاری بھگتی میں شامل ہو گا۔“ بھگت نے کہا۔ پھر بولا۔ ”جاؤ رے۔ اسے اس کے استھان پر پہنچا دو۔“ فوراً ہی چار پانچ لمبے چوڑے سادھو اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے بازو پکڑ لئے۔ وہ مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے باہر نکالائے۔ یہ مندر نما جگہ بے حد وسیع تھی اور تو اور بڑے بڑے ہال اور اہاریاں تھیں جن کا ماحول بے حد پراسرار اور بھیا نک

آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہال کے درمیان ایک بہت بڑا بت نظر آ رہا تھا جس کے پیروں کے پاس ایک چٹان تھی اور اس چٹان پر ایک لمبے چوڑے بدن کا سادھو بیٹھا تھا جن نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کی گردن سے ایک کالا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کا چوڑا پھن کھلا ہوا تھا اور یہ پھن اس کے سر پر پھیلا ہوا تھا۔

یہ نقلی سانپ بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کا پھن کبھی کبھی ہلتا تھا اور گردن سے لپٹا بدن جگہیں بدل رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ ہے۔

پھر اچانک نیم تاریک ماحول روشن ہونے لگا۔ یہ روشنی اس دیو بیگل مجسمے کی آنکھوں سے نکل رہی تھی۔ ہال اتنا روشن ہو گیا کہ سب کچھ صاف نظر آنے لگا۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں میں آئی۔  
”شیا م سندر۔“

میں نے یہ آواز سنی، لیکن ابھی میں نے اپنا نام پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اس لئے میں خاموش کھڑا رہا۔ تبھی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے مجھے شیا م سندر کے نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ اسی وقت میرے ساتھ کھڑی اسی عورت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”تمہیں آواز دی جا رہی ہے۔“  
میں چند قدم آگے بڑھ کر مجسمے کے سامنے پہنچ گیا۔ ”تبھی مجسمے کے قدموں میں بیٹھے پجاری کی آواز ابھری۔“

”میا منی، تیرا تیا داس تیرے چرنوں میں آیا ہے۔ اس کی سیوا سو یکا کر۔“ پھر وہ میری طرف رخ کر کے بولا۔

”چل شیا م سندر، میا منی کو سجدہ کر۔“ یہ تجھے آشیر باد دے گا۔

”کیا کروں۔“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک کھڑا ہے، سجدے میں گر جا مہامنی کے چرنوں میں۔“ اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ اسی وقت نہ جانے کیا ہوا ایک مدھم سی آواز میرے کانوں میں



تھا پھر وہ ایک جگہ رکے ایک دروازہ کھولا جس کے دوسری طرف سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کو عبور کر کے مجھے ایک تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

یہ تہ خانہ بھی بہت وسیع تھا۔ لیکن اندر قدم رکھ کر خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن کو لرزائی۔ یہاں دیواروں کے ساتھ اور لاتعداد انسانی مجسموں کے سوکھے ہوئے پنجر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری خوف ناک بات یہ تھی کہ ان کی کھوپڑیوں میں چراغ روشن تھے جن کی روشنیاں ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے باہر آرہی تھیں۔

”تم یہاں آرام کرو۔“ مجھے لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”سنو..... میری بات سنو۔“

”بولو.....“

”تم مجھے یہاں سے کہیں اور نہیں لے

جاسکتے۔“

”نہیں۔“

”لیکن یہ.....“ میں نے کہنا چاہا لیکن جو شخص

مجھ سے بات کر رہا تھا اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”تم نے مہمانی کو سجدہ نہ کر کے اپنے لئے برا

وقت بلا لیا ہے۔ یہ سب جو اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں تم جیسے ہی ہیں۔ آرام کرو۔ اور سوچو۔“

وہ چلے گئے اور میں دہشت زدہ نظروں سے

چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آخر کار میں ایک جگہ زمین پر

لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت ایک بات کا

مجھے خصوصی احساس ہوا۔ حالات کتنے ہی بدلے ہوں

وقت کیسا ہی خراب کیوں نہ آگیا ہو قدرت نے انسان

کو کچھ سہولتیں دی ہیں جنہیں کوئی نہیں چھین سکتا

اگر قدرت نہ چاہے اور ان میں سے ایک نیند ہے۔ ایک

زندہ انسان، بیمار انسان ڈھانچوں کے ساتھ تنہا ہو

اور پھر نیند آ جائے۔ لیکن میں زمین پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسری صبح بھی بس نیند پوری ہو جانے پر جاگا تھا

۔ ورنہ اس تہ خانے میں روشنی کسی طرف سے نہیں آتی

تھی۔ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ڈھانچوں کی فوج نظر آرہی تھی۔ سب کے سب اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔

بہت دیر گزر گئی۔ پھر روشنی کی ایک رمت تہ

خانے میں ابھری۔ اور میں چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ

لوگ تہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔

جب وہ نیچے آئے تو میں نے انہیں دیکھا۔ ان میں سے

ایک وہی بے کال تھا جسے میں نے مجسمے کی گود میں بیٹھے

دیکھا تھا۔ وہ آگے تھا اور باقی لوگ جو سادھوؤں کے

لباس میں اس کے پیچھے تھے۔

”کھڑا ہو جا.....“ وہ میرے قریب آ کر بولا

اور میں کھڑا ہو گیا۔ ”تو نے مہمانی کے چرنوں میں

سر نہیں جھکایا تھا۔“ وہ بولا۔

”ہاں.....“

”کیوں.....؟“

”میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔

”یہ جانتا ہے تو کون ہے؟“

”نہیں.....! میں نے جھٹکے دار آواز میں جواب

دیا۔

”ہمارے لئے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن

گیان گردھاری تجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں اس

لئے تیری اتنی خبر گیری کی جارہی ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ

تجھے گوتم بھنساالی ہمارے پاس لایا ہے۔“

”میرا دماغ خراب مت کرو، مجھے کچھ یاد نہیں

ہے کہ گوتم بھنساالی کون ہے؟“ میں نے غصے سے کہا۔

بے کال نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا

، پھر بولا۔ ”ابھی کچا ہے پکا ہونے میں سے لگے گا اس

کے حال پر چھوڑ دو۔“

”اس کا کیا کریں؟“

”یہی جگہ اس کے لئے ٹھیک ہے۔“ بے کال

نے کسی قدر غصے سے کہا۔ پھر وہ سب باہر نکل گئے۔ میں

نے ایک سرد آہ بھری اور ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ

گیا۔ میرے دل میں بہت سے خیالات آرہے تھے۔



وقت گزرتا رہا۔ مجھے بھوک پیاس لگ رہی تھی۔ بدن  
نڈھال ہو رہا تھا۔ یہ دن اور پھر رات بھی گزر گئی۔  
اور میرے اندر وحشت بیدار ہونے لگی۔ کیا میں موت کا  
انتظار کر رہا ہوں۔ مگر کیوں۔ کوئی جدوجہد ضروری ہے۔  
یادداشت الگ ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کون ہوں۔  
کیا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں کیوں ہوں۔ سب سے زیادہ اذیت  
ناک بات یہ تھی کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا۔  
میری نظر ان ڈھانچوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ  
اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا  
ڈھانچہ بھی انہیں کے درمیان کھڑا ہوگا۔ میرے ساتھ  
ایک اور اذیت ناک عمل یہ تھا کہ میں ہوش مند تھا ایک  
ایک چیز کا احساس تھا بس یہ یاد نہیں تھا کہ میں کون  
ہوں۔ میرا ماضی کیا یہ، وہ کم بخت گوتم بھنسال کی کون تھا  
جو مجھے اس اذیت میں پھنسا گیا تھا۔ اور جس عورت کا وہ  
نام لے رہا تھا وہ کون تھی، میں تو کسی کورتی کو نہیں  
جانتا تھا۔ وہ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اب  
میں کیا کروں۔

یہ دن بھی گزر گیا۔ تیسری صبح دو افراد میرے  
لئے کھانا لائے۔ کھانے میں کیا تھا، میں نے غور بھی نہیں  
کیا بس کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر  
کچھ دیر کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ کھانے میں  
کوئی نشہ آور شے بھی شامل تھی۔ پھر نہ جانے کب آنکھ  
کھلی۔ بدن میں توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ ہی  
لحوں میں اندازہ ہو گیا کہ جگہ بھر بدلی گئی ہے۔ میں  
پھر کسی بہتر جگہ ہوں۔ یہ تو خاص جدید کمرہ تھا۔ عمدہ بستر،  
عمدہ فرنیچر دیواروں پر حسین تصاویر آویزاں۔ لیکن یہ  
سب نامانوس تصویریں تھیں۔

پھر دو لڑکیاں میرے لئے کھانے پینے کا سامان  
لائیں۔ ”مہاراج نندیرتانیہ کہا ہے کہ آپ فارغ  
ہو جائیں تب وہ آپ سے ملیں گے۔“

”مہاراج نندیرتانیہ“ میں نے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔“

”یہ کون ہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا تو وہ دونوں

ہنس پڑی۔

”مہاراج ہیں اور کون ہیں۔“ ان میں سے  
ایک نے کہا۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ اور کھانا اپنے سامنے  
کر لیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ  
وہی دونوں لڑکیاں پھر اندر داخل ہوئیں لیکن اس وقت  
وہ اکیلی نہیں تھیں ان کے پیچھے گیر وارنگ کے لباس میں  
وہی منحوس بے کال تھا، میں نے اسے ایک لمحے میں  
پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی نحوست طاری تھی۔  
”جے گیان گردھاری۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔  
میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔  
کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہیں اپنا نام یاد ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”شیام سندر ہے تمہارا نام۔“

”میرا یہ نام نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنا اصل نام  
بھی یاد نہیں ہے۔“

”تمہیں تمہارا اصل نام بھی یاد آ جائے گا۔ اس  
سے ہم تمہیں سندر ہی کہیں گے۔ سندر، گیان گردھاری  
کسی منش کا نام نہیں ہے۔ ایک تحریک ہے۔ ایک منصوبہ  
ہے اور اس سے سنسار کے بے شمار ملکوں میں اس تحریک  
پر کام ہو رہا ہے۔ میں تمہیں مختصر طور پر اس تحریک کے  
بارے میں بتاتا ہوں۔ تم دیکھو سنسار میں جو کام منش  
کو سکون اور اس کے جیون کو خوشیاں دے سکتے ہیں وہ  
کہاں ہو رہے ہیں۔ دو ٹانگوں دو ہاتھوں والا یہ درندہ  
جسے انسان کہتے ہیں کیا کر رہا ہے کون کس کا ہمدرد ہے  
کسی ایک کا نام بتاؤ گے۔ ہر جگہ وہ ہو رہا ہے جس سے  
انسان تیزی سے تباہی کی طرف جا رہا ہے ہم نے ایک  
پریوار بنایا ہے گیان گردھاری پریوار۔ ہم نیکیوں کے  
خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ ہم سنسار سے ان بچے بچے  
نیکی کاروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو بلا وجہ نیکیوں کی لکیر  
پیٹ رہے ہیں۔ تم بس مجھے ایسے نام بتا دو جو پوری سچائی  
سے اپنے کام کر رہے ہوں۔ کسی دیس، کسی ملک اور اس  
میں بسنے والوں کا نام لے لو، کہیں سائنس کے نام پر کام  
کیا جا رہا ہے، بیماروں کے حوالے سے اسپتال کھولے



”تم کوئی دھرم داس نہیں ہو، ایک عام آدمی ہو۔ لیکن جب اتنی تکلیفوں کے بعد، جس سے نجات پانے کے لئے منش سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ تم نے مہمانی کو سجدہ نہیں کیا تھا بار بار کہنے پر بھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمارے لئے حیرانی کی بات تھی۔“

”میں بتاؤں کیوں؟“ میرے منہ سے آواز نکلی۔ ”بڑی سے بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ آواز میری نہیں تھی۔ یہ الفاظ میرے ساختہ نہیں تھے۔ کوئی اور میرے اندر سے بولا تھا۔“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”ہاں بتاؤ۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی باگ ہوتی۔ ہم جاننا چاہتے ہیں وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو ہمارے راستے کی اتنی بڑی رکاوٹ ہے۔“

”ہمارے ہاں۔ مذہب اسلام میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کانوں میں سب سے پہلی آواز جو پہنچائی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور یہ آواز دنیا میں ہماری آمد کی تکمیل کر دیتی ہے۔ ہمیں اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ آواز موت کے وقت تک ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ موت ضرور آتی ہے۔“

اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک وہ پتھرایا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر جنونی لہجے میں بولا۔ ”ہماری جنگ اسی آواز کے خلاف ہے۔ اور ہم..... اور ہم..... اور ہم.....“ وہ ایک بھی جملہ پورا نہیں کر پا رہا تھا۔ سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

میرے اندر کوئی تاثر نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ میرے اندر کی آواز تھی اور بس۔ اس وقت میری ذہنی حالت ہی ٹھیک نہیں تھی۔

پھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر خاص بات ہو گئی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنے مخصوص انداز میں کرتے تھے۔ ہوش کے عالم میں نہیں کرتے تھے اور ایک صبح پھر ماحول بدل گیا۔ صبح کو جاگا تو ماحول بدلا

جار ہے ہیں، ان کی پبلٹی ہو رہی ہے کہ یہ اسپتال ان غریبوں کے لئے جو اپنا علاج نہیں کرا سکتے۔ ذرا ان اسپتالوں میں جا کر تو دیکھو ان بیمار غریبوں کے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ اور علاج کے نام پر ٹر خا دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے کروڑوں کی دولت امداد کے طور پر حاصل کی جاتی ہے۔ گلوکاروں، اداکاروں، کھلاڑیوں نے اور کسی بھی شہرت یافتہ فرد نے یہ منافع بخش کاروبار شروع کر دیا ہے۔ یہ تو چھوٹے پیمانے کی بات ہے بڑے پیمانے پر میں نے ان سائنسی تجربات کی بات کی ہے جو بڑے بڑے ممالک میں ہو رہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار بنائے جارہے ہیں۔ چاند ستارے اور سیارے تسخیر کئے جارہے ہیں کیسیاوی ہتھیار بنا کر ان کے تجربے کئے جارہے ہیں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا کر یہ تجربہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں بیمار کر کے شفا کیسے دی جاسکتی ہے۔ تندرست انسانی زندگی کی تندرستی کو کیسے گھن لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ہو رہا ہے شام سندرتماہارے سنسار میں، لاکھوں تنظیمیں ہیں جو انسانیت کی بھلائی کے نام پر کام کر رہی ہیں۔

ہاہا..... انسانیت کی بھلائی کے لئے۔ ہاہا۔“

وہ قہقہے لگانے لگا پھر بولا۔

”وہ نیکوکاروں کی انجمنیں ہیں وہ نیک لوگ ہیں جن کے پاس دین دھرم کی ٹھیکیداری ہے۔ ذرا ان کے اندر اتر کر دیکھو۔ تمہیں ایک انوکھا سنسار نظر آئے گا۔ اور ہم گیان گردھاری پر یوار، ہم برے لوگ ہیں۔ جو برائی کے نام پر جمع ہوئے ہیں اور ان اچھوں کو برا بنا رہے ہیں جو سارے سنسار کو اچھا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

میں سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ خاموش تھا۔ وہ پھر بولا۔

”تمہیں بھی اس پر یوار کا ایک رکن بنایا گیا ہے۔ تمہیں بہت سے کام دیئے جائیں گے اور تمہیں وہ انجام دینے ہوں گے۔ تم پر ایک تجربہ کیا جا رہا ہے۔ جانتے ہوں کیا تجربہ ہے۔“

”نہیں۔“ میرے منہ سے نکلا۔



ہوا تھا وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں قیدی تھا۔ گویا مجھے قید سے رہا کر دیا گیا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تھوڑے فاصلے پر آبادی نظر آرہی تھی۔

یہ سب میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ذہنی طور پر گم ضرور تھا لیکن کسی بھی طرح کے ماحول سے ناواقف نہیں تھا، دور تک خوبصورت مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے قدم غیر محسوس انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ اب میں آبادی کے کنارے آ گیا تھا۔ اور سب سے پہلے جو مجھے نظر آیا وہ ایک نوجوان لڑکی تھی وہ مجھے دیکھ کر رک گئی تھی۔

میں تو اس کے قریب نہیں گیا۔ لیکن وہ چند قدم چل کر میرے پاس آ گئی۔ میرے قدم رک گئے وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”تم گیان گردھاری ہو۔“

”گیان گردھاری۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

یہ نام مجھے یاد تھا۔ تاہم میں نے کہا۔  
”نہیں۔“

”نہیں ہو۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”نہیں۔“ اس بار میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”مگر تمہارے شریر پرکپڑے تو گیان گردھاریوں جیسے ہیں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے چونک کر اپنے لباس کو دیکھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے بدن پر سادھوؤں جیسا لباس تھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایں.....؟“ نام؟

”ارے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جیسے اپنے بارے میں سب کچھ بھول گئے ہو۔ ویسے ہو بڑے سندر۔“ اس نے میٹھے لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ سندر..... سندر۔“ میں جلدی سے

بولا۔ مجھے اپنا وہ نام یاد آ گیا جو ان لوگوں نے مجھے دیا تھا۔

”کیا سندر۔ سندر۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”شیام سندر۔“ میں نے کہا۔

”یہ تمہارا نام ہے۔“

”ہاں۔“

”چلو چھٹی ہوئی۔ تمہارا نام پتہ چل گیا۔ میرا نام

”سنایہ ہے۔ یاد رہے گا میرا نام۔“

”ہاں۔“

”وہ دو چٹانیں دیکھ رہے ہو۔“ اس نے ایک

طرف اشارہ کر کے کہا اور میں نے اس طرف دیکھا۔ رات کو چوتھی چندرمان نکلے گا۔ میں وہاں آ جاؤں گی مجھے تم سے کام ہے۔ میں چلتی ہوں مگر تم رات کو وہاں ضرور آ جانا بھولنا مت۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت پھر میرے ذہن میں کچھ انگلیاں رینگنے لگی تھیں۔ مجھے کچھ یاد آ رہا تھا۔ کچھ..... نہ جانے کیا۔

مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں۔ وہی چلتے

پھرتے انسان، اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف۔ میرے بدن پر چونکہ سادھو کا لباس تھا اس لئے لوگ میری عزت کر رہے تھے۔ مجھے کھانے پینے کے لئے بھی انہوں نے ہی مجھے دیا تھا۔

دن کی باتیں مجھے یاد نہیں رہی تھیں لیکن نہ جانے کہاں سے گھومتا پھرتا البتہ شام کو مجھے وہ دونوں چٹانیں نظر آ گئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی سنایہ..... میرے قدم اس طرف اٹھ گئے اور کچھ دیر کے بعد میں ان چٹانوں کے پاس پہنچ گیا۔

چٹانوں کے درمیان وقت گزرنے لگا۔ پھر چاند نکل آیا۔ اور میں نے دور سے اسے آتے ہوئے دیکھا اس نے بڑا خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا بالوں میں پھول لگائے ہوئے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر وہ مسکرائی۔

”مجھے پہچان گئے۔“

”ہاں۔“

”کیا نام ہے میرا؟“

”سنایہ۔“ میں نے کہا۔

”ارے واہ۔ اس کا مطلب ہے میں تمہیں اچھی



لگی، جب کوئی کسی کو اچھا لگتا ہے تب ہی وہ یاد رہتا ہے جیسے مجھے تمہارا نام یاد ہے شام سندر۔“  
 ”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے کام ہے۔“  
 ”ہاں۔“

”بتاؤ۔ کیا کام ہے؟“

”اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو۔ ابھی تو چند رمانے مکھ دکھایا ہے چاندنی دھرتی پر اتری ہے پھول مہک رہے ہیں جھرنے سونا اگل رہے ہیں۔ ہواؤں کو کچھ اور ٹھنڈا ہونے دو، یہ ہمیں آواز دیں گی ہم سے کہیں گی۔“ ”آؤ مل جائیں ہم سمن اور سوگند کی طرح۔“  
 ایک ہو جائیں چلو چاند اور گنگ کی طرح۔ اس کی آواز خوابناک ہوگئی اور میں اسے پریشان سے دیکھنے لگا۔  
 ”سنائیہ۔“  
 ”ہوں۔“

”بدھو ہونرے۔ بدھو کے بدھو۔“ سنو بتاتی ہوں۔ میرے پتا کا نام الاگا ہے۔  
 ”ہوں۔“  
 ”بھائی کا نام سلوگا۔“  
 ”اچھا۔ پھر؟“

”اور وہ جس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں اس کا نام پوگا س ہے۔ ٹیڑھے منہ اور چندھی آنکھوں والا پوگا س۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر سب مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ تب میانمی بے کال نے میرے سنے میں آکر مجھے میری مشکل کا پائے بتایا۔“

”میانمی بے کال کو تم کیسے جانتی ہو؟“

”بس وہ میرے سنے میں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں گیان گردھار بن جاؤں تو میری مشکل حل ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے گیان گردھاروں کے بارے میں بتانے لگے اور میں تیار ہو گئی۔ تم سامنے آئے تو مجھے پتہ چل گیا کہ تم گیان گردھاری ہو۔“  
 ”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے کپڑوں سے حلے سے، مجھے یہی بتایا گیا تھا۔“  
 ”وہ پائے کیا ہے۔“ میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

”تم مجھے اپنے شریر میں سویکار کر لو۔ ہمارے ہاں نرن گیت مندر ہے جہاں نرن گیت کا بت رکھا ہوا ہے۔ جب کسی کی شادی طے ہوتی ہے تو لڑکی کو نرن گیت کے چرنوں میں جا کر سوگند کھانی پڑتی ہے کہ وہ کنواری ہے۔ اگر وہ کنواری ہوتی ہے تو نرن گیت مہاراج شانت رستے ہیں اور اگر وہ کنواری نہیں ہوتی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے سرخ ہو جانے سے سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے سو، میں پوگا س سے شادی سے بچنا چاہتی ہوں۔“

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب اس کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں خود نرن گیت بن گیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھیں جھلکی ہوئی تھیں۔ میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ عجیب پیشکش تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں لیکن میرے دل میں ایک کراہیت سی ابھری تھی۔ اس سے یہ پوچھنے کو دل بھی نہیں چاہا کہ جب نرن گیت یہ بتا دیتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے تو پھر کنیا پر کیا بنتی ہے۔ اس کے اہل خاندان، اس کے قبیلے والے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے سانس بوجھل ہوئے جارہے تھے۔ جب یہ خاموشی طویل ہوگئی تو اس کی لرزتی آواز ابھری۔

”سندر جی۔“

ابھی میں اسے کوئی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ آبادی کی طرف سے کچھ شورا بھرا۔ پھر بہت سی مشعلیں نظر آئیں جو اسی طرف دوڑ رہی تھیں۔



”یہ کون ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
 ”ہائے دیا۔ کسی کو پتہ چل گیا۔ میں نے تمیادی  
 سوریا کو بتا دیا تھا اس نے کسی کے کانوں میں نہ خبر  
 پھونک دی۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

وہ جاتی جہنم میں اور سودیا جاتی چولہے  
 میں، میرے ساتھ جو ہونے والا تھا اس کا مجھے اندازہ  
 ہو گیا تھا مشعلوں کی روشنی کے سائے میں، میں نے بہت  
 سے لٹھ بردار پھرے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف دوڑتے  
 ہوئے دیکھا تھا جو ظاہر ہے میرے لئے منھائی لے  
 کر نہیں آرہے ہوں گے۔ اب اتنا بے وقوف بھی نہیں  
 تھا کہ وہیں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا۔ میں نے پیچھے  
 کی طرف چھلانگ لگائی اور بھاگتا چلا گیا اس بے چاری  
 مصیبت کی ماری نے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا مجھے کچھ  
 معلوم نہیں تھا لیکن میں اب رکے بغیر دوڑ رہا تھا اور مجھے  
 نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہے۔

میری رفتار بہت تیز تھی اور میں کسی گھوڑے کی  
 طرح دوڑ رہا تھا۔ پھر میرے کانوں نے ایک مسلسل  
 دھاڑتی۔ یہ پانی کی آواز تھی۔ سمندر..... میرے ذہن  
 میں ایک نام گونجا۔ ہاں سمندر۔ میں نے پلٹ کر نہیں  
 دیکھا اور پھر مجھے اپنے سامنے سفید جھاگ اڑاتی ہوئی  
 لہریں نظر آئیں کچھ ہی لمحوں کے بعد میں ان کے قریب  
 تھا میرا دل کہہ رہا تھا نکل جاؤ۔ جیسے بھی بن پڑے وہاں  
 سے نکل جاؤ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مجھے اس پر اسرار  
 طلسم تو نجات مل جائے گی۔

میں سمندر میں کود گیا۔ شاید میں نے تیرنا جانتا  
 تھا۔ طوفانی لہروں کو چیرتا ہوا میں آگے اور نکلتا چلا گیا۔  
 ایک انوکھا سفر، جس نے سوچنے سمجھنے کی قوتیں  
 سلب کر لی تھیں نہ جانے میں کیوں تیر رہا تھا۔ نہ جانے  
 میں کیوں آگے بڑھ رہا تھا۔ سمندر کوئی مدافعت نہیں  
 کر رہا تھا۔ اس کے گبولے بے حد بردباد تھے جیسے اس  
 نے مجھے میزبان کی حیثیت سے قبول کر لیا ہو۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں سمندر میں آگے  
 بڑھنے کے لئے کوئی جدوجہد کر رہا ہوں کہ نہیں لیکن یہ

اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا بدن متحرک ہے ہوائیں مجھے آگے  
 دھکیل رہی تھیں حیرت کی بات تھی کہ میں ڈوبا نہیں تھا۔  
 پھر میں سو گیا۔ پانی کا بستر، سورج کی روشنی،  
 اور پھر جاگنے کا احساس، زندگی نے میری حفاظت کی تھی  
 ۔ میں اس وقت پانی میں نہیں تھا بلکہ بھورے رنگ کی  
 ریت میرے لئے نرم بستر بنی ہوئی تھی، آسمان  
 پر پرندے اڑ رہے تھے اور ماحول بڑا سہانا لگ رہا تھا  
 میں دیر تک اسی طرح لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوئی جزیرہ تھا۔ ساحل سے دور درختوں کے  
 جھنڈ نظر آرہے تھے پتہ نہیں یہاں آبادی تھی یا نہیں۔  
 کابلوں کی طرح لیٹا رہا۔ مجھے بس وہ لمحات یاد تھے جب  
 میں نے خود کو ان شیطان زادوں کے چنگل میں پایا تھا  
 اور وہ مجھے اپنے پیروکاروں میں شامل کرنا چاہتے تھے۔  
 لیکن مجھے یہ شیطانی عمل قبول نہیں تھا اس کے بعد سے  
 اب تک کی صورت حال مجھے یاد تھی۔ آخری عمل اس  
 لڑکی کا تھا۔ پتہ نہیں اس کے قبیلے والوں نے اس کے  
 ساتھ کیا کیا ہو۔

اب یہاں پڑے رہنا بے کار تھا۔ لباس بھی  
 بری طرح گندا ہو رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں  
 کیا جاسکتا تھا۔ کچھ لمحے خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں  
 اٹھ کر ان درختوں کی طرف چل پڑا۔ جو دور نظر آرہے  
 تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہاں کچھ ایسے  
 پھل مل جائیں جو کھانے پینے میں کارآمد ہوں۔ میں  
 انہیں کی تلاش میں تھا، آخر کار ان درختوں کے پاس پہنچ  
 گیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس  
 ہوا۔ یہ غلط فہمی نہیں تھی خوشبو آ رہی تھی اور یہ گوشت بھننے  
 کی خوشبو تھی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف  
 دیکھنے لگا۔ درختوں ہی کے درمیان، یہاں سے خاصے  
 فاصلے پر، دھوئیں کا غبار اٹھ رہا تھا۔ ہاں گوشت بھننے کی  
 خوشبو بھی ادھر سے ہی آرہی تھی۔ میرا دل خوشی سے  
 اچھل پڑا۔ اس کا مطلب ہے وہاں کوئی ہے۔  
 ضرور وہاں کوئی ہے۔ میرے قدم تیزی سے اس طرف  
 چل پڑے۔ (جاری ہے)





## موت کا تعاقب

مدرثر بخاری - شہر سلطان

حالات سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر بچہ چھت پر گیا اور چشم زدن میں چھت سے نیچے چھلانگ لگادی، سڑک پر اس کا خون پانی کی طرح بہنے لگا اور پھر چند گھنٹے بعد اس کی روح

نے.....

لحہ، پل پل خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اور لرزہ بر اندام کرتی حقیقی کہانی

آفس قریب 1500 کلومیٹر دور ہے۔ وہ مہینے میں ایک مرتبہ گھر کا چکر لگاتے ہیں۔ میری زندگی کے وہ پل بہت خوبصورت اور کبھی نہ بھلانے والے ہوتے ہیں ہم ایک ساتھ وقت گزارتے ہیں گارڈن جاتے ہیں، وہ مجھے بانہوں میں اٹھاتے ہیں اور مجھے روماس کی ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں مجھے دنیا کا ہوش نہیں رہتا۔

لیکن جب وہ چلے جاتے ہیں تو میں اس

**میرا** نام روزی ہے، جب میں یہ ڈائری لکھ رہی ہوں میری عمر 25 سال ہے۔ میرے لمبے ڈارک براؤن بال ہیں اور میرے شوہر جان کے مطابق ”روزی دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔“ یہ میرے شوہر کا حسن ظن ہے کہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں مجھے ان سے ہمیشہ ایک شکوہ رہا ہے کہ وہ مجھے وقت نہیں دیتے کیونکہ وہ کیلی فورنیا میں جا ب کرتے ہیں جبکہ ہمارے گھر سے انکا



ہو جاتی ہوں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ میں نے ایک پرائیویٹ اسکول جوائن کر لیا ہے جہاں ننھے منے بچے پڑھنے آتے ہیں مجھے فطرتی طور پر بچے پسند ہیں مگر میری اپنی گود ہری نہیں ہوئی۔ مجھے اولاد کی خواہش ہے مگر بہت سی دعاؤں اور علاج کے بعد بھی میری گود خالی ہی ہے۔

جان اپنے آفس کے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں جبکہ میں دن بھر اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ شام 5 بجے میری واپسی ہوتی ہے۔ میں کھانا پکاتی ہوں اور اپنے شوہر کو فون کرتی ہوں پھر لی وی دیکھتی ہوں اور چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد سو جاتی ہوں۔

آج کا دن بھی تھکا دینے والا تھا، اسکول میں نئے ایڈمشن ہو رہے ہیں۔ اور پرنسپل نے نئے بچوں کو اسکول میں انٹری کے لئے ساری ذمہ داری میرے اوپر ڈال رکھی ہے۔ ڈائری لکھنا روک رہی ہوں کیونکہ میرا سر بھاری ہو رہا ہے اور نیند کا غلبہ مجھ پر چھا رہا ہے۔

نیچے تاریخ اور وقت درج تھا..... اور ڈائری کا صفحہ اختتام کو جا پہنچتا ہے۔

خونی کہانی کا اگلا حصہ ڈائری کے Next صفحے سے شروع ہوتا ہے جو کچھ یوں تھا۔

”شام ہو چکی تھی۔ خزاں کا موسم تھا میں نے اپنی گاڑی کو گیراج میں پارک کیا اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھی۔ میرے اپارٹمنٹ کے ساتھ روڈ ہے جس کے کنارے خزاں رسیدہ درخت ہیں خزاں کے موسم نے ان درختوں کو پتوں سے بے نیاز کر دیا ہے شام کے وقت یہ درخت ٹنڈ ٹنڈ منڈ اور عجیب سی صورت میں نظر آتے ہیں۔ میرے اپارٹمنٹ کے قریب ہی ایک درخت ہے جو موسم کی بھینٹ چڑھ رہا ہے اس کے خشک پتے گیلی سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔

ایک بات اور بھی لکھتی چلوں کہ تھوڑی دیر پہلے وہاں ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی سڑک گیلی تھی اور درختوں کے خشک پتے نم ہوتے سڑک پر پڑے تھے۔ شام اتر آئی تھی اور میرا جسم تھکن کی وجہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے ان تمام

چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھا مجھے کچھ خوف محسوس ہوا جیسے ویرانہ سا ہو اور درمیان میں میرا اکلوتا گھر..... حالانکہ میرے گھر کے ساتھ بہت سے گھر تھے۔ لیکن میل جول نہ ہونے کے برابر..... بہر حال پھر مجھے لگا جیسے میرے سامنے سے کوئی گزرا ہو۔

ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں..... میری آنکھ جھپکی تھی اور میری نظروں کے سامنے سے کوئی تیز رفتار چیز گزری تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا چیز تھی۔ میں نے وہم سمجھا اور بیگ سے اپارٹمنٹ کی چابی نکالی۔

لیکن مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میری چابی پہلے سے ہی دروازے میں لگی ہوئی تھی یہ ممکن نہیں تھا جبکہ میرے ہاتھ میں بھی میری چابی موجود تھی..... میں نے چابی گھمانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو مجھے لگا جیسے چابی اپنی جگہ موجود نہیں تھی..... وہاں خالی دروازہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

آج شاید تھکن کچھ زیادہ ہی تھی کہ کچھ عجیب و غریب سا محسوس ہو رہا تھا میں نے اپنی چابی کو کی ہول میں ڈالا اور بینڈل گھما کر اندر داخل ہو گئی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مکمل خاموشی اور سناٹا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ صبح میں نے ہال روم کی لائٹ آن رکھی تھی لیکن یہ آف کیسے ہو گئی؟ اس ایریا میں لائٹ کا نظام 24 گھنٹے ایکٹو رہتا تھا۔ لائٹ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے کمرے کی بتی فیوز ہو گئی ہو اور کام کرنا چھوڑ گئی ہو۔

میں نے اپنے ہی گھر میں خوف محسوس کیا۔ تنہائی خوف اور ریڑھ میں سرد لہروں نے تنہائی کا احساس دلایا میں نے موبائل کی ٹارچ آن کی اور سوچ کی طرف گئی۔ وہاں سوچ آف تھا..... میں نے لائٹ آن کر دی۔ ہال روم روشنی میں نہا گیا۔ اور میری جان میں جان آئی۔

لیکن میں نے صوفے کے نزدیک فرش پر خون کے نشان دیکھے..... خون کے نشانات زمین پر ریگلتے



ہوئے سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر جا کر رک گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ذی روح کو مار کر کھینچا گیا تھا۔ گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جایا گیا۔ لیکن آخر کس کو.....؟ اور کس نے کیا یہ سب.....؟

اچانک مجھے اپنے ٹونی کا خیال آیا..... ٹونی میرا پالتو کتا تھا جو اپارٹمنٹ کے پیچھے حصے میں رہتا تھا۔ اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہ تھی وہ صرف اسکول نہیں جاتا ورنہ گھر میں وہ ہر جگہ میرے ساتھ رہتا تھا۔

پھر میں، میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈ ڈالا مگر وہ کہیں نہ ملا۔ البتہ اپارٹمنٹ سے باہر درخت کے نیچے، پچھلی طرف اس کی لاش نظر آئی۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی، مجھے دلی افسوس ہوا۔ مجھے اس سے دلی لگاؤ تھا..... میں نے حالات پر غور کیا۔ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا، کوئی چیز میرے گھر میں داخل ہوئی تھی اور میرے ٹونی کو مار ڈالا تھا۔

میں نے جان کو فون کیا مگر اس کا نمبر پاورڈ آف ملا..... مجھے ٹھنڈے سپینے آرہے تھے اور نیند آرہی تھی لہذا میں نے افسوس کے ساتھ ڈائری کا یہ صفحہ قلمبند کیا ہے..... کل زندگی نے وی اجازت تو کل کچھ لکھوں گی۔ کیونکہ جو میرے کتے کو مار سکتا ہے وہ اتنی رازداری سے مجھے بھی آسانی سے مار سکتا تھا۔“

ڈائری کا یہ صفحہ بھی ختم ہو گیا..... تاریخ کے ساتھ سائن درج تھا۔

ڈائری کا اگلا صفحہ چونکا دینے والا تھا..... کچھ ناقابل یقین حقائق تھے جو درج کئے گئے تھے ایک عام انسان اس قسم کے بیانات پر یقین نہیں کر سکتا۔ تیسرا صفحہ کچھ یوں تھا۔

”آپ یقین کریں یا نہ کریں کل رات میرے ساتھ بہت عجیب ہوا۔ ڈرا دینے والا، خوف ناک..... کل رات میں تھکن کسی وجہ سے سو گئی تھی۔ رات کے کسی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی داخل ہوا ہو۔ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل

ہوا تھا۔ میں نے دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز کو واضح سنا تھا اور فرش پر ہلکی چاپ کے قدموں نے مجھے نیند سے جگا دیا تھا میں نے غنودگی کے عالم میں آنکھ کھولی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہاں ایک دس سال کا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا اور وہ غصے میں تھا..... مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ننھا بچہ کسی سفاک قاتل کی طرح مجھے مارنا چاہتا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا اگر میں جلد ہی کوئی فیصلہ نہ کرتی تو وہ مجھے مارنے ہی والا تھا..... میں نے آنکھ کے کھلے ہوئے کونے سے دیکھا وہ میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اور چاقو کو عین میرے دل کے مقام پر نشانہ بنانے والا تھا کہ میں نے چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس بچے کو پکڑنے لگی میں نے سوچا میں اس بچے کا ہاتھ پکڑ لوں گی اور اس پر قابو پالوں گی۔

لیکن جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہاں کسی بچے کا وجود نہ تھا۔ دروازہ بند تھا اور کمرے میں، میں تنہا تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے حواس قابو میں کئے اور خواب اور حقیقت کے باہمی لنک کو ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ خواب نہیں تھا بلکہ اصل حقیقت تھی..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس خونی بچے کو دیکھا جو میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا اور اس کا مقصد صرف مجھے قتل کرنا تھا..... لیکن پھر وہ اچانک کدھر گم ہو گیا۔ جب خوف نے میرا پیچھا چھوڑا تو میں نے اسے بیڈ اور صوفوں کے نیچے، واش روم، اور راہداری میں چیک کیا مگر نجانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ بچہ چھو منتر ہو گیا تھا پھر میں نے غور کیا..... اور اپنے سی سی ٹی وی کیمرے کی ویڈیو ٹیپ نکالی..... اور فلم چلا دی..... میں نے فلم کو فارورڈ کیا اور رات تین بجے کا ویڈیو کلپ پلے کر دیا۔

وہ دل دہلا دینے والا منظر تھا وہاں دروازہ خود



بخود کھلا تھا اور پھر بند ہو گیا تھا ایک سایہ نظر آ رہا تھا جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا تھا..... اس سے آگے میری اپنی ویڈیو ریکارڈنگ تھی جس میں میرا خوف واضح دیکھا جاسکتا تھا..... کیمرے نے صرف ایک سائے کو ریکارڈ کیا تھا..... جبکہ میری آنکھوں نے ایک بچے کو دیکھا تھا۔

ایک بات تو حقیقت تھی کہ کوئی مجھے مارنے والا تھا کوئی آسیب، ویپائر، ڈریکولا، جن، آتما..... کچھ بھی ہو سکتا تھا..... اس سائے نے مجھے اندر تک خوف زدہ کر دیا تھا..... آج کی صبح نارمل نہیں تھی..... رات والے واقعہ نے مجھے ذہنی طور پر خوف کا شکار کر دیا تھا۔ صبح میرے سر میں درد تھا اور جسم میں اکڑاؤ تھا..... میں نے سر درد کی ٹیبلٹ لی اسکول سے چھٹی لے کر آرام کرنے کا فیصلہ کیا..... میرا سر بھاری ہو گیا تھا..... اور میرا دایاں بازو بھی بھاری ہونے لگا تھا..... بازو اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ میں اسے حرکت نہ دے سکتی تھی بازو کا اتنا وزنی ہوتا بہت نقصان دہ اور غیر معمولی تھا۔

لیکن پھر اچانک ہی میرا بازو نارمل ہو گیا۔ بازو کا بھاری پن صرف چند لمحوں کے لئے ہوا تھا۔ گوکہ وہ لمحے خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ مجھے لگا تھا میری روح نکلی جا رہی تھی اور میرا بازو ہمیشہ کے لئے خراب ہو جائے گا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا ظاہر ہے انسان اس قسم کی سچویشن میں گھبرا ہی جاتا ہے میں بھی گھبرا گئی تھی۔

بس پھر اچانک سے میرا بازو نارمل ہوا اور میں نے آہستہ آہستہ بازو کو حرکت دینا شروع کر دیا..... میرا بازو حرکت کر رہا تھا اور مجھے خوشی تھی..... اندرونی خوشی!

سورج نے میرے اپارٹمنٹ کو بھی مکمل دن ہونے کا پتہ دیا۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا لیکن موسم ٹھنڈا تھا۔ مجھے وٹا منڈی کی ضرورت تھی۔ میں نے جیسے تیسے گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹائے اور چھت پر چلی گئی ہوا چل رہی تھی اور سورج کی دھوپ خاص نہ تھی..... ہمار

سے ہاں ہر موسم نارمل ہوتا ہے اور خاص طور پر دھوپ ٹھنڈی پڑتی ہے میں نے ایک ناول اٹھایا اور چھت پر پڑی کرسی پر آ بیٹھی اور ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ..... رومانٹک ناول تھا۔ جس میں دلچسپی کے لئے بس کچھ تھا..... میں نے ناول پڑھنا شروع کیا اور پوری طرح ناول میں ڈوب گئی.....

ناول کے لفظ میرے سامنے کسی فلم کی مانند چل رہے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے بالوں کو کسی نے چھوا ہو۔ وہ طلسماتی لمس تھا۔ اس نے میرے بالوں کو میٹھے انداز میں سہلایا تھا اور اس کی سانسیں مجھے اپنی گردن کے گرد محسوس ہوئیں..... وہ ایک ہاتھ تھا جو ساخت کے اعتبار سے ننھا تھا لیکن انداز کے اعتبار سے نوجوان لڑکے کا ہاتھ..... مجھے اس کا لمس گردن اور پھر اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا تو میں بھڑک اٹھی۔

میں نے ناول سے نظر ہٹائی اور اپنے پیچھے دیکھا..... لیکن وہاں صرف صحن کی چڑائی اینٹیں تھیں..... میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

میں نے ناول کو سامنے ٹیبل پر رکھا اور پورے صحن کا چکر لگایا چھت سے نیچے تک بغور دیکھا سڑک ویران تھی میرے گھر کے ساتھ جو گھر تھے ان میں گہری خاموش تھی۔

میں لوٹ کر کرسی کی طرف بڑھی جہاں میں نے ٹیبل پر ناول رکھا تھا۔ میں حیران زدہ آنکھوں سے ٹیبل کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ناول موجود نہیں تھا..... یہ کیا ہو رہا تھا؟ کتاب غائب تھی..... میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا لیکن خود کو اتنا بھاری پایا کہ اٹھ ہی نہ پائی..... میری آنکھیں کھلی تھیں اور دماغ کام کر رہا تھا مگر حرکت کرنے سے قاصر تھی.....

مجھے لگا جیسے وہ مجھے مار دے گا..... واقعی مار دے گا۔ کون مار دے گا اور کیوں کوئی اس طرح چاہے گا..... میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا مگر میرا جسم مکمل طور پر بھاری ہو چکا تھا اور دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی نا دیدہ، خون



## محبت اور احسان

محمود غزنوی نے اپنی نوجوانی میں ایک سرسبز و شاداب باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک شاندار اور خوبصورت عمارت تعمیر کروائی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہو گئی تو اس نے ایک عام جشن منعقد کیا اور اپنے باپ ناصر الدین سبکتگین اور سلطنت کے دوسرے ارکان کو باغ میں مدعو کیا..... سبکتگین نے عمارت دیکھ کر کہا۔ ”محمود“ اگرچہ باغ اور عمارت بہت شاندار اور خوب صورت ہیں لیکن ایسی چیزیں تو تمہارے ملازم بھی بنا سکتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان اور شوکت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ایسی عمارت کی بنیاد ڈالیں جس کی مثال پیدا نہ کی جاسکے۔

محمود نے ادب سے پوچھا۔ آپ کون سی عمارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ سبکتگین نے جواب دیا۔ وہ عمارت اہل علم کے دل میں ہیں۔ اگر تم ان کے دلوں کی سرزمین میں اپنی محبت اور احسان کے بیج بودو گے تو وہ بار آور ہوں گے۔ ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کو چکھنے سے تمہیں سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نام حشر تک زندہ رہے گا۔

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈوالہ یار)

آشام، یا کچھ بھی تھا جو مجھے حد سے زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا وہاں سانس لینے والی زندہ مگر نظر نہ آنے والی مخلوق تھی۔ میں کرسی پر دراز تھی اور کوئی میرے جسم پر سوار ہونے لگا تھا وہ ہلکا ہلکا لمس تھا جو گدگدانے کے لئے کافی تھا۔ وہ دو ہاتھ تھے جو میری ٹانگوں سے ہوتے ہوئے میرے جسم کے اوپر والے حصے کو پیار بھرے انداز سے چھوتے ہوئے میری گردن تک آ پہنچے تھے۔ اب کی بار مجھے سانس لینے کی آواز آئی۔ گرم گرم سانس کی خارج ہوا مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔

میں غصے کے عالم میں اپنا بایاں بازو حرکت میں لائی اس دفعہ میرے ہاتھ نے بھرپور حرکت کی اور پھر میرا ہاتھ کسی پتھر نما چیز سے ٹکرا گیا۔ میرا جسم بھی نارمل ہو گیا تھا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی جبکہ میرے بازو میں شدید درد ہونے لگا..... میری سانسیں بہت تیز ہو چکی تھیں اور آنکھوں کے سامنے ستارے تاپنے لگے تھے..... میں نے ٹیبل پر دیکھا وہاں ناول رکھا ہوا تھا۔ میں نے ناول اٹھایا اور بائیتی کا پتی میٹرھیاں اترتی نیچے آ گئی۔

میں نے عجلت میں جان کا نمبر ڈائل کیا..... دوسری گھنٹی پر جان نے کال اٹینڈ کر لی۔

”ہیلو..... روزی کیسی ہو؟“

”ٹھیک نہیں ہوں..... جان تم جلدی سے گھر آ جاؤ۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی مجھے بہت تنگ کر رہا ہے۔“

”تم اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ ہوا کیا ہے؟ اصل معاملے بتاؤ۔“ جان بولا۔

میں نے تفصیل بتانی شروع کی جسے جان نے مذاق سمجھ کر کہا۔

”تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ تم آرام کرو اور میرا انتظار کرو..... پلیز! سویٹ ہارٹ..... میں اگلے تین دن تک نہیں آ سکتا..... کام کا بڑا دن ہے تم اپنی بہن کے گھر چلی جاؤ۔ یا اسے اپنے پاس بلا لو۔“



”تم جان ہی ہو ناں.....“ مجھے اس سے اس قسم کے برتاؤ کی ہرگز امید نہ تھی..... وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

”ہاں روزی..... تم پلیز ریلکس رہو..... میں کوشش کرتا ہوں جلدی گھر آ جاؤں۔“

میں نے غصے سے فون بند کر دیا وہ مجھ سے پیار کرتا تھا اور مجھے بھی اس سے بہت پیار تھا مگر اس دفعہ اسے گھر سے گئے ہوئے دو ماہ سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میں اسے گھر بلانے کے لئے یہاں کر رہی ہوں..... تاکہ وہ جلدی لوٹ آئے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ معاملہ بہت سنگین تھا۔

میں مر گئی تو وہ پچھتائے گا..... میرے آس پاس کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں ہے جو میرے دل کو سمجھے..... جس سے اپنے دل کی بات کروں..... تبھی تو میں اپنی ساری باتیں اپنی ڈائری میں لکھتی ہوں البتہ ایک ذی روح ایسی بھی ہے جو مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ جو نہ ہی نظر آتی ہے اور نہ ہی بولتی ہے۔“

صفحہ ختم ہو چکا تھا نیچے تاریخ اور اپنا کے سائکس تھے۔ ڈائری کے کچھ مزید صفحات ابھی باقی تھے..... مزید صفحات پڑھنے سے پہلے میں کچھ اپنے بارے میں بتا دوں تو آسانی رہے گی۔

میں ایک پرائیویٹ جاسوس ہوں، نام مائیکل ہے اور کام آپ کے سامنے..... کچھ دن پہلے ہی مجھے ایک فون کال آئی۔

”ہیلو.....“

”مائیکل اسپیکنگ۔“

”میں جان بات کر رہا ہوں دیکھئے میری بیوی کی ڈیٹھ ہو گئی ہے مجھے لگتا ہے اس کی موت طبعی نہیں بلکہ جان بوجھ کے قتل کیا گیا ہے آپ پلیز! میرے ساتھ تعاون کریں۔“

”اوکے۔“

”سرکاری پولیس اپنے طور پر کام کرے گی۔ آپ میرا ساتھ دیں تو تفتیش کی جاسکتی ہے۔“

”میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار رہوں۔ آپ تفتیش شروع کریں.....!“ میں نے اپنے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور جان کے گھر جا پہنچا۔

وہ خوبصورت گھر تھا۔ آئیڈیل لوکیشن روڈ، گارڈنز، ہر قسم کے موسم کو انجوائے کیا جاسکتا تھا..... میں نے روزی کا مرا ہوا چہرہ دیکھا تھا اس کے آخری رسومات میں حصہ لیا تھا..... جان افسردہ تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی تھی۔ جو چلا گیا تھا اس کا واپس آنا ناممکن تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ہم سب کو حیران کر دیا تھا..... روزی کی موت خون کی کمی کی وجہ سے ہوئی تھی..... اس کے جسم سے خون کی آخری بوند تک بھی نیچوڑ لی گئی تھی جبکہ رپورٹ کے مطابق اس کی موت کا وقت رات دو سے تین بجے تک تھا اور اس کے جسم پر کوئی نشان نہ تھا نہ ہی کسی انجکشن کا اور نہ ہی کسی کے دانتوں کا..... دانت سے مراد کسی جانور کے خون خوار دانت..... مگر سوئی تک کا نشان نہ ملا۔

میں نے روزی کا سارا گھر دیکھا..... پائیں باغ بھی جہاں مختلف پودے خشک اور جلے ہوئے تھے ایک طرف چڑیا گھر نما ماحول تھا۔ جہاں پنجرہوں میں مختلف پرندے تھے مگر سب ہی اداس اور سر جھکائے بیٹھے تھے..... میں نے وہاں ان کی آنکھوں میں خوف دیکھا..... پھر میں روزی کے کمرے میں گیا جہاں جان کی تصاویر چسپاں تھیں درمیان میں بیڈ تھا۔ سائڈ میں لمبی الماری تھی کونے میں ٹی وی رکھا تھا جس کی اسکرین ٹوٹی ہوئی تھی..... جیسے کسی نے لوہے جیسی سخت چیز سے اسکرین کو توڑ دیا ہو.....

میں نے ہر چیز کو دیکھا..... کافی تلاش کے بعد میں نے ایک سرخ ڈائری دیکھی..... وہ روزی کی ذاتی ڈائری تھی..... اس میں بہت سے صفحے اس کے اپنے ہاتھوں سے لکھے گئے تھے.....

میں نے جان سے اجازت لے کر اس کو پڑھنا



شرع کیا..... اور اس کو آپ کے سامنے پیش کرتا چلا گیا۔

ابھی کہانی باقی ہے میرے دوست.....  
تو جناب..... میں نے ڈائری کا اگلا صفحہ کھولا ہے کچھ یوں تھا۔

”آج میری موت پکی تھی اگر عین ٹائم پر میں اپنی گاڑی کو درخت سے ٹکرا نہ دیتی..... جی ہاں..... آج کسی نے میری گاڑی کے بریک فیل کر دیئے تھے۔ میں اسکول ٹائم میں تیار ہو کر ڈرائیو کرتی ہوئی جا رہی تھی..... اسپید بہت کم تھی کہ مجھے بریک لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن بریک نہ لگی..... بریک فیل ہو چکی تھی اور یہ خطرناک صورت حال تھی..... میں نے جلد ہی فیصلہ کیا کہ کسی درخت سے گاڑی ٹکرا دی اور یوں میری جان بچ گئی۔

میں نے ٹیکسی لی اور اسکول پہنچ گئی..... مصروف دن رہا مگر میری سوچ صرف آج صبح کے واقعہ پر مرکوز رہی۔ دماغ کسی دوسری طرف مائل ہی نہ ہو رہا تھا..... میں نے جان کو واقعہ سنایا اور دو دن کے بعد آنے کا کہا..... نجانے وہ دفتر کی کون سی مصروفیات میں مگن تھا کہ اسے اپنی بیوی کا ذرا برابر خیال نہ تھا۔

اسکول سے واپسی پر میں نے اپنی گاڑی کو دیکھا جو درخت سے ٹکرا گئی تھی اسے آگ لگ گئی تھی اور کار جل کر خاکستر ہو گئی تھی۔ مجھے گاڑی کا بھی افسوس تھا وہ میرے شوہر نے مجھے شادی پر گفٹ کی تھی۔ میں گھر آئی تو ایک اور آفت میرا انتظار کر رہی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوئی دروازہ کھولا اور خوف سے میری ہلکی سی چیخ نکل گئی وہاں میرے سامنے ایک لاش تھی۔ خون میں لٹی ہوئی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی میرا خوبصورت مور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مور کے نیلے اور سبز پروں پر خون لگا تھا۔ اس کی گردن پر تیز دھار چاقو چلا یا گیا تھا اور چاقو پر لگا خون اس کے پروں سے صاف کیا گیا تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ میری عقل تو کام نہیں کر رہی تھی۔

وہ کون تھا اور کیا چاہتا تھا سامنے بھی نہیں آتا تھا۔

میں نے مور کی لاش کو دفن کر دیا..... وہ بہت پیارا مور تھا لیکن افسوس میں اسے نہ بچا سکی تھی۔

میں مور کو دفنانے کے بعد اپنے کمرے میں گئی..... وہاں ہر چیز بکھری ہوئی لگتی تھی..... جیسے کوئی گھر میں آیا تھا اور میرے سامان کو چھیڑتا رہا تھا میری بہت سی چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھی..... اور میرا پی وی ٹوٹا ہوا تھا۔ اسکرین پر خاصی زوردار انداز میں ضرب لگائی گئی تھی جس سے پی وی ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے سر پکڑ لیا..... ایک عام انسان کے ساتھ غیر معمولی واقعات کا وقوع پذیر ہونا اور بار بار ہونا نفسیاتی مسائل کو جنم دیتا ہے میرا دل ڈرا ہوا ہے اور زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

آج دوپہر بھی کچھ عجیب ہوا..... دن 3 بجے میری واپسی ہوئی اور میں سونے کے لئے بیڈ پر گئی تھی آدھے گھنٹے بعد تک مجھے وہی بچہ نظر آیا جس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا وہ مجھے مارنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی..... وہاں کوئی موجود نہ تھا البتہ بیڈ پر نشان ضرور نظر آیا جہاں سے چادر پھٹ گئی تھی اور چاقو شاید اندر گھس گیا تھا..... اگر میں کروٹ نہ بدلتی تو وہ چاقو میرے جسم میں گھس چکا ہوتا.....

میں نے اس بچے کو غور سے دیکھا تھا اور اسے پہچان گئی۔

وہ بچہ صرف ایک دن اسکول آیا تھا وہ خوبصورت بچہ داخلے کی غرض سے اسکول آیا تھا لیکن میں نے اس کا ایڈمشن نہیں ہونے دیا تھا کیونکہ وہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اسے اسکول میں داخلہ دیا جاتا اس سے کہا تھا کہ ”وہ چار سال کسی دوسرے اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔“

میں نے اس کا ایڈمشن ٹیسٹ لیا۔ لیکن اس نے ایک بھی سوال ٹھیک نہیں لکھا تھا۔ چونکہ میں ایڈمشن ہیڈ



تھی میں نے اسے رجیکٹ کر دیا۔ میرا کام ان بچوں کو داخلہ دینا تھا جو اہل تھے اور ذہین۔۔۔۔۔ میرے حساب سے وہ اس قابل نہ تھا۔

رجیکٹ ہونے والا وہ بچہ اسکول سے جاتے ہوئے کئی دفعہ میری جانب دیکھتا رہا تھا اس کی آنکھوں میں التجا تھی لیکن اسکول انتظامیہ کی طرف سے میں مجبور تھی اسکول کا ٹیسٹ ہر بچے کو 50 فیصد سے پاس کرنے لازمی ہوتا ہے جبکہ اس کے 20 فیصد مارکس تھے یہ اسکول کا نظام اور طریقہ کار تھا۔ اس صورت میں میری ایک بھی نہ چلنی تھی۔ گو کہ مجھے بھی اس بچے کا افسوس تھا۔ وہ پیارا اور سنہرے بالوں والا، نیلی آنکھوں والا بچہ تھا اس کا نام جیک تھا۔۔۔۔۔ کاش وہ ٹیسٹ پاس کر لیتا تو اسے داخلہ مل جاتا۔۔۔۔۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔

ڈائری کا یہ آخری صفحہ تھا۔ نیچے سائن اور تاریخ درج تھی۔ اس سے آگے ڈائری کے صفحے خاموش تھے۔ لکھنے والے کو موت نے آگھیرا تھا اور اسے مزید کچھ لکھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

معاملہ سلجھا ضرور تھا مگر کچھ سوال ابھی باقی تھے۔ میں مائیکل۔۔۔۔۔ پرائیویٹ جاسوس۔۔۔۔۔ میرا بیٹا جیک کچھ عرصہ قبل جیک نے دس منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ جیک میرا بیٹا، اپنی ماں کے ساتھ اسکول گیا تھا اور اس دن اسکول جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھا کیونکہ وہ شہر کے بہترین اسکول میں داخلے کے لئے جا رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن واپسی پر وہ مایوس لوٹا تھا۔

”ڈیڈ۔۔۔۔۔ میرا داخلہ نہیں ہو سکا۔“ وہ بولا۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں جو میڈم ایڈمشن ٹیسٹ لے رہی تھی۔ اس نے مجھے فیل کر دیا۔۔۔۔۔ وہ ظالم تھی ڈیڈ۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بیٹا آپ نے غلط لکھا ہوگا۔ تبھی فیل ہوئے ہوں گے ناں۔۔۔۔۔!“ میں نے کہا۔

”ڈیڈ میں نے سب ٹھیک لکھا تھا۔۔۔۔۔ مگر وہ بہت بری تھی۔ اس نے سب کو پاس کر دیا اور مجھے فیل۔“

”آپ مایوس نے ہوں۔ ہم کل دوبارہ چلیں

گے۔ اور آپ کا ایڈمشن کرا آئیں گے۔“

جیک نے مجھے ایک نظر دیکھا اور چھت کی طرف بھاگ گیا تھا۔۔۔۔۔ وہاں چھت پر اس کا کمرہ تھا۔ میں اسے بلاتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔۔۔۔۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا چھت پر پہنچا مگر۔۔۔۔۔ وہاں جیک نہ تو اپنے کمرے میں موجود تھا اور نہ ہی کسی اور جگہ۔

اچانک مجھے گلی میں لوگوں کی آواز سنائی دی، میں بھاگ کر پہنچا تھا۔ کیونکہ جیک نے چھت سے چھلانگ لگا دی تھی اور اس کا خون سڑک پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

جب تک میں اسے اسپتال لے گیا۔۔۔۔۔ وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔

جیک حساس طبیعت کا بچہ تھا۔ اس نے جذبات میں آکر چھت سے چھلانگ لگا دیا تھا۔

روزی نہیں جانتی تھی کہ اسے کس نے مارا تھا۔۔۔۔۔ مرنے والا کب جان پاتا ہے۔

روزی کو کون تنگ کر رہا تھا۔

موت کا تعاقب مخصوص رفتار سے اسے اپنے شکنجے میں جکڑنے لگا تھا۔

جیک نے مرنے کے بعد روزی کو موت کے گھاٹ اتارا۔۔۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔۔۔؟

روزی تو انتظامیہ کی وجہ سے مجبور تھی اس میں روزی کا قصور کیا تھا۔

ڈائری میں لکھا احوال اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ روزی کو جیک نے ہی مارا تھا۔۔۔۔۔ کیونکہ ڈائری پر لکھی گئی تاریخیں جیک کے مرنے کے بعد کی ہیں اس سے پہلے کے حالات تو محبت اور شکایتوں پر مبنی تھے۔

”جیک۔۔۔۔۔ تم نے خود کو مار ڈالا۔۔۔۔۔ روزی کو بھی۔۔۔۔۔ اور ہر روز تمہارے غم میں تمہارا باپ مرتا ہے۔ بیٹا کاش! تم جذبات میں ایسا نہ کرتے۔“







## ظالم سلاطیہ

محمد قاسم رحمان - ہری پوری

جنگل کے وسط میں ایک خوبصورت دیدہ زیب تابوت پڑا تھا، تابوت کا ڈھکن کھلتے ہی اس جگہ موجود افراد ورطۂ حیرت میں پڑ گئے کیونکہ تابوت میں ایک خوبرو حسینہ لیٹی تھی ایک ہزار سال سے اور پھر اچانک

برسوں دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی ایک انٹ حیرت انگیز تحیر انگیز اچھوتی کہانی

تھا۔ بعد میں دادی سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ میری دور کی کزن ہے۔ یعنی میری دادی کے بھانجے کی بیٹی ہے۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ہمارے خاندان کی برسوں کی روایت ہے کہ شادی برادری سے باہر کسی صورت نہیں ہو سکتی۔ پھر میں نے امی سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ امی نے بھی ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کے بجائے ایک اچھی ماں ہونے کا ثبوت دیا اور

**ریحانہ** مجھ سے ناراض تھی اور میں بہت پریشان تھا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر ریحانہ کی ناراضگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ریحانہ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں میٹرک کے ایگزام دے کر گاؤں گیا تھا۔ راستے میں ریحانہ کنوئیں پر پانی بھر رہی تھی اور مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی تھی۔ اگلے دن ریحانہ کو اپنے گھر دیکھ کر میں حیران رہ گیا



میری اور ریحانہ کی منگنی بڑے آرام و سکون سے ہو گئی اور یہ طے پایا کہ جب مجھے جاب مل جائے گی تو شادی ہو جائے گی پھر چار سال گزر گئے۔

میں نے بی اے کا امتحان دیا اور گاؤں آ گیا۔ چار سالوں میں ریحانہ سے میرا رابطہ مستقل رہا اور مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ ریحانہ مینیج میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں جنگل میں جاتی ہے۔ میں نے جب اس کی وجہ ریحانہ سے پوچھی تو وہ بولی۔ ”جمیل جنگل میں چاندنی رات میں بہت مزا آتا ہے۔ وہاں شبنم سے بھیگی ہوئی نرم نرم گھاس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔“

ریحانہ کی باتیں سن کر میں ورطہ حیرت ہو گیا میں نے ریحانہ سے کہا۔ ”اگر کوئی جنگلی جانور یا درندہ تمہاری اس نرم نرم گھاس پر آ گیا تو میرا کیا ہوگا۔“

میری بات سن کر ریحانہ بولی۔ ”کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیشہ اچھا سوچنا چاہئے۔“

میں غصے میں بھول گیا کہ ریحانہ لفظ ”ڈھیٹ“ کو کس قدر ناپسند کرتی ہے۔ میں نے کہہ دیا ”ریحانہ تم بہت ڈھیٹ ہو۔“ اور ریحانہ ناراض ہو گئی۔

دو دن گزر گئے تھے اور ریحانہ راضی نہیں ہوئی تھی میں بہت ٹینشن میں تھا کہ ریحانہ کو کیسے راضی کروں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرا دوست فواد آ گیا۔

”کیا ہوا جمیل! کیوں اتنے گم صم ہو؟“ فواد نے مجھ سے پوچھا۔

میں بولا۔ ”یار ریحانہ مجھ سے ناراض ہے۔ کیسے مناؤں اس کو۔“

”فواد کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر ایک دم بولا۔ ”میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔“

”کیسا آئیڈیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”تم نے مجھے بتایا تھا کہ ریحانہ ہر چاند کی چودھویں رات جنگل میں گزارتی ہے۔ تم بھی کل جنگل میں جا کر اس کو سر پرانز دینا، وہ ایک دم مان جائے گی۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ ریحانہ کو منانے کا

بہترین حل ہے۔“ میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

”تو ٹھیک ہے۔ کل وہ جنگل میں جائے گی لیکن اس سے پہلے تم جنگل چلے جانا۔“ فواد نے کہا۔

میں بولا۔ ”یار میں اکیلا جنگل میں جاؤں گا، تم بھی میرے ساتھ چلو پلیز!“

فواد نے پہلے تو پس و پیش کی بعد میں اپنا سراسر اثبات میں ہلا دیا۔

میں کیسے جنگل میں آیا تھا مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن شاید میں راستہ بھول گیا تھا۔ اب اس گھنے جنگل میں شاید میں راستہ تلاش کر رہا تھا مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میں ایک عجیب گوشے میں آ گیا تھا۔ یہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک لمبا چوڑا گڑھا تھا۔ جبکہ اس گڑھے کے قریب ایک درخت تھا۔ وہ درخت پتوں سے بے نیاز تھا لیکن اس کی شاخوں کے سروں پر نئی کوئیلیں پھوٹ رہی تھیں اور ان نئی کوئیلوں سے سرخ سرخ قطرے نیچے زمین پر گر رہے تھے۔

میں تجسس کے مارے اس درخت تک آیا اور یہ دیکھ کر میری خوف سے جان ہی نکل گئی کہ وہ قطرے خون کے قطرے ہیں۔

میں نے درخت کے نیچے دیکھا تو زمین پر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ فیروزی رنگ کا وہ تابوت مجھے تو بڑا ہی عجیب سا لگا۔ لیکن اچانک کوئی سایہ سا اڑتا ہوا آیا کہیں سے اور اس نے مجھے ایسے اٹھالیا جیسے میں کوئی موم کی گڑیا ہوں وہ مجھے اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ اچانک کہیں سے تیز طوفان آیا اور.....

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا نجانے کیسا پر اسرار خواب تھا۔ میں خوف سے چور چور ہو چکا تھا۔ میں نے پاس پڑا ہوا پانی کا جگ دیکھا مگر اس میں پانی ختم ہو گیا تھا۔ میں کچن میں گیا وہاں جا کر پانی پیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوا تو امی کی کال آ گئی۔ امی شہر میں تھیں۔ میں اس مرتبہ گاؤں میں اکیلا آیا تھا۔ امی سے بات ہوئی تو انہوں



نے ابو سے بھی بات کروادی۔ ابو کے پاس خود تو کال کرنے کا ٹائم نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے بزنس میں بہت بڑی ہوتے ہیں۔ روایتی باتوں کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں صحن میں چار پائی پر بیٹھا ہوا ریحانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دادی نے مجھے آواز دی۔ ”جمیل جمیل ادھر آؤ۔“

میں دادی کے پاس گیا جو کچن میں کچھ بنا رہی تھیں۔ ”دادی آپ کیوں کام کر رہی ہیں۔ چاچی سے کہتیں وہ بنا دیتیں۔“ دادی کو کام کرتا دیکھ کر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔

دادی بولیں۔ ”بیٹا آئیے تو مجھے منع کر رہی تھی لیکن میرا دل لو کی کا حلوہ کھانے کو کر رہا تھا اور آئیے کے ہاتھوں کا بنا ہوا حلوہ مجھے پسند نہیں۔“

”دادی آپ نے مجھے کیوں بلایا؟“ میں نے پوچھا۔

دادی نے نفن میں حلوہ ڈالتے ہوئے کہا۔ یہ جا کر تم عابد کے گھر دے آؤ۔

میں نے بنا کچھ کہے دادی سے نفن لیا اور ماموں کے گھر کی طرف چل پڑا۔ عابد دادی کے بھانجے، میرے ماموں اور ریحانہ کے ابو تھے۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا تو سامنے بیٹھی ریحانہ نے منہ پھلایا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ابھی اس کی منتیں نہیں کروں گا۔

”یہ دادی نے بھجوا دیا ہے۔“ میں نے نفن میز پر رکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے سے میں نے ریحانہ کی بڑبڑاہٹ سنی۔ ”کھڑوس کہیں کا۔“ اس کی بات سن کر میں مسکرا دیا اور واپس گھر کی طرف ہولیا۔

میں دو قدم ہی چلا تھا کہ سامنے سے میں نے فواد کو آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس راستے پر دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”میں نے تجھے منع کیا تھا ناں کہ تو ریحانہ سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ ہم آج رات جنگل میں جا کر اس کو

سر پرانزدے کر منالیں گے۔ مگر تجھے میری باتوں پر یقین کہاں ہے۔ تیرے نزدیک تو میں احمق ہوں ناں۔“ حسب روایت حسب معمول اس کا ناں اسٹاپ ریڈیو کا بٹن آن ہو گیا تھا۔ ”میرے یار میری بات سن۔“ میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر کہا۔ ”کول ہو جاؤ، مجھے دادی نے حلوہ دینے کے لئے بھیجا تھا اور تم ہو کہ شروع ہو جاتے ہو۔“

”سوری۔“ فواد بولا اور میں نے سر اثبات میں ہلادیا۔

رات ہو رہی تھی اور میں لیٹا ہوا تھا کہ فواد کا مسیج آ گیا۔ ”میں باہر آ گیا ہوں۔ جلدی نکلو۔“ میں نے احتیاطاً ٹارچ بھی لے لی ہے۔“

میں نے فواد کو فٹ مسیج کیا۔ ”تم وہیں رکو میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔“

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم جنگل کے وسط میں کھڑے تھے۔ ”یار تیری محبوبہ تو کہیں نظر نہیں آ رہی۔“ فواد نے مجھے جڑانے کے لئے کہا۔

میں بھی جھٹ سے بول پڑا۔ ”تمیز سے نام لے وہ تیری بھابھی ہے۔“

فواد نجانے کیوں چپ سا ہو گیا۔ ہم نے ریحانہ کو ڈھونڈنا شروع کر دیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک فواد رک گیا۔ ”کیا ہوا؟“ فواد سے میں نے پوچھا۔

”یار جمیل آئی ایم سوری۔“ فواد نے کہا۔ میں بولا۔ ”کیوں کس لئے سوری کر رہا ہے۔“

فواد اندامت سے چور لہجے میں بولا۔ ”یار آج چاند کی تیر ہویں رات ہے اور میں جذبات میں یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ چاند کی چود ہویں ہے۔ ریحانہ آج نہیں آئے گی، ہمیں کل پھر آنا ہوگا۔“

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ میں غم و غصے کی حالت میں بولا۔ ”یہ جنگل ہے تمہارا کوئی ہوٹل نہیں۔ چلو واپس۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں چاروں سمتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ریحانہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے نجانے ہم کس طرف آ گئے تھے۔ ”کس سمت جانا ہے۔“ میں نے



فواد سے پوچھا۔

”مجھے خود نہیں معلوم۔“ فواد بغلیں جھانکنے لگا۔

”دھت تیرے کی اب کیا ہوگا۔“ میں واقعی

پریشان ہو گیا تھا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو شمال کی

جانب چلتے ہیں۔ شاید راستہ مل جائے۔“ فواد نے کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ”فواد یہ ساری غلطی تمہاری

ہے۔ پہلے تم نے کہا کہ آج چاند کی چودھویں ہے۔ ہم

بھول گئے اور اب اس طرح ری ایکٹ کر رہے ہو جس

طرح کچھ ہوا ہی نہیں۔“

فواد بولا۔ ”جھیل یہ ٹائم لڑنے کا نہیں ہے۔ ہمیں

والپسی کا راستہ ڈھونڈنا ہے۔“ اور میں نے اثبات میں سر

ہلایا۔

ہم دونوں ایک عجیب سی جگہ پر آ گئے تھے۔ یہاں

بسی بسی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم متناہ ہو کر آگے بڑھ رہے

تھے۔ اس گھاس میں سانپ وغیرہ کا بھی ڈر تھا میں نے

دور سے پانی کا ایک تالاب دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ

میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور دیکھتا بھی کیسے میں پہلے

کبھی اس جنگل میں نہ آیا تھا۔ بے اختیار مجھے میرا خواب

یاد آ گیا۔

”یار فواد مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

فواد بولا۔ ”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم

جنگل سے نکل جائیں گے۔“

باتیں کرتے کرتے ہم آگے اس تالاب کے پاس

آ گئے تھے۔ اس تالاب سے ذرا ہٹ کر ایک درخت

پتوں سے بے نیاز کسی بھوت کی مانند کھڑا تھا۔ درخت کے

قریب دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اور قریب کی ساری

چیزیں بڑی واضح نظر آ رہی تھیں۔ درخت کی نئی کونپلوں

سے سرخ سرخ بوندیں نیچے زمین پر گر رہی تھیں۔ ”تو کیا

میرا خواب حقیقت میں بدل رہا ہے۔“ میں یہ ہی سوچ رہا

تھا۔

فواد درخت کے پاس گیا اور پھر خوفزدہ لہجے میں

بولا۔ ”یار اس درخت سے تو خون کی بوندیں گر رہی ہیں۔“

مجھے کوئی آ سیبی معاملہ لگتا ہے۔ یہاں سے فوراً نکلو۔“

میں نے سر اثبات میں ہلایا اور وہاں سے تقریباً ہم

بھاگنے لگے۔

آدھے گھنٹے کے تنگ و دو کے بعد بالآخر ہم جنگل

سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

”یار میں اب ریحانہ کو کیسے مناؤں گا؟“ میری بے

بسی دیدنی تھی۔

فواد چڑ کر بولا۔ ”یہاں ہم موت کے منہ سے باہر

نکلے ہیں اور تجھے اپنی محبوبہ کی پڑی ہوئی ہے۔“

”تو کیا کل تم نہیں آؤ گے میرے ساتھ۔“ میں

بے بسی سے بولا۔

”نہیں۔“ فواد نے کہا۔ ”مجھے اپنی زندگی بہت عزیز

ہے۔ میں اسے داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اچھا اب میں جاتا

ہوں۔“ فواد نے کہا اور اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔ میں بھی

گھر آیا اور شکر کیا کہ سب سو رہے تھے۔ میں نے گھڑی کی

طرف دیکھا تو پونے تین کا ٹائم تھا۔ میں فنافٹ بستر میں

گھسا اور سو گیا۔

صبح میری آنکھ گیارہ بجے کھلی۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔

اور نمپر پچر بھی ہو رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھا اور جا کر نیم

گرم پانی سے نہایا اور پھر چائے پینے کے بعد طبیعت ذرا

بحال ہوئی۔ میں باہر نکل آیا اور ایک طرف چلنے لگا بے

مقصد.....! میں سوچ رہا تھا کہ ”کیا کروں ریحانہ کو کیسے

مناؤں اوپر سے فواد میرے ساتھ جنگل میں چلنے کے لئے

تیار نہیں۔“ کل رات جو ہوا اس نے میرے اعصاب کو

بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اس پر اسرار درخت کے بارے

میں سوچ رہا تھا۔ انسان کی فطرت میں تجسس کا مادہ کچھ

زیادہ پایا جاتا ہے۔ مجھے بھی تجسس تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا

کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔ لیکن فواد ساتھ چلنے کے لئے تیار نہ

تھا۔ سوچتے سوچتے پتا بھی نہ چلا کہ میں کب ریحانہ کے

گھر کے قریب آ گیا۔ مجھے پتا نہ چلا۔ میں نے سوچا ایک

کوشش اور کر لیتا ہوں اور میں ریحانہ کے گھر کے اندر

چلا گیا۔ ریحانہ کی امی کا تو بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی

بہن بھائی بھی نہ تھا اور ماموں کھیتوں میں کام کرتے تھے



اس لئے ریحانہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو ریحانہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میں ریحانہ کے قریب چلا گیا۔ ریحانہ نے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”ابو گھر میں نہیں ہے۔ کیا کام ہے تمہیں؟“

”ریحانہ آئی ایم سوری۔“ میں نے کہا اور رات میں ہونے والا سارا واقعہ اس کو بتا ڈالا۔

میری باتیں سن کر ریحانہ بولی۔ ”کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔“

”تمہاری قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے کل رات ہم دونوں ادھر چلیں گے اور دیکھتے ہیں کہ ماجرہ کیا ہے۔“ ریحانہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”لیکن ریحانہ کچھ غلط نہ ہو جائے۔“ میں بولا۔ ریحانہ بولی۔ ”کچھ نہیں ہوتا۔“ میں بھی ریحانہ کی ناراضگی کے ڈر سے چپ ہو گیا۔

دوسرے روز کی شام بہت سہانی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور میں صحن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے امی کا فون آیا تھا۔ وہ واپس آنے کا کہہ رہی تھیں اور میں نے بھی کہہ دیا کہ میں ایک ہفتے میں آ جاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد فواد آ گیا۔ ”جیمیل کیسے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں تمہاری وہ دعائیں ہیں جو تم نے کبھی کی ہی نہیں۔“

”اچھا یار سوری۔ کل ہم جنگل میں جائیں گے اور پتہ لگائیں گے کہ اس درخت کے کیا اسرار ہیں۔“

میں نے فواد کو بتایا کہ ”ریحانہ مجھ سے راضی ہو گئی ہے اور وہ بھی اس درخت کے اسرار جاننا چاہتی ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ کل رات ہم تینوں جنگل میں جائیں گے۔“ فواد نے کہا۔

میں بولا۔ ”یار پہلے میں ریحانہ سے پوچھ لوں ناں کہ وہ تمہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ بھی ہے کہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے، اسے کال کرو بلکہ میسج کر دو۔“ میں

نے ریحانہ کو میسج کیا اور اسے بتایا کہ فواد ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ کچھ دیر میں اس کا جواب آ گیا۔ ”ایک سے بھلے دو دو سے بھلے تین۔“

ریحانہ نے رات کو ہمارے گھر رکنے کا پلان بنایا ہوا تھا۔ تاکہ رات کو ہم آسانی سے اپنا مشن سرانجام دے سکیں۔ ریحانہ چاچی کے کمرے میں سوئی تھی بلکہ سونے کی اداکاری کی تھی۔ رات نو بجے میں نے ریحانہ کو میسج کیا کہ ”چلو باہر آ جاؤ۔“ تھوڑی دیر میں ریحانہ صحن میں آ گئی اور پھر ہم دونوں گھر سے باہر گلی میں نکل آئے۔ گلی سنسان ویران تھی۔ ”فواد کدھر مر گیا؟“ ریحانہ نے پوچھا۔

”اسے فون کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اپنا موبائل نکالا تو لو بیٹری کی وجہ سے شٹ ڈاؤن ہو چکا تھا۔ اچانک سامنے سے فواد آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کدال تھی۔

ریحانہ بولی۔ ”یہ کیوں لے کر آئے ہو؟“ فواد بولا۔ ”جنگل میں کسی بھی جنگلی جانور سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے اس لئے لے کر آیا ہوں۔“

خیر ہم تینوں جنگل کی طرف چل پڑے۔ ہم جنگل میں جب پہنچے تو ریحانہ بولی۔ ”کدھر ہے آپ کا وہ پراسرار درخت؟“

میں نے کہا۔ ”ریحانہ جنگل بہت وسیع ہے۔ ہمیں درخت ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”تو چلو ڈھونڈتے ہیں۔“ ریحانہ بولی۔ ”ریحانہ تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔“ فواد بولا۔

ریحانہ نے جواب دیا۔ ”ڈر کس بات کا۔“

ریحانہ تم واقعی بہت الگ ہو۔ ورنہ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ کپکپاتی۔ ”میرے لہجے میں ریحانہ کے لئے ستائش تھی۔

ریحانہ فٹ سے بولی۔ ”زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کام کے لئے آئے ہو وہ کرو۔“

آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ ٹائم لگا تھا ہمیں وہ جگہ ڈھونڈنے میں، بالکل ویسی ہی جگہ تھی جیسی ہم چھوڑ کر گئے تھے۔



ریحانہ نے اس پر اسرار درخت کا غور سے مشاہدہ کیا۔  
 ”اب ہم کیسے جانیں گے کہ یہ سب کیا ہے؟“  
 فواد بولا۔

”ایک طریقہ ہے۔ ہم درخت کے نیچے کھدائی کرتے ہیں اور ویسے بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ درخت کے نیچے ایک فیروزی رنگ کا تابوت ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔“ فواد بولا۔  
 میں نے چڑ کر کہا۔ ”اب ہر بات تمہیں بتانا ضروری ہے کیا۔“  
 ”بالکل۔“ فواد نے کہا۔

”اس وقت لڑومت۔“ ریحانہ بولی۔ ”بعد میں لڑنا پہلے کھدائی کرتے ہیں۔“

مجھے ریحانہ پر بہت حیرت ہو رہی تھی یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ لیکن اتنی بہادر ہے اس بات کا مجھے نہیں پتہ تھا۔

فواد اور میں نے کھدائی شروع کر دی۔ آدھے گھنٹے کی کھدائی کے بعد مٹی کا رنگ ہر اہونے لگا۔  
 ”یہ مٹی تو عجیب رنگ کی ہے۔ یقیناً کچھ نہ کچھ تو ہے۔“ ریحانہ نے کہا۔

اچانک کھدائی کے دوران مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ نیچے کوئی کھروری چیز ہے۔ میں نے فواد سے کہا کہ ”نیچے کوئی کھروری چیز ہے۔ ہاتھ سے مٹی ہٹاؤ۔“  
 فواد نے سر اثبات میں بلایا اور ہم ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگے۔

آج بھی اس جگہ صاف و شفاف دودھیا روشنی موجود تھی اور ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔

جلد ہی ہم نے فیروزی رنگ کا ایک تختہ دیکھا اور مزید کھدائی کے بعد پتہ چلا کہ وہ تابوت ہے۔ میں نے اور فواد نے تابوت باہر نکالا۔ ریحانہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”جلدی سے تابوت کو کھولو۔“ تابوت کو تالا نہیں لگا ہوا تھا ہم نے آسانی سے تابوت کھول دیا۔ تابوت کو کھولنا تھا کہ ہم تینوں کو حیرت کے جھٹکے لگنے لگے۔

تابوت میں ایک خوب رو حسینہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پال سنہری تھے اور اس نے لمبی سی پوشاک پہنی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا شیٹے کا بکس موجود تھا۔ چھوٹا سا تھا اور اس میں خونی رنگ کی ایک جلد والی موٹی سی کتاب تھی۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ ریحانہ حیرت سے بولی تو ہم دونوں کیا جواب دیتے ہم دونوں بھی ورطہ حیرت تھے۔

میں بولا۔ ”ہمیں کتاب کو دیکھنا ہوگا۔ کیا پتہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لئے کوئی کلیول جائے۔“  
 ریحانہ بولی۔ ”جھیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کتاب اٹھاؤ۔“ میں نے وہ بکس اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ میں نے کتاب اٹھائی۔ سامنے ٹائٹل پر اس لڑکی کی ہی تصویر تھی۔ کتاب کا نام ”ظالم سلاطینہ“ تھا۔ کتاب اردو میں اور ہاتھ سے لکھی گئی تھی۔

ہم تینوں وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے کتاب کھولی۔ دودھیا روشنی اس قدر تھی کہ کتاب کی تحریر صاف طور سے نظر آرہی تھی۔

کتاب کی تحریر تھی سب جانتے تھے کہ بادشاہ بہت رحم دل ہے مگر اپنا رعب دوسرے لوگوں پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی بادشاہ اپنے اسی رعب و دبدبے اور کروفر سے اپنے تخت پر براجمان کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا کہ اس کا مقرب خاص اس کے کمرے میں داخل ہوا اور جھک کر آداب بجالایا۔

”بادشاہ سلامت میری بیٹی پیدا ہوئی ہے میں کچھ دن اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

بادشاہ نے اپنے مقرب خاص کی طرف دیکھا اور پھر یکدم مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بہت مبارک ہو تمہیں، بیٹی کا نام کیا رکھا ہے؟“

مقرب بولا۔ ”بادشاہ سلامت اس کا نام اس کی ماں نے سلاطینہ رکھا ہے۔“

”بہت خوبصورت نام ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دیتے ہیں۔“

مقرب نے ایک بار جھک کر بادشاہ کی تعظیم کی اور



چلا گیا۔  
مقرب کے جانے کے بعد وہاں ایک گول مٹول سا  
بچہ حاضر ہوا۔

”آؤ میرے بیٹے۔“ بادشاہ بولا۔ وہ بچہ بادشاہ کا  
بیٹا تھا اس کا نام زنتاش تھا۔

”بابا جان ابھی تھوڑی دیر پہلے کون آیا تھا؟“  
زنتاش نے پوچھا۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے کو اپنے قریب بیٹھایا اور بولا۔  
”میرا مقرب خاص آیا تھا۔ کچھ دن کی چھٹی لینے کے لئے۔“  
”چھٹی کیوں؟“ زنتاش نے ایک بار پھر سوال کیا۔  
”اس کے گھر پیاری سی بیٹی پیدا ہوئی ہے اس  
لئے۔“

”بابا ہم بھی جائیں گے، اس کی بیٹی دیکھنے کے  
لئے۔“ زنتاش نے ضد کی۔

”بیٹا ہم کیسے جاسکتے ہیں۔ یہ کیسی ضد ہے۔“ بادشاہ  
نے کہا تو زنتاش نے رونا شروع کر دیا۔

”اچھا روؤ مت تم چلے جانا، میں تمہیں وہاں  
بھجوا دوں گا۔“ بادشاہ نے کہا اور زنتاش خوش ہو گیا۔

شام کے وقت جب شہزادہ، مقرب خاص کے گھر  
میں داخل ہوا تو گھر والوں کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔  
زنتاش نے ننھی سی سلاطیہ کو دیکھا اور اس کو گود میں اٹھا کر  
خوش ہونے لگا۔

☆.....☆.....☆

وقت کے پرندے نے اپنی اڑان بھری اور سترہ  
سال گزر گئے۔ ان سترہ سالوں میں ہر کوئی یہ جان گیا تھا  
کہ زنتاش، سلاطیہ اور سلاطیہ سے زنتاش سے ٹوٹ کر  
محبت کرتی ہے۔ بادشاہ نے بھی یہ بات تسلیم کر لی تھی لیکن  
ملکہ کو یہ بات نا پسند تھی کیونکہ اس کو سلاطیہ پسند نہیں تھی۔  
سلاطیہ بھی یہ بات جان گئی تھی کہ شہزادے اور اس کی محبت  
کے درمیان سب سے بڑا کاٹنا زنتاش کی ماں ہے اور پھر  
سلاطیہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کاٹنے کو ہٹا کر رہے گی۔

سلاطیہ جانتی تھی کہ ملکہ کے پاس طاقتوں کا انبار  
ہے وہ ایک شگفتی شالی جن زادی ہے۔ اور پھر سلاطیہ نے

اپنے استاد سے مشورہ کیا تو استاد نے بتایا کہ ”ایک عمل ہے  
جس کے ذریعہ ملکہ کو زیر کیا جاسکتا ہے مگر اس عمل میں 21  
انسانوں کا خون درکار ہوگا۔ اور تم وہ عمل کر کے کامیاب  
ہو سکتی ہو، یعنی یہ کہ ملکہ موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔“

انسانی بستی اس قبیلے سے زیادہ دور نہیں تھی اور یہ  
قبیلہ ایک گاؤں سے ذرا فاصلے پر کھنڈرات میں مقیم تھا۔

سلاطیہ نے لوگوں کا خون پینا شروع کر دیا۔ اس  
نے سولہ انسانوں کا خون پی لیا تھا۔ یہ بات نجانے کیسے  
بادشاہ کو معلوم ہو گئی۔ جب سلاطیہ کو بادشاہ نیست و نابود  
کرنے کے لئے آ رہا ہے تو زنتاش نے بادشاہ کی منتیں اور  
واسطے دے کر ایسا کرنے سے روکا اور بادشاہ سے وعدہ کیا  
کہ وہ سلاطیہ کو ایسا کرنے سے روکے گا۔

زنتاش سلاطیہ کے پاس گیا اور سلاطیہ سے ایسا  
گھناؤنا کام کرنے کی وجہ پوچھی۔ جو اب سلاطیہ نے بتایا کہ  
”وہ اس کی ماں کو مارنے کے لئے ایسا کر رہی ہے۔“

زنتاش کو بہت غصہ آیا اور اس نے اپنی طاقتوں کی  
مدد سے سلاطیہ کو تابوت میں دفن کیا اور ساتھ میں یہ کتاب  
لکھ ڈالی۔

آخر میں لکھا ہوا تھا کہ ”سلاطیہ سے میں بے انتہا  
محبت کرتا ہوں مگر ایک خونی اور ایک ایسے وجود کو کبھی  
معاف نہیں کر سکتا جو میری ماں کی جان لینا چاہتا ہو۔ میں  
اپنے علم سے دیکھ رہا ہوں کہ تین انسان اس تابوت کو  
صدیوں بعد دیکھیں گے اور ان تین انسانوں میں سے کسی  
ایک کے جسم میں سلاطیہ کی روح حلول کر جائے گی۔“

آگے صفحات خالی تھے۔ ہم تین لوگوں پر جیسے سکتے  
سا چھا گیا تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فواد ڈرتے  
ہوئے بولا۔ ”اب کیا ہوگا۔ سلاطیہ زندہ ہو جائے گی؟“

ریحانہ بولی۔ ”اللہ پر بھروسہ رکھو کچھ نہیں ہوگا۔“  
میں نے اپنی ریسٹ وائچ پر ٹائم دیکھا۔ دو بج رہے  
تھے۔ ”ہمیں واپس جانا ہوگا، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔“

ریحانہ بولی۔ ”اس تابوت اور کتاب کا کیا کریں؟“  
”میرے خیال میں کتاب ساتھ لے چلتے ہیں۔“  
میں نے کہا اور ہم سب واپسی کے لئے چل پڑے۔



ایک گھنٹے بعد میں اپنے گھر میں تھا۔ وہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بہت ٹینشن میں تھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ کمرے میں بہت گھٹن ہو رہی تھی اس لئے میں چھت پر آ گیا۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں چھت پر راؤنڈ لگانے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور بھی یہاں موجود ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی۔ ہاں وہ سلاطیہ ہی تھی..... اس کے بال ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔

میں نے فٹنٹ وہاں سے دوڑ لگائی پیچھے سے مجھے سلاطیہ کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ پر چادر لی اور آنکھیں موند لیں۔ پھر نجانے کب مجھے نیند آ گئی۔ صبح دادی کے شور سے میری آنکھ کھلی تھی۔ دادی کہہ رہی تھیں۔ ”ریحانہ بیمار ہو گئی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا ریحانہ کو؟“ تو دادی کا جواب سن کر مجھے زمین اور آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ”ریحانہ پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔“

”کیا!“ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کس طرح ری ایکٹ کروں، مجھے کتاب والی بات یاد آ گئی تھی۔ ”کہ کسی ایک میں سلاطیہ کی روح حلول کر جائے گی۔“

میں بستر سے اٹھا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ دادی یہی سمجھی تھیں کہ میں ریحانہ کے گھر جا رہا ہوں۔ لیکن میں فواد کو سب کچھ بتانے کے لئے جا رہا تھا۔

رات کو بھی میں نے سلاطیہ کو دیکھا تھا، نجانے کیا ہونے والا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے اندیشے آرہے تھے۔ میں فواد کے گھر گیا اور اسے ریحانہ کے بارے میں بتایا۔ فواد بولا۔ ”یار جمیل میں نے بھی کل سلاطیہ کو دیکھا تھا وہ میری جانب دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ میری بات اور ہے تو ریحانہ کے گھر جا اس کی حالت دیکھ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”فواد تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اچھا میں ماموں کے گھر جا رہا ہوں۔“

میں ماموں کے گھر آیا۔ کمرے میں ماموں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں میری خالہ اور چاچی بھی ادھر ہی تھیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو کسی نے بھی کچھ خاص نوٹس نہ لیا۔ میں نے ماموں سے کہا۔ ”کسی اللہ والے کو دکھایا ہے؟“

مسجد کے پیش امام صاحب کے پاس گیا تھا۔ لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جمیل بیٹا ریحانہ کی حالت کے پیش نظر میں بہت پریشان ہوں۔ ماموں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اچانک ریحانہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ریحانہ کی آنکھیں اس طرح سرخ ہو رہی تھیں جیسے ان میں کسی نے خون انڈیل دیا ہو۔ ہم سب نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ ریحانہ نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخوں سے درو دیوار کانپنے لگے۔ وہ پھر ایک دم چپ ہو گئی اور اس نے ہنسا شروع کر دیا۔ کچھ دیر ہنستی رہی پھر اس نے ردنا شروع کر دیا۔

مجھ سے یہ منظر دیکھنا گیا اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ فواد کے گھر کی جانب تھا۔ فواد مجھے باہر ہی مل گیا۔ میں نے فواد کو ساری صورتحال بتائی۔ تو فواد نے کہا۔ ”جمیل ہمیں شہر میں کسی عامل سے رجوع کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے فواد چلتے ہیں لیکن اس وقت شہر جانے والی کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔“ فواد نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ہم بائیک پر چلتے ہیں۔“

ہم شہر پہنچ کر ایک بزرگ کے آستانے میں گئے۔ ہم انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے اپنے نمبر کا انتظار کر رہے تھے۔ عامل صاحب کا نام ”گلاب شاہ“ تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ ہم کمرے میں گئے۔ کمرے میں لوہان اور اگر بیٹوں کی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر ایک کارپٹ پڑا ہوا تھا، عامل صاحب سفید لباس میں ملبوس تھے۔ آنکھوں سے چمک اور چہرے سے روحانیت نکلتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ ”بولو بیٹا کیا مسئلہ ہے؟“

میں نے ان کو بتانا شروع کیا اور پھر آخر تک سب کچھ



بتا دیا۔ وہ میری تمام باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے۔

میری بات ختم ہوئی تو وہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ کی حالت میں بیٹھ گئے۔

پانچ منٹ بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بولے۔ ”بیٹا آپ کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ آپ لوگ کل اسی وقت آجانا۔ پھر ہم آپ کے ساتھ آپ کے گاؤں چلیں گے۔“

فواد ڈرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ صاحب آپ کا ہدیہ کتنا ہے؟“

عامل صاحب نے پہلے تو فواد کو طیش کے ساتھ دیکھا پھر بولے۔ ”بس میرے لئے دعا کیا کرنا۔“

ہم واپس گاؤں آ گئے۔ گاؤں میں ہر کسی کو پتہ چل گیا کہ ریحانہ پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ ہر عورت ہر بچہ بس یہ ہی کہہ رہا تھا کہ ”ریحانہ آسپی ہو گئی ہے۔“ ٹینشن کی وجہ سے ماموں کا بی پی لو ہو گیا تھا اور وہ بستر سے لگ گئے تھے۔

جب میں رات میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کیونکہ یہ سب میری وجہ سے ہو رہا تھا، نہ میں جنگل جاتا اور نہ یہ سب ہوتا، لیکن اس میں کہیں نہ کہیں غلطی ریحانہ کی بھی تھی، اس نے جنگل جانے کی بے حد ضد کی تھی۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب آنے والے لکل کے بارے میں سوچنا تھا۔

اگلے روز میں اور فواد عامل صاحب کے آستانے پر چلے گئے۔ اس مرتبہ ہماری باری کچھ ہی دیر میں آ گئی۔ ہم اندر گئے اور عامل صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔

وہ بولے۔ ”کچھ وجوہات کی بنا پر میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتا لیکن اس مسئلے کا حل میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔“

”جی فرمائیں کیا حل ہے؟“ میں بے صبری سے بولا۔ عامل صاحب بولے۔ ”تمہیں سلاطیہ کے جسم اور اس کتاب کو جلا کر خاکستر کرنا ہوگا۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں ہے؟“ فواد نے پوچھا۔

”نہیں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔“ عامل

صاحب بولے۔

چاندنی رات تھی۔ میں اور فواد جنگل میں جا رہے تھے۔ فواد کے ہاتھ میں ایک کین تھا۔ اس کین میں مٹی کا تیل تھا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہ جگہ تلاش کر چکے تھے۔ عامل صاحب نے ایک بوتل میں دم کیا ہوا پانی دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تابوت کے پاس پہنچ کر اس پانی کو تابوت کے چاروں طرف حصار کی صورت میں چھڑک دینا اور تھوڑا پانی تم دونوں اپنے جسم پر بھی چھڑک لینا۔

درخت کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ سلاطیہ اسی طرح تابوت میں پڑی ہوئی تھی جس طرح ہم چھوڑ کر گئے تھے۔

پھر ہم نے عامل صاحب کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا۔ پھر میں نے سلاطیہ کے لاش نما جسم پر مٹی کا تیل اور ساتھ میں کتاب رکھی اور آگ لگا دی۔ آگ نے جیسے ہی کتاب کو چھوا، اس منحوس درخت کو بھی آگ لگ گئی۔ فواد اور میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ جلد ہی ہم گاؤں آ گئے، میں اپنے گھر گیا اور بستر پر لیٹ کر تمام واقعات پر غور کرنے لگا کہ اب نہ جانے کیا ہوگا۔

صبح میں جلدی اٹھا اور ریحانہ کے گھر گیا۔ ریحانہ ٹھیک ہو چکی تھی اور ماموں جان بے انتہا خوش تھے۔ ریحانہ نے مجھ سے پوچھا۔ ”جمیل مجھے کیا ہوا تھا؟“ کمرے میں میرے اور ریحانہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے ریحانہ کو میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

”سوری جمیل! میری وجہ سے یہ سب ہوا۔“ ریحانہ نے کہا۔

”سوری کی کوئی بات نہیں جانو۔“ میں نے کہا اور ریحانہ کے چہرے پر جھکنے لگا تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”ہٹو برے۔“ اور کمرے سے بھاگ گئی تو میں بے اختیار مسکرا دیا۔

چند ماہ بعد ریحانہ کے ساتھ میری شادی ہو گئی اور ہم دونوں نے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا۔





# موت کا فرشتہ

پیاء بحر - گجرات

حصار میں بیٹھنے والے بیپھری ہوئی بدروح کو دیکھ کر تھرا اٹھے،  
آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور رگوں میں دوڑتا ہوا لہو  
منجمد ہونے لگا کہ اچانک بدروح طیش میں آکر حصار کی طرف  
بڑھی اور حصار سے ٹکراتے ہی زبردست دھماکہ ہوا پھر.....

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلا د بھی، اسی کے مصداق پراثر کہانی

ہونے لگی، بے بسی ہی بے بسی تھی میں ایک معروف رائٹر  
ابن آدم جس کی کہانیوں کی دھوم مچی ہوئی تھی جس کے  
ایک ایک لفظ پر قارئین بہت اشتیاق سے تبصرہ کرتے  
تھے، فینز کے خطوط کا ڈھیر تقریباً روزانہ ہی مجھے موصول  
ہوتا تھا، میرا نام ہی اسٹوری کے ہٹ ہونے کے لئے  
کافی تھا، ایڈیٹر پبلشرز فون پر فون کرتے تھے کہ اگلی  
کہانی یا ناول ان کے لئے لکھا جائے۔

فرسٹریشن بڑھتی جا رہی تھی میں نے سر کے  
بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں لے کر بھینچ لیا۔  
فوراً سے یہ خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپکا کہ مجھے  
آرام کرنا چاہئے میں نے دروازہ کھول کر ذہن  
کو پرسکون کرنے والی گولیوں کی شیشی نکالی اور تین  
گولیاں ایک ساتھ نگل کر پانی کا گلاس منہ سے لگایا  
اور غنا غٹ پی گیا۔ جلد ہی نیند کے جھونکے آنے لگے  
تو میں جلدی سے کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر آ لیٹا اور نیند کی  
آغوش میں چلا گیا۔

بہ مشکل پندرہ منٹ ہی سویا ہوں گا کہ دروازے  
پر زور زور سے دستک ہونے لگی، میں گہری نیند میں تھا  
دروازہ دھڑ دھڑانے سے میرے دماغ پر جیسے چوٹ  
پڑ رہی تھی دروازہ مسلسل بج رہا تھا ناچار اٹھ کر مندی

”یا اللہ مجھے کیا ہو گیا۔ مجھ سے کام  
کیوں نہیں ہو رہا؟“

کاغذ اور قلم میرے سامنے پڑے میرا منہ  
چڑا رہا تھا اور میں خالی الذہنی کے عالم میں انہیں  
گھورے جا رہا تھا، ادھر ادارے والوں کا اصرار روز بروز  
بڑھ رہا تھا، میں انہیں جھوٹی تسلیاں دے دے کر ٹال  
رہا تھا لیکن آخر کب تک ٹال سکتا تھا خاص نمبر کی  
اشاعت میں بہت کم عرصہ رہ گیا تھا، میں ابھی تک خاص  
نمبر کے لئے اپنی خاص الخاص تحریر کا پلاٹ بھی ترتیب نہ  
دے پایا تھا ذہن پر جیسے دھند چھائی تھی سوچوں پر جمود  
طاری تھا کچھ بھی لکھنا دشوار تھا۔

ایک وقت تھا کہ الفاظ میرے سامنے ہاتھ  
باندھے قطار میں کھڑے رہتے اور ایک یہ وقت کہ لاکھ  
چاہنے کے باوجود میں ایک جملہ بھی لکھ نہ پا رہا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ ماہ سے میں یونہی ٹیبل پر بیٹھا  
اور اپنی کہانی شروع کرنے کی کوشش کرتا مگر کیسی  
اور کہاں کی کہانی، جیسے ہی میں قلم ہاتھ میں پکڑتا میرے  
دماغ سے سب کچھ بھک سے اڑ جاتا اور میں ٹامک  
ٹوئیاں مارتا رہتا۔

کلینڈر پر تاریخ دیکھ کر مجھ پر جھنجھلاہٹ سوار







آنکھوں سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہے عجیب ہی ہیئت تھی اس کی، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ بوڑھا ہے یا جوان ہے، اس کا چہرہ برف کی مانند ٹھنڈا پڑا ہوا لگ رہا تھا آنکھیں بے نوری تھیں اس نے عجیب سا سفید لباس پہن رکھا تھا۔

اس آدمی کا حلیہ دیکھ کر میری نیند سے بوجھل آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

”جی فرمائے۔“ میں نے اخلاقاً پوچھا ویسے میں اندر سے پورا لرز گیا تھا۔ میری بات سن کر وہ مسکرائے لگا۔ ”موت کا فرشتہ۔“ وہ بولا تو ڈر کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آنے لگا۔

”جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔“ یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کرنا چاہا۔ لیکن یہ کیا وہ جھٹ سے دروازے کے پتوں بیچ آڑ بن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

”اندر آنے دو مجھے۔“ اس کی آواز ہر قسم کے تاثر سے عاری اور سرد تھی۔ میں نے کچھ کہے بغیر دروازے کو زور لگانا شروع کر دیا اتنی ہمت نہ تھی کہ اس آدمی کو دھکا دے پاتا، دروازے پر میرے زور لگانے کا کچھ اثر نہ ہو رہا تھا میری دھڑکنیں خوف سے بند ہونے کے قریب ہو گئیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا۔ نہ تو دروازہ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی وہ آدمی، میں نے جلدی سے دل میں فیصلہ کیا اور دروازے کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اس آدمی کو پورے زور سے دھکا دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں تھرتھرا کر پنے لگا۔

وہ آدمی اپنی جگہ سے غائب تھا، جسے ابھی ابھی میرے دونوں ہاتھوں نے چھوا تھا، وہ اٹل حقیقت کی طرح میری آنکھوں کے سامنے دروازے میں جم کر کھڑا تھا، اب ایک دم سے وہ کہاں غائب ہو گیا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، میں نے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک ہاتھ پر چٹکی کاٹی۔

”تو گویا یہ حقیقت ہے میں جاگ رہا ہوں۔“ ابھی میں وہیں کھڑا کشمکش کے عالم میں تھا کہ نجانے کس کو نے سے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا دروازہ ٹھک سے بند ہو گیا۔

خوف سے میری گھگھکی بندھ گئی ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو گیا بمشکل خود کو سمجھا بچھا کر بیڈ تک لایا اور سٹ سکڑ کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد میں دنیا و مافیاء سے بیگانہ ہو گیا۔

دوسرے دن کا سورج حسب معمول نکلا آنکھ کھلتے ہی رات کے واقعات میرے ذہن میں کلبلانے لگے میں نے اس کو خواب سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور فریش ہو کر فلیٹ سے نکل کھڑا ہوا، گھر سے باہر کی دنیا تو ویسی کی ویسی ہی رواں دواں تھی گاڑیوں کا دھواں ہارن کی آواز پیڑ پودے، گاڑیوں اور رکشوں کے پیچھے بھاگتے بھکاری سڑک کے کنارے، پھل والے ریڑھی بان آوازیں لگاتے ہوئے سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اور مسافر خانے کی دیوار کے ساتھ بیٹھا وہ میلا کچلا آدمی بھی معمول کے مطابق وہیں سکڑا سٹا بیٹھا تھا اس کے پاس ہی ایک میلا سا کمبل اور دو چار گندے برتن پڑے تھے جن پر کھیاں بھنھنا رہی تھیں اس کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ کسی بھی نفیس آدمی کا جی اس کو دیکھ کر متلانے لگے مگر پھر بھی لوگ بہت شوق سے اس کے پاس آتے اس کے پاؤں دباتے چائے لا کر پلاتے اور اپنے مسئلے مسائل بھی بیان کرتے، میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزر گیا، ایک عام سے ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد میں گھر لوٹ آیا۔

اپنے فہم کے جادو کو جگانے کی تمام کوششیں بے کار ہوتی جا رہی تھیں میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو ایک کردار کے روپ میں ڈھال کر اس کے احساسات اور جذبات کو محسوس کروں اور ان کو قلمبند کر لوں، کردار میں ڈھلنا تو دور کی بات میں تو اپنا ہی اصلی چہرہ بھول گیا تھا۔ میرے احساسات و جذبات کہاں گئے کچھ بھی محسوس کیوں نہیں ہوتا، محبت نہ ہی نفرت، کیا کروں میرے خدا اپنی ہی سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر میں دوسرے دن فلیٹ سے نکلا اور وہیں دیوار کے ساتھ بیٹھے آدمی کے کچھ نزدیک ایک جگہ پر بیٹھ کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں تک کیوں آ گیا۔

الاشعوری طور پر قدم خود بخود اس جانب اٹھ آئے



سے نکل کھڑا ہوتا اور اپنی مخصوص جگہ پر کچھ فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ جاتا۔

وہ دن بھی عام دنوں کی طرح ہی تھا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمان تھا لوگ اسے رحمان بابا کہتے تھے وہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا ہمیشہ اپنی نظریں جھکا کر رکھتا اس کے انداز سے عجز و انکسار جھلکتا لیکن کبھی کبھی وہ لوگوں کے ساتھ مس بی ہو بھی کرتا تھا تب میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کتنا مغرور ہے لوگ اس کی کتنی عزت و احترام کرتے ہیں اور یہ سب کو دھتکارتا ہے کتنا مغرور انسان ہے ایک طرف تو سب کو غلط سبق دیتا ہے کہ ”جاؤ محبت کرو۔“ دوسری طرف اس طرح کا سلوک یہ ضرور کوئی جرائم پیشہ فرد ہے یا پھر کسی دشمن ملک کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔

میں اپنا دکھ بھول کر رحمان بابا کی ذات میں کھو جاتا اور کبھی بھی کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچ پاتا۔

میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا نجانے ایسا کیا ہوا کہ میں چونک پڑا پورے کا پورا منظر خون میں نہایا ہوا تھا گاڑیوں والے گاڑیاں دوسری گاڑیوں سے ٹکرا رہے تھے پیدل چلنے والے بھی ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے ریزھی بان اپنے پھل اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کو مارتے، جیسے ہی وہ پھل کسی کو لگتا ایک دھماکہ سا ہوتا اور خون کے فوارے چھوٹ جاتے۔ عورتیں اور مرد ایسے ایک دوسرے سے گتھم گتھا جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں میری ٹانگیں شل ہو گئیں میں خوف سے اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پایا۔ ایک چیز سب میں مشترک تھی کہ سب نے عجیب سے جھولتے اور لٹکتے ہوئے تار تار سفید لباس پہن رکھے تھے جیسے ہی میں نے ان کا لباس دیکھا مجھے اس دن والا شخص یاد آ گیا جو میرے فلیٹ پر آیا تھا اس کا خیال آتے ہی مجھے چکر سا آ گیا۔

”یا اللہ یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا؟“ میں نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔

تھے اس فقیر کے بارے میں میری رائے پہلے کی نسبت بد ل گئی تھی وہ شاید کوئی درویش آدمی تھا اس کے ارد گرد ٹریفک کا ایک دریا سا بہتا تھا لوگوں کا ایک بجوم بے کراں گزرتا تھا مگر وہ اس طرح پرسکون آنکھیں بند کئے رہتا جیسے وہ اس منظر کا حصہ ہی نہ ہو اس کے پاس لوگ دعا کے لئے آتے وہ مسئلہ سن کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا بات بہت کم کرتا۔ جب بھی بات کرتا تو یہ ضرور کہتا۔ ”محبت کرنا سیکھو جا کر محبت کرو۔“

شاید کوئی ناکام عاشق تھا جو محبت کی شکست سے گھبرا کر فرار چاہتے ہوئے بھیس بدل کر اس کو نے میں بیٹھ رہا تھا۔

جس ڈائجسٹ کے لئے مجھے کہانی لکھنا تھی ان کی طرف سے ہر دوسرے تیسرے دن کا لز موصول ہوتی اور میں ان کو یہ کہہ کر ٹال دیتا۔

”کہانی اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ ڈونٹ وری ٹائم پر پہنچ جائے گی۔“

میں چاہنے کے باوجود ان کو یہ نہ بتا پاتا کہ ابن آدم کے الفاظ اس کا فن اس کے کردار اس سے روٹھ گئے ہیں یا پھر آنکھ مجھولی کھیل رہے ہیں اس لئے کہیں چھپ گئے ہیں۔

بتاتا بھی کیا کہ ”میں، میں نہیں رہا میرا فن میرا نہیں رہا یا پھر میرے ذہن پر جمود طاری ہے بے حسی اور بے کیفی کی برف جم گئی ہے۔“

جب احساسات و جذبات نہ رہیں تو انسان انسان نہیں رہتا زندہ لاش بن جاتا ہے کامیابی کی منزلیں جس تیزی سے طے کی تھیں اسی تیزی سے تنزلی کی طرف جارہا تھا تو کیا ابن آدم کا اینڈ ہونے جا رہا ہے۔

نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں ایسا ہونے نہیں دوں گا میں ضرور لکھوں گا، ضرور ایک سپر ہٹ اسٹوری لکھوں گا جسے لوگ میری باقی کہانیوں کی طرح فراموش نہیں کر پائیں گے میں خود کو گرنے نہیں دے سکتا۔

جب پریشانی حد سے بڑھ جاتی تو دل چاہتا کہ دیوار کے ساتھ سر ٹکرا دوں اور ایسے میں، میں گھر



”یہ بیمار ہے۔“

میں نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔ اب میں سوچنے لگا کہ گھر میں صرف ایک آدمی کا کھانا ہے ان کو کیا کھلاؤں، کھانے کا خیال آتے ہی پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی بول پڑا۔ ”ہم دن کو کھانا لائے تھے سوچا تھا تم ہوش میں آؤ تو مل کر کھائیں گے۔“ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں نے آپ کا کچن دیکھ لیا تھا میں کھانا گرم کر لوں۔“

میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا، میں چاہتا تھا کہ یہ لوگ اب یہاں سے چلے جائیں۔

خدا جانے چور ڈاکو تھے یا کون تھے زبان سے یہ کہنا مشکل لگ رہا تھا کہ آپ چلے جائیں کچھ دیر ہی گزری تھی کہ وہ ہاتھ میں ٹرے لئے آگیا میں اخلاقتاً سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنے چہرے پر پھیلی ناگواری کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا وہ ٹرے درمیان میں رکھ کر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا اس کی پراسراری مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی جو کہ مسلسل میری الجھن میں اضافہ کر رہی تھی۔

اس نے پہلا نوالہ منہ کے قریب کیا ہی تھا کہ وال کلاک نے گیارہ بجادیئے اس نے ٹائم دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ”بھائی کھانا شروع کرو۔“

میں جھل سا ہوا گیا وہ اتنے خلوص اور چاہت سے مجھے بیمار سمجھ کر میری خدمت کر رہا تھا اور میں اس پر شک کئے جا رہا تھا، پھر میں نے خود کو ملامت کی۔ ”یہ بھی اگر کھانے میں شریک ہوتے تو اچھا ہوتا۔“ میں نے سوئے ہوئے آدمی کے متعلق کہا تو وہ بولا۔

”نہیں جناب ان کو ابھی آرام کرنے دیں یہ بہت تھک گئے ہیں کچھ دیر تک اٹھ کر یہ بھی اپنا کھانا ضرور کھالیں گے۔“

”ان کو ہوا کیا ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

ایک بھکاری بچہ ایک بہت معصوم بچے کو نوچ رہا تھا، بھکاری بچے نے دوسرے بچے کے سر کو بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کا منہ نوچ رہا تھا بچے کی چیخیں آسمان ہلا رہی تھیں مجھے ابکائی آئی اور ساتھ ہی میں نے الٹی کر دی مگر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے فلیٹ پر تھا دو آدمی میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھے تھے۔ ان سے مجھے پتہ چلا کہ میں تیز دھوپ کے باعث میں چکرا کر گرا تھا۔ اور بے ہوش ہو گیا تھا۔

میں کہنیوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک آدمی بولا۔

”لیٹے رہو بھائی، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ آدمی دیکھنے میں بھلا مانس اور دردمند دل رکھنے والا لگ رہا تھا پھر بھی میں سہم گیا اور ان کی شکلوں اور لباس کو غور سے دیکھنے لگا وہ سیدھے سادھے میض شلوار میں ملبوس تھے، میرے دل کو ذرا ڈھارس بندھی تو میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کروں بھائی جان کہ آپ مجھے یہاں تک لے کر آئے۔“

وہ آدمی مسکرا دیا۔ جبکہ دوسرا شخص آرام سے پاؤں پیارے بیڈ کی ٹیک سے سر نکا کر بیٹھا تھا۔ اس نے سر پر ایک میلے سے کپڑے کا ڈھانٹا باندھا ہوا تھا وہ دیکھنے میں نحیف و نزار لگ رہا تھا۔ اس سے نظر ہٹائی تو کھڑکی کے باہر پھیلتے اندھیرے پر نظر پڑ گئی میں نے فوراً وال کلاک پر ٹائم دیکھا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے حیرانگی سے اس آدمی کو دیکھا جو مجھ سے ذرا قریب بیٹھا تھا اور ہوش آنے کے بعد سے اب تک وہی مجھ سے مخاطب تھا ڈھانٹے والا شاید اونگھ رہا تھا۔

”جی ہاں تم دوپہر سے ایسے ہی بے ہوش پڑے تھے، ہم نے سوچا جب تک تم ہوش میں نہیں آتے تمہارے پاس ہی رک جائیں۔“ یہ اس نے ڈھانٹے والے اونگھتے ہوئے شخص کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔



”یہ بھی تمہاری طرح بیمار ہیں، میں نے ان کی بھی خدمت کی ہے تمہاری بھی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔“ وہ ساتھ ساتھ کھانا بھی تیزی سے کھا رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بھوکا ہو کر رے میں زیر و کا بلب اور سائڈ ٹیبل لیپ جل رہے تھے میں اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا خود میں نے ابھی تک ایک نوالہ بھی نہ لپا تھا کھانا شاید بہت لذیذ تھا خوشبو بھی کافی اشتہا انگیز تھی۔

میں کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھا رہا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میرا محسن خوب پیٹ بھر کر کھالے تو پھر میں کھاؤں کہیں کھانا کم نہ پڑ جائے۔ میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا اور وہ کھاتا رہا۔

باتوں باتوں میں اس نے پھر وال کلاک کی طرف دیکھا تو پونے بارہ بج چکے تھے وہ مسلسل کھا رہا تھا مگر کھانا پھر بھی کم نہ ہو رہا تھا میری حیرانگی کی حد ہو گئی ٹرے قدرے اندھیرے میں تھی میں نے کھانے پر غور کیا تو وہ فقط ایک ٹرے میں سمایا ہوا تھا شاید چھوٹے نوالے لے کر زیادہ چبا چبا کر کھا رہا تھا۔

”میں تو کھا چکا اب آپ بھی کھا لو۔“ اس نے ٹرے میری طرف کھسکا دی۔ اور اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کیا، شور بہ گوشت بہت لذیذ تھے میں جب آدھے سے زیادہ کھا چکا تو میرے دل نے بوٹی کھانے کی شدید خواہش کی تو میں نے پلیٹ سے ٹول کر اور بغیر دیکھے ایک بوٹی اٹھالی منہ کے قریب لے جانے سے پہلے میں نے اس کو حسب عادت ایک نظر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا، وہ تو انسانی پنچے کی نفاست سے کٹی ہوئی اور آپس میں جڑی ہوئی دو انگلیاں تھیں، میں نے ٹرے وہیں بستر پر پھینکی اور اچھل کر بیڈ سے اٹھا، ٹرے پھینکنے پر وہ شخص چونکا اور بولا۔

”کیا ہوا بھائی؟“

”یہ..... یہ!“ میں نے کپکپاتے ہوئے الٹے ہوئے کھانے کی ٹرے کی طرف اشارہ کیا اتنے میں وہ

شخص بھی کھڑا ہو گیا۔

”کیا کھانا اچھا نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”یہ تو انسانی.....“ میں نے بات ادھوری

چھوڑ دی پے در پے پر اسرار واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

”انسانی گوشت ہے۔“ اس نے میری ادھوری

بات پوری کر دی تو گویا مجھ پر بجلی گرا دی اس کا مطلب کہ وہ جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا کھلا رہا ہے، میں نے غصے سے پھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو ایک بار پھر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں بھاگنے کی سوچنے لگا وہ ابھی تک اپنی جگہ جما کھڑا تھا کہ وال کلاک نے بارہ بجادیئے اس کے منہ سے ایک بھیانک قہقہہ برآمد ہوا تو ہر طرف ایک ناگوار سی بدبو پھیل گئی۔

بارہ بجتے ہی وہ دوسرا بھی جاگ اٹھا پہلے تو وہ مشینی انداز میں سیدھا بیٹھ گیا پھر بیڈ سے نیچے پاؤں لٹکائے پھر کھڑا ہو گیا۔

میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی وہ گھوم کر ٹک ٹاک چلتا ہوا آ رہا تھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ضبط ہو چکی تھی میں نے آستہ آستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

”کک کون ہو تم لوگ؟“ بالآخر میرے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”تمہاری موت۔“ اب کہ دوسرا آدمی بولا۔

”مم..... میں نے کیا کیا ہے، کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ کسی غول بیابانی کی طرح بڑھے آ رہے تھے ان کے غلیظ جسموں سے اٹھتی بدبو کی بدولت میرا برا حشر ہو گیا جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اگر اگلے چند سیکنڈ میں کچھ نہ کرتا تو موت یقینی تھی۔

باہر بادل آسمان کو گھیر چکے تھے زور زور سے گرجتے بادل کانوں کے پردے پھاڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے میں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہل سکتا تھا ٹانگیں جیسے مفلوج ہو گئی تھیں بجلی ایک کڑا کے سے چمک



کر لپکی، اتنے میں وہ دونوں بھی مجھ سے لپٹ گئے، میرے حلق سے ایک چیخ نکلی میں یہ سوچ کر آنکھیں بند کر چکا تھا کہ میرا آخری وقت آ گیا۔

مگر یہ کیا میری حیرت کی انتہا نہ رہی میرے بدن کو چھوتے ہی وہ منظر سے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے میں کپکپانے لگا کہ اچانک لائٹ بھی چلی گئی اندھیرے میں مجھے اپنے ہی فلیٹ سے خوف آ رہا تھا۔

یہ افتاد کیا کم تھی کہ ایک اور مصیبت آن وارد ہوئی فلیٹ کے دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی میرا دل دھک سے رہ گیا کہیں وہ پھر تو نہیں آ گئے۔

”یا خدا مجھے ان بلاؤں سے نجات دے یہ اگر میرے گناہوں کی سزا ہے تو میرے گناہ معاف فرما دے تو، تو رحیم و کریم ہے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دستک مسلسل ہوئے جا رہی تھی خدا کو یاد کرنے سے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی مرنا کیا نہ کرتا کے مصداق دل بڑا کر کے چیزیں ٹٹولتا ہوا دروازے تک آیا، کی ہول سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا تو حیرت کا جھٹکا لگا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ کھولتے ہی جو شخصیت سامنے آئی وہ رحمان بابا کی تھی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ رحمان بابا اور میرے فلیٹ پر وہ بھی اس وقت میں نے ان کو اندر آنے کا راستہ دیا، وہ اندر آئے تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔

رحمان بابا کے ہاتھ میں کالے موتیوں کی ایک تسبیح تھی اس وقت وہ مسافر خانے کی دیوار کے ساتھ بیٹھنے والے رحمان بابا نہ لگ رہے تھے ان کا حلیہ ہی چینج تھا۔ جیسے ہی رحمان بابا نے گھر کے اندر قدم رکھا لائٹ آگئی رحمان بابا کو اس حلیہ میں دیکھ کر میں حیران ہوئے جا رہا تھا صاف ستھرا اجلا لباس خوشبوؤں میں بسا ہوا بال نفاست سے جسے ہوئے چہرہ اتنا نورانی اور چمکدار کہ نظر نہ ٹھہر رہی تھی۔

وہ فلیٹ میں چاروں طرف کچھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، میں چپ چاپ دیکھے جا رہا تھا جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو بولے۔

”ہمیں حکم ملا ہے کہ تمہیں اس مصیبت سے نکالا جائے، تو ہم چلے آئے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئے میری اتنی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ ان کے برابر بیٹھ جا تا رعب و جلال کے باعث مجھ پر ہیبت طاری تھی زبان تو جیسے گنگ ہو چکی تھی ایک دل ہی تھا جو عقیدت سے لبریز ہوئے جا رہا تھا۔ ان سے نظر ملانے کی بھی ہمت نہ ہو رہی تھی، دل سوز و گداز سے اتنا بھر گیا کہ صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا، میں ایک دم سے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور وہ میرا سر تھپکنے لگے۔

☆.....☆.....☆

میرا قلمی نام ابن آدم اور میرا پیدائش نام اکبر ولد آدم حسین ہے۔“

جب میں نے اپنے چھوٹے سے گھر میں ہوش سنبھالا تو صرف اپنے باپ کو پایا، ماں جیسی نعمت سے تو محروم تھا ہی، بہن بھائیوں سے بھی اوپر والے نے نہیں نوازا تھا اب اس میں اس کی کیا حکمت ہے یہ وہی بہتر جانتا ہے اکیلا پن تنہائی کوئی بری بات نہیں، انسان دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے اکیلا ہی جاتا ہے سو کبھی اس بات کا غم نہ کرنا کہ تم اکیلے ہو، والد نے بچپن میں ہی یہ بات اچھی طرح میرے ذہن میں بیٹھا دی تھی تاکہ مجھے کبھی قلق نہ ہو کہ فیملی کے نام پر صرف باپ ہی ہے میرے پاس، خاندانی پس منظر بھی اتنا وسیع نہ تھا، والد صاحب بھی صرف ایک بھائی بہن ہی تھے اس لئے افراد کا قال تھا میرے خاندان میں۔

یوں تو میں ایک سعادت مند اور فرماں بردار بچہ تھا لیکن میرے اندر اس سے ہٹ کر میرے اندر ایک لالہ بابا اور چلبلا سا کھلنڈا سا لڑکا بھی چھپا تھا اس الہڑ سے لڑکے کو میں خاص طور پر اپنے والد اور اپنے نیچر سے چھپاتا تھا میں اپنی فرمانبرداری کی بنی ہوئی ساکھ قائم رکھنا چاہتا تھا اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی



بات سے میری ساکھ کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر کے میں پھولا نہ مار ہا تھا امتحان کے بعد میں بالکل فارغ تھا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

والد صاحب ایک مقامی اخبار سے منسلک تھے میں نے وقت گزاری کے لئے ان کے آرٹیکلز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیئے جلد ہی میں اکتا گیا۔ وقت گزاری کے لئے کچھ بھی نہ سوچ رہا تھا چھوٹے سے قصبے میں سہولتوں کا بھی فقدان تھا شام کے ٹائم دوستوں کے ساتھ قصبے کے چھوٹے سے گراؤنڈ میں میچ اور موج مستی ہو جاتی مگر شام کے فوراً بعد ہی مجھے گھر لوٹنا پڑتا بوریت زیادہ تھی، والد صاحب تو ہر وقت اخباروں اور کاغذوں میں سر دیئے رہتے یا ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتے، رات آٹھ بجے والا پی ٹی وی سیریل دیکھ کر خود کو تھپکیاں دے کر سلائے کی کوشش کرتا اس زمانے میں کیبل ٹیلی ویژن اور ڈش ہر گھر افورڈ نہیں کر سکتا تھا سوشل ڈاندر ہی کسی گھر کی چھت پر ڈش بچی نظر آتی۔

اس فارغ البالی میں زندگی نے ایسی کروٹ بدلی کہ انقلاب برپا کر دیا میٹرک کے امتحان کے بعد والد صاحب نے مجھے موٹر سائیکل لے دی تاکہ کالج آنے جانے میں دقت نہ ہو بس پھر کیا تھا میں اور میرا جگری یا راسلم کالج کے بعد سارا دن آوارہ گردی کرتے چھٹی والے دن تو دن چڑھتے ہی جیسے ہی والد صاحب آفس کے لئے نکلتے میں موٹر سائیکل لے کر اسلم کی طرف چلا جاتا وہ پہلے ہی میرا منتظر ہوتا جیسے ہی دستک دی اسلم جھٹ سے باہر، ہم سارا دن مٹر گشت کرتے اکثر قصبے سے باہر شہر کی طرف نکل جاتے، نئی مصروفیت کافی دلچسپ تھی۔

ایک دن گھومتے گھومتے بازار کی طرف نکل آئے، یہ شہر کا بڑا بازار کہلاتا تھا بازار کیا تھا ایک میلے کا سماں تھا، میں نے بچپن میں والد صاحب کے ساتھ دو ایک مرتبہ بڑا بازار دیکھا تھا اس کے بعد کبھی اتفاق نہ

ہو پایا کیونکہ ضرورت کی ہر چیز والد صاحب گھر میں ہی وافر مقدار میں مہیا کر دیتے تھے۔

ہر طرف رنگین آئین لہرا رہے تھے مختلف اسٹالز پر مختلف دکانوں پر جہاں جہاں پھول جیسے چہرے تیلیوں کی مانند اڑتے پھرتے ہوں وہاں بھنورے تو ضرور ہوتے ہیں سونچلوں کی بھی بہتات تھی پھرتے پھرتے ہم ایک اسٹال کے پاس سے گزرنے لگے تو میں چلایا۔ ”روکو، روکو ذرا۔“

موٹر سائیکل چونکہ اسلم چلا رہا تھا سو ایک جھٹکے سے رکا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں فوراً سے پیشتر اتر کر اسٹال کی طرف بڑھا وہ وہیں موٹر سائیکل کے پاس کھڑا رہا کیونکہ وہ کتابوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔

اسٹال، اسٹال نہیں رسالوں، کتابوں اور میگزینز کی ایک منی لائبریری لگ رہا تھا۔ میں کتابوں اور رسالوں پر نظر دوڑانے لگا، کتاب اٹھاتا کینلاگ، فہرست، چیک کرتا پھر رکھ دیتا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اسکول کی لائبریری کی تقریباً ہر کتاب میں پڑھ چکا تھا لیکن وہ موضوع کے لحاظ سے ذرا مختلف تھیں جو کتابیں اور رسالے میں یہاں دیکھ رہا تھا انہیں دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ایسے ایسے موضوعات پر مشتمل تھیں کہ ان میں ہر موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے زندگی کے لئے لازم و ملزوم نظر آ رہا تھا۔ انتخاب کرنا مشکل ہو گیا میں نے چند کتابیں منتخب کیں مگر ان کا بل بجٹ میں نہیں مار ہا تھا آخر مندے دل کے ساتھ میں نے تین ڈائجسٹ خرید لئے اور دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ میں یہ کتابیں ضرور خریدوں گا ان رسالوں کو خرید کر میں بہت مسرور تھا کہ جیسے میرے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو، اب تو شام میں، میں اور میری کتابیں اور رسالے ہوتے میں اپنا جیب خرچ جمع کرتا رہتا اور اس سے ہر ماہ دو چار ڈائجسٹ اور ایک کتاب ضرور خریدتا۔

والد صاحب پہلی دفعہ میرے ہاتھ میں رسالے دیکھ کر ٹھٹھکے اور کہنے لگے۔ ”اکبر بیٹا کیا آپ کو یقین



لیا تھا کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور دو چار کھیاں تیر رہی تھیں اس لئے اس نے دو کافی کا آرڈر دے دیا اور بولی۔  
 ”کیا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟“  
 ”نہیں تو۔“ میں نے پہلی والی پوزیشن ہنوز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا آپ کچھ دیر کے لئے میری طرف متوجہ ہوں گے۔“ بہت ہی شائستہ لہجے میں درخواست کی گئی تھی۔ مجھے ڈائجسٹ بند کرنا ہی پڑا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے رسالہ نیبل پر ایک طرف رکھ دیا کافی آچکی تھی تو کافی کا مک اٹھالیا۔ میرے سامنے بہت سادہ سی اور معصوم صورت سی لڑکی بیٹھی تھی فیشن سے بالکل نا بلند جبکہ اس کے مقابلے میں کالج کی لڑکیاں فیشن کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت پانے کے لئے انتہائی مضحکہ خیز حد تک چلی جاتیں تھیں۔ اس کی سادگی نے مجھے پہلی نظر میں ہی متاثر کیا اور اس کے لئے احترام کا ایک جذبہ دل میں بیدار ہو گیا۔

”آپ کا نام جان سکتی ہوں؟“ اس نے رسالہ اٹھالیا۔

”اکبر۔“ میں نے مختصراً کہا۔  
 ”میں صبا ہوں۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔  
 ”جی فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”آپ پلیز براست مانیے گا میں جو کہنے جا رہی ہوں ہو سکتا ہے آپ کو عجیب لگے۔“ وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔  
 ”میں نے آپ کو جب بھی دیکھا ہمیشہ آپ کو پڑھتے ہوئے ہی پایا۔“

یہ انکشاف میرے لئے نیا تھا کہ وہ مجھے دیکھتی بھی ہے لیکن اس میں چونکنے والی کیا بات ہے کالج ہے ہر کوئی ہر کسی کو دیکھتا ہے میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوالوں کو بمشکل دبایا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

”پڑھنا تو بہت آسان ہے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے

ہے کہ آپ ان کو پڑھ کر سیسم کا غلط اثر نہ لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ابا جان کہانیاں تو صرف وقت گزاری یا دلچسپی کی وجہ سے پڑھتا ہوں میں ان کو خود پرطاری یا حاوی تھوڑی کروں گا۔“

میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ کہانیاں ہی میرا اوڑھنا بچھونا بن جائیں گی میرے جواب سے والد صاحب مطمئن ہوئے یا نہیں انہوں نے دوبارہ اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔

زندگی ایک روٹین سے چل رہی تھی گھر کالج، کتابیں، موٹر سائیکل اسلم اور میں ہر ماہ میرے بک ریک پر ایک سے ایک نئی کتاب نظر آتی۔ نصابی کتابوں سے جو بھی فارغ نام ملتا میں ادب کے مطالعے میں گزار دیتا زندگی کی گاڑی ایک ہی طرز پر سپیڈھی چلی جا رہی تھی کم بخت ہچکولے تک نہ لے رہی تھی کبھی کبھی میں اداس ہو جاتا کہ کتنی بے رنگ اور پھلکی سی زندگی ہے بہن بھائی ہی مل جاتے کم از کم کسی سے روٹھنا منانا کسی کو تنگ کرنا تو ہوتا ہو کہ زندگی میں رنگ بھر دیتا مگر بے سود قسمت کو منظور ہی نہ تھا کہ میری زندگی میں رنگ بھر جاتے۔

مگر اس دن میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا، میں جو چاہتا تھا کہ زندگی کی گاڑی ہچکولے ہی لے، بل چل تو کیا اس دن تو بہت بڑا طوفان آ گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ میں کالج کے کیفے ٹیریا میں سکون سے بیٹھا اپنا موسٹ فیوریٹ بارر ڈائجسٹ ڈر پڑھ رہا تھا پڑھنے میں ایسا محو تھا کہ آس پاس کا بھی ہوش نہ رہا کافی تک ٹھنڈی ہو گئی مگر مجھے ہوش کہاں تھا۔ بھی وہ میرے پاس آئی۔

”ایکسیکوزمی کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“  
 ”جی۔۔۔۔۔“ میں نے رسالہ ہٹائے بغیر دیکھے بغیر کہ محترمہ ہیں کون جی کہہ دیا۔ اب تو ایجوکیشن میں جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہوں وہاں ایک نیبل پر بیٹھنے میں کیا قباحیت ہے۔ وہ بیٹھ گئی میں بدستور اپنی کہانی میں مگن رہا۔ اس نے شاید میرا کافی کا مک دیکھ



کریں۔“

اس نے جیسے تیسے کر کے مدعا بیان کیا اور خاموش ہو رہی، میں جو وضاحت چاہتا تھا اس کی وضاحت سن کر میرے طوطے اڑ گئے اس کو مجھ میں رائٹر نظر آتا تھا جبکہ میں ایک عام ساریڈر تھا، میں اپنی جگہ پر چورسا بنا بیٹھا رہا، یہ میرے لئے ناگہانی تھا کہتا بھی تو کیا کہتا، اس کے لہجے کے یقین میں بہت گہرا مان جھلک رہا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ ٹلی اس نے ریٹ وائچ پر ٹائم دیکھا بیگ سے کچھ پیسے نکال کر کافی کی پیالی کے نیچے رکھ دیئے اور اپنا بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔ ”میری بات پر غور کیجیے گا۔“ وہ تو چلی گئی لیکن مجھے ایک نئے طوفان کی زد میں چھوڑ گئی۔

اس کی یہ بات میرے ذہن کے کسی کونے میں کسی کیڑے کی طرح چپک گئی اور کلبلاتی رہتی۔ پڑھنا تو بہت آسان ہے ہر کوئی پڑھتا ہے۔ ”آپ نے کبھی کچھ لکھا بھی ہے۔۔۔۔۔ مجھے آپ میں ایک ادیب نظر آتا ہے۔“ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کہیں بھی کبھی بھی یہ بات اور اس کی آواز ذہن میں گونجتی رہتی نا چاہتے ہوئے بھی میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔

کالج میں ہر وقت مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے اس کی سرمئی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی ہیں میں ادھر ادھر لاشعوری طور پر دیکھتا اسے نہ پا کر سر جھکا لیتا وہ تو ایسے غائب ہو گئی جیسے گدھے کے۔۔۔۔۔

ہر وقت بے کل رہنے لگا ہر وقت یہ سوچتا رہتا کیا لکھوں، کیا میں لکھ سکتا ہوں۔ مجھے لکھنا چاہئے۔۔۔۔۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے اپنی ہی سوچوں کی نفی اثبات کرتا رہتا۔

میرا اس پریشان خیالی سے میرے شب و روز متاثر ہو رہے تھے اسلم میری کیفیت کو بھانپ گیا ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

کیا آپ نے کبھی کچھ لکھا بھی ہے؟“ اس کی سوالیہ آنکھیں مجھ پر نکلی تھیں رسالے کے کھلے صفحات اس کے ہاتھوں میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مس صبا۔“  
”مطلب یہ کہ آپ دوسروں کی کہانیاں اتنے وثوق سے پڑھتے ہیں کبھی کوئی کہانی خود بھی لکھی ہے۔“ میں نے سرانکار میں ہلایا۔

”کیا کبھی سوچا ہے کہ کہانی آپ کی ہو اور لوگ ایسے ہی انہماک و اشتیاق سے پڑھیں۔“ اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رنگ رہی تھی میں الجھ سا گیا اس کی باتوں میں۔

”دیکھئے مس صبا پہلی بات تو یہ کہ میں قاری ہوں لکھاری نہیں، دوسری بات یہ کہ میں آپ کو نہیں جانتا، آپ مجھے نہیں جانتیں پھر یہ باتیں۔“

”کیا مطلب و مقصد، کچھ سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے براہ کرم وضاحت کیجیے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی اس کے لب کچھ کہنے کو یوں وا ہوئے جیسے گلاب کی کلی کھلنے کے لئے آہستگی سے اور نرمی سے کھلتی ہے۔

”میں روز آپ کو دیکھتی ہوں آپ کے ایک ہاتھ میں کالج کی بکس اور دوسرے ہاتھ میں کوئی ناول یا ڈائجسٹ ہوتا ہے آپ کی یہی روٹین ایک عادت سی ہو گئی ہے آپ کے ہاتھ میں کتابیں دیکھنے کی جس دن آپ کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو، اس دن ادھر اپن سا محسوس ہوتا ہے لیکن ایک موہوم سی امید اس ادھورے پن کو ختم کر دیتی ہے کہ شاید آج پڑھنے کے بجائے کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔“

جب سے میں نے یہ کالج جوائن کیا ہے آپ کو پڑھتے ہوئے ہی پایا ہے لکھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا آپ کو یہ سب کہتے ہوئے کچھ جھجک سی بھی محسوس ہو رہی ہے میں بہت دن سے آپ سے یہ بات کہنا چاہتی تھی پر یہ سوچ کر رہ جاتی کہ آپ کیا سوچیں گے آپ پلیز! مانڈ مت کیجیے گا، مجھے آپ میں ایک ادیب نظر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اس کو عیاں



”یار کیا مسئلہ ہے تو بڑا کھویا کھویا رہتا ہے؟“  
اس کا یہ پوچھنا تھا کہ میری سوچوں اور الجھنوں کے سیلاب کو بہنے کا بہانہ سا مل گیا میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات اس کو بتادی۔ وہ میری باتیں سن کر مسکراتا رہا جب میں اپنی تمام پریشانی بتا چکا تو وہ بولا۔ ”بس اتنی سی بات پر تو اتنا پریشان ہے یہ کون سا مشکل کام ہے تمہارے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے ٹیلنٹ ہے ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو ذہین بھی ہو تو لکھ ڈالو کوئی کہانی۔“ اس نے اپنی طرف سے تو چٹکیوں میں میرے مسئلے کا حل بتا دیا۔

”ہاں لکھ ڈالو کہانی۔“ میں نے اس کی نقل اتاری میں اس کی بات سے چڑ گیا۔

”الفاظ ہیں، ٹیلنٹ ہے سب کچھ ہے پر کہانی کہاں ہے؟“ میں نے دانت پس کر کہا۔ ”یار تم ہر وقت کہانیوں میں رہتے ہو پھر بھی تمہارے پاس کہانی نہیں، کہیں سے بھی کوئی کہانی پکڑو اور اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں لکھ ڈالو۔“

”یہ تو میں نے بھی سوچا تھا مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی کی اسٹوری چوری یا کاپی نہیں کرنا چاہتا میرا ضمیر نہیں مانتا میں اور بجنل لکھنا چاہتا ہوں کہانی کو کہانی سمجھ کر نہیں ایک جیتی جاگتی زندگی جیسی سانس لیتی ہوئی لکھنا چاہتا ہوں جس میں خالی الفاظ نہیں دل دھڑکتے ہوں ریشمیں آنچل لہراتے ہوں ساتھ ہی ساتھ گلابی گالوں کی لالیاں بھی مہکتی ہوں.....“ میں کہتے کہتے رک گیا اسے ایک نظر دیکھ کر بولا۔

”رہن دے یار تم سے مشورہ کرنا بے کار ہے۔“ اس نے برا سامنہ بنایا اسے شاید اپنی ہٹک محسوس ہوئی جسے وہ جلد ہی پی گیا۔ ”کتنے سال ہوئے تجھے کالج جاتے ہوئے۔“ اب وہ سنجیدہ تھا۔

”تین سال۔“ میں نے کہا۔

”اور صبا بقول تمہارے دوسرے سال میں ہے اور تم تیسرے سال میں ہو تم بدھو ہو گدھے ہو، تمہارے گرد زندہ جاوید کہانیاں موجود ہیں تم نے بس ان پر غور

کرنا ہے اور ان کو قلمبند کرنا ہے ارے کالج لائف تو بذات خود ایک سپر ہٹ اسٹوری ہے اور اگر پھر بھی تسلی نہ ہو تو عشق فرما کر دیکھ لو جب اپنی ذات پر جیتے گی تو لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔“ وہ بات ختم کر کے داد طلب نظروں سے مجھے تکتے لگا۔ اب اس کی بات مجھے کچھ معقول لگی تو میں مسکرا دیا۔

اسلم کی بات مجھ پر گہری چھاپ چھوڑ گئی اب میں نے سنجیدگی اور قنوطیت کا لبادہ اتار پھینکا اور دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگا صنف نازک میں میری دلچسپیاں بڑھ گئیں سینے میں رکھا دل نام کا ٹکڑا کسی اور ہی لے میں دھڑکنے لگا کسی اور ہی رنگ میں ڈھل گیا۔ اب میں نے کھل کر کھیلنا شروع کر دیا میں روز کسی نئے معاشقے میں ملوث ہوتا ہر روز کوئی نہ کوئی نئی لڑکی میرے پہلو سے چپکی نظر آتی اب کالج کی لڑکیوں میں میری امیج بہت بدل گئی لڑکیوں کو موہ لینا اب میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

میں بہت بدل گیا تھا بقول اسلم کے مجھے زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ جب میں نے اپنی پہلی اسٹوری صبا کے ہاتھ پر رکھی تو اس کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کی ملی جلی لہریں نظر آئیں۔ میری گردن جیسے اکڑنے لگی دن بدن میری مانگ بڑھ رہی تھی میں کامیابی کی طرف رواں تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسٹوری رائٹنگ کو پروفیشن کے طور پر اپناؤں گا اور اس سلسلے میں صبا کے قیمتی مشورے میرے بہت کام آ رہے تھے اس کا مطالعہ وسیع اور نظریہ ٹھوس تھا یہ بات وہ بھی نہ سمجھ پائی کہ میں رومانی کہانیاں ہی کیوں لکھتا ہوں۔

میں تیزی سے کامیابی کی سیرھیاں چڑھتا گیا۔ صبا کی دعائیں رنگ لاتی گئیں اور میں کیریئر کے عروج پر پہنچ گیا۔

یہ بھول کر کہ ہر عروج کو زوال لازم ہے۔

تب سے اب تک میں ایک سوا ایک افیئر چلا چکا تھا کئی لڑکیوں سے تو میں شادی کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ صبا میری سب سے اچھی دوست تھی پھر بھی میں اس سے



اپنی شخصیت کا ہر پہلو چھپاتا تھا۔

بے آواز لالٹھی جب پڑتی ہے تو کوئی جائے اماں بھی نہیں ملتی میرا یہ کھیل زیادہ دیر چل نہ سکا شاید میرے پاپ کا گھڑا بھر چکا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے ہر طرف گرم لو چل رہی تھی چرند پرند انسان سبھی گھبرائے نظر آتے میرا زیادہ وقت شہر میں ہی گزرتا، میں رات گئے گھر آتا والد صاحب جاگ رہے ہوتے تو ان کو سلا کر میں رائٹنگ ٹیبل سنبھال لیتا اور اپنے تجربات کو کہانی کا روپ دے کر الفاظ میں ڈھالنے لگتا۔

☆.....☆.....☆

حرا کے ساتھ میرا معاشرۂ نیا نیا اشارٹ ہوا تھا جو کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اکثر رات کو مجھے اپنے گھر بلا لیتی اس کا کمرہ گھر کی نچلی منزل پر تھا جس میں ایک بہت چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ تھا جس سے اس کے کمرے میں آنا جانا بہت آسان تھا کیونکہ دروازہ گلی میں پیچھے کی طرف تھا۔

میں ہر قسم کی فکر سے آزاد خوشی خوشی اس کے بلاوے پر چلا جاتا جوانی کے دن تھے جوانی تو ویسے بھی دیوانی ہوتی ہے میری بے حسی و خود غرضی عروج پر تھی، برائی مجھے برائی نہ لگتی اور اچھائی کو دیکھ کر میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتا۔

ریشمیں زلفوں کے سائے مرمریں بائیں سرمی آنکھیں اور نیشے ہونٹ از بر تھے باقی سب میں بھول چکا تھا میں اپنی حدود بھول چکا تھا دن رات بس بے حیائی اور مستی کی نظر ہو رہے تھے۔

حرا کے گھر والے دو دن کے لئے شادی پر جا رہے تھے جہاں وہ رات کو رکتے مجھے یہ خبر حرا نے ایک ہفتہ پہلے ہی دے دی، سو میں بہت اکیسائیٹڈ تھا اور دن گن گن کر گزار رہا تھا خدا خدا کر کے وہ دن بھی آن پہنچا۔

میں نے والد صاحب کو بتایا کہ ”میں شہر میں ایک عزیز دوست کی شادی میں جا رہا ہوں جانا ضروری

میری کامیابی کے پیچھے بہت حد تک صبا کا ہاتھ تھا میں نہیں چاہتا تھا اس کو یہ پتہ چلے کہ میں ایک بدکردار انسان بن چکا ہوں ایک اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے ایک معمولی سا قاری اکبر ایک معروف رائٹر ابن آدم کے نام سے اتنا معروف ہو گیا کہ مجھے خود بھی کامیابی اور تعریف و توصیف کا نشہ سا ہو گیا۔

جہاں میں لڑکیوں سے جلد اکتا جاتا وہاں لڑکیاں بھی میری فطرت کے ہر جانی پن سے خوب واقف تھیں پھر بھی نجانے کیا کشش تھی کہ میرے نام کے ساتھ جڑنا لڑکیوں کو اچھا سا لگتا تھا۔ اپنی کہانیوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے میں ہر حد عبور کر گیا انسان سے جانور بن گیا بہت سی لڑکیوں سے میرے روابط جسمانی حد تک چلے گئے تھے۔

میں ساتویں آسمان پر تھا اور اس سے بھی آگے جانا چاہتا تھا مگر قسمت میری دور کھینچنے کا انتظام کر چکی تھی۔ تعلیم میں دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی، والد صاحب شادی کرنا چاہتے تھے مگر مجھے جوت لگ چکی تھی وہ لہو کی چاٹ جیسی تھی اگر میں شادی کر لیتا تو میرا کیریئر تباہ ہو جاتا شادی کر کے مجھے گھر بیٹھنا پڑتا میری کامیابی کا ذریعہ لڑکیاں مجھ سے چھن جاتیں۔

مجھے خود کو چھپانا آتا تھا مگر میں کہاں کہاں خود کو چھپاتا والد سے، صبا سے، عزیزوں دوستوں سے خاص کر لڑکیوں سے جن کے ساتھ تعلق کی شروعات ہی میں اس بات سے کرتا کہ میں ان کا ایسا عاشق ہوں کہ اگر وہ نہ ملیں تو میری موت بھی واقع ہو سکتی ہے پھر ایسے میں شادی کر کے مجھے بیوی بچوں سے بھی خود کو چھپانا پڑتا میں یہ رسک کیسے لے لیتا۔ سو میں ٹال منول سے کام لیتا رہا میری ٹال منول زیادہ نہ چلی، والد نے چپکے چپکے اپنے دوست کی بیٹی کے ساتھ میری نسبت طے کر دی۔

برے کی رسی کو خدا دراز ضرور کرتا ہے مگر اس کی



ہے شاید رات کو گھر نہ آ پاؤں۔“

والد صاحب خالی خالی نظروں سے مجھ دیکھ رہے تھے جیسے جانچنے کی کوشش کر رہے ہوں مجھے ان کی نظروں سے شرمندگی کے بجائے الجھن ہو رہی تھی میں ان کی تپتی نگاہوں میں مچلتے شلوؤں کی تردید کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا کر کے میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا۔ اس لئے چپ چاپ اپنی سنا کر دکھاوے کے طور پر چھوٹے سے بیگ میں دوسو ٹھونس کر نکل کھڑا ہوا۔

جیسے جیسے میرے قدم برائی کی دلدل میں پھنستے جا رہے تھے والپسی کے دروازے مجھ پر بند ہو رہے تھے میرے دل کی سیاہی میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ اب میرا دل مکمل سیاہ ہو گیا ایک کونکے کی مانند ہو گیا تھا۔

حرا بے صبری سے میری منتظر تھی میں نے جاتے ہی اسے بانہوں میں بھر لیا اور لاڈ بھرے انداز میں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا وہ بھی میرے بازوؤں میں مچلنے لگی اس کا مچلنا اچھلنا مجھے پاگل کئے دے رہا تھا، میرا خود پر سے کنٹرول ختم ہوتا جا رہا تھا، بس پھر تو جذبات کا ایسا طوفان آیا کہ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ہم دونوں اس طوفان کی لہروں کے ساتھ ساتھ بہتے بہتے بہت دور نکل گئے۔

میں اس کی زلفوں کی گھٹاؤں میں منہ دیئے پڑا تھا کہ اس کو کچھ یاد آیا وہ فوراً بیڈ سے اتر کر الماری کے پاس گئی ایک پٹ کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر مڑی تو میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”حرا میری جان اس وقت کچھ بھی نہ کرو، کوئی کام نہ کرو، بس میرے پاس بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔“

وہ بیڈ کی دوسری سائیڈ پر ٹک گئی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا میری طرف بڑھایا۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے شا کی نظروں سے اسے دیکھا اور کاغذ کا ٹکڑا تھام لیا بہت بے نیازی سے کھول کر پڑھنے لگا جب تک میں اس کے الفاظ و مفہوم کو سمجھ پایا ز میں میرے پیروں

کے نیچے سے کھسک گئی آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑا وہ حرا کی پریکٹسی رپورٹ تھی جو کہ پازیو تھی اب میں سمجھا کہ وہ پچھلے کافی دنوں سے مجھ پر شادی کے لئے کیوں دباؤ ڈال رہی تھی۔

میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا تھا کرتا بھی تو کیا کرتا کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا میں خالی ذہن کے ساتھ حرا کی رپورٹ کو گھورے جا رہا تھا۔

”آدم اب بھی شادی اپورٹمنٹ نہیں ہے؟“ اس نے حد درجہ سنجیدگی اور معصومیت سے پوچھا۔ ایک دم سے میرے ذہن میں بچپن سے لے کر اب تک کے حالات کسی فلم کی طرح چلنے لگے بچپن، باپ، نیچر، صبا، میری عزت میری ساکھ..... میری ساکھ اس ایک ساکھ نام کے لفظ سے میرے اندر جنون سا بھر گیا میں کسی بھرے ہوئے شیر کی طرح بیڈ سے اٹھا، حرا کی رپورٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیا وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھی۔

”میں اپنی عزت و شہرت کو اس طرح خاک میں نہیں ملا سکتا میں تم سے شادی نہیں کر سکتا سنا تم نے۔“ کسی جنونی کی طرح دھاڑا اپنے اندر کے بزدل اور ڈرپوک انسان کا غصہ میں ایک کمزور عورت پر چلا کر نکال رہا تھا جس کو میں نے ہی اپنے پیار کے جال میں پھانسا تھا اس کی دنیا اندھیر کر دی تھی اس سے شادی کا وعدہ کر کے۔

وہ سکتے کی کیفیت میں مجھے دیکھنے لگی جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہو یا پھر سن کر سمجھ نہ پائی ہو۔ مجھے ساری غلطی حرا کی نظر آ رہی تھی اس پر انتہائی غصہ آ رہا تھا، میں گھوم کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آیا اور اس کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا میری منگنی ہو چکی ہے، آج سے میرے اور تمہارے بیچ کا ہر رشتہ ختم ہر تعلق ختم۔“ میں نے اس کے بازوؤں کو اتنی زور سے جھٹک کر دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔ پھر بھی ایک لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا، وہ کچھ



دیر یونہی مجھے دیکھتی رہی پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا وہ کچن میں گھس گئی اور کھڑپڑ کی آوازیں آنے لگیں۔

مجھے لگا کہ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال رہی ہے سو میں لاؤنج میں صوفے پر ٹک گیا سردیوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

اچانک ہی درودیوار حرا کی دلدوز چیخ سے لرز اٹھے، میں بھاگ کر کچن میں گیا کچن کا منظر دیکھ کر میں بت بن گیا، لہو میری رگوں میں منجمد ہو گیا اس نے خود کو بہت اذیت ناک موت دی تھی، چولہا جل رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ حرا کا نازک بدن بھی جل رہا تھا۔

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جلتے ہوئے دیکھتا رہا میں نے سوچا تھا کہ حرا کو شادی سے انکار کر کے چلا جاؤں گا یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کہانی یہ رخ اختیار کرے گی وہ خود کو اتنی بڑی سزا دے گی۔

میرے دل پر جمی بے حسی کی برف پگھلنے لگی کب آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں کچھ پتہ نہ چلا ہوش تب آیا جب انسانی گوشت جلنے کی سرائی ہر طرف پھیل گئی مجھے ابکائی آئی میں منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر کی طرف بھاگا اور گھر کے مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

جانے کب تک ایسے ہی بھاگتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے اپنے دوست کے فلیٹ پر گیا میری یہ حالت دیکھ کر خلیل پریشان ہو گیا میں نے بہانہ بنا دیا کہ ”چند غنڈے میرے پیچھے پڑے ہیں۔“

اگلے دن اخبار کے فرنٹ پیج پر خبر چھپی۔ ”اہل خانہ کی غیر موجودگی میں حرا نامی لڑکی اتفاقاً دوپٹے میں آگ لگنے سے جھلس کر جاں بحق ہو گئی۔“

میری کہانی جان کر رحمان بابا کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں جبکہ میں ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا، بابا نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا۔ ”بیٹا اب بھی ٹائم نہیں گزرا اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو، خدا کے دربار سے کوئی خالی نہیں جاتا۔“

یہ سن کر میں اٹھا وضو کیا اور دو رکعت نوافل ادا

کر کے سجدے میں گر کر روتا رہا اور رب کے حضور معافی کے لئے گریہ کرتا رہا۔ جب پشیمانی کا غبار آنکھوں کے راستے نکل گیا تو میں جائے نماز سے اٹھا اور پھر سے بابا کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”جو عورتیں ماں بننے والی ہوں۔“ اور حرام موت مرجائیں تو بدروح بن جاتی ہیں، حرا نے تو خود کشی کر کے تمہارے لئے اور اپنے لئے بہت بڑی مصیبت مول لے لی۔ سنگھا جادو گر ایک عرصے سے ایسی عورت کی تلاش میں تھا جو کہ ماں بننے والی ہو اور حرام موت مری ہو۔ حرا کی جیسے ہی جان نکلی سنگھا جادو گر نے اس کی روح کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ حرا کے ذریعے اپنے کچھ ناپاک عزائم پورے کرنا چاہتا جو کہ اگر پورے ہو گئے تو ایک کبرام برپا ہو جائے گا نیکی کی قوتیں اس کو روکنے کی کوشش میں ہیں۔

جبکہ حرا نے سنگھا جادو گر سے تمہاری مانگ کی ہے وہ بدروح بن کر سب سے پہلے تمہارا دل اور کلیجہ چبانا چاہتی ہے۔

سنگھا جادو گر کا لے جادو سے حرا کو طاقتور بنانے کے لئے شیطان کے سامنے پوجا پاٹ چلے جا پ کر رہا ہے حرا کو بھیجنے کے بجائے وہ کچھ مردہ مخلوق کو تمہاری طرف بھیج رہا تھا جو کہ اپنے منصوبے میں ناکام رہا تمہارے جسم کو چھوتے ہی ان کے مردہ وجود جلنے لگتے تھے اس لئے وہ تمہیں چھوڑ کر غائب ہو جاتے۔

اب حرا کے ایک طاقتور بدروح بننے میں بہت کم وقت بچا ہے اکبر۔“ رحمان بابا چپ ہو گئے۔

میں سن سا ہور ہا تھا میرے بدن میں چیونٹیاں سی ریگ رہی تھیں۔

”بابا کیا اس کو روکا نہیں جاسکتا؟“ میں نے پوچھا۔

”روکا جاسکتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”وہ کیا بابا؟“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بے تابی سے پوچھا۔



کلام الہی کی مخصوص آیتوں کی پڑھائی کا ایک عمل ہے جو کہ بہت سخت اور خطرناک بھی ہے، یہ صرف وہ انسان کر سکتا ہے جسے تم سے خود سے بھی زیادہ محبت ہو، تمہاری جان بچانے کو وہ اپنی جان داؤ پر لگا دے۔“

بابا کی بات سن کر مجھے سخت مایوسی ہوئی میرے پاس تو ایسا کوئی بھی نہ تھا۔ روپوشی کی زندگی اختیار کرنے کے کچھ عرصے بعد ہی والد صاحب کی ہارٹ اٹیک کی بدولت جان چلی گئی باقی تو میرے پاس کچھ بچا ہی نہ تھا میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

میں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں کے سامنے پھیلا لیں قسمت کی لکیروں سے شکوہ کناں ہوا پھر دونوں ہاتھ آنکھوں سے لگائے ایک چہرہ ایک پاکیزہ سا چہرہ نظروں میں لہرایا تو میں نے فوراً آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لئے۔

”بابا کیا یہ کام میں خود نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ایسا کوئی نہیں ہے جو میرے لئے اپنی جان مشکل میں ڈالے۔“

بابا میری بات سن کر مسکرائے اور بولے۔  
”ایک ہے، تمہاری منگیتر ہے، وہ تمہیں بہت چاہتی ہے وہی یہ کام کرے گی۔“

ایک بار پھر میری آنکھوں میں مایوسی در آئی۔  
”بابا میں اس کو جانتا نہیں میں نے اس کو دیکھا نہیں بس اتنا پتہ ہے کہ وہ ابا جان کے دوست فاروقی صاحب کی بیٹی ہے اور شاید اب اس نے میری طرف سے مایوس ہو کر شادی بھی کر لی ہو۔“

”ابھی بھی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے، ہمیں ابھی ٹکنا چاہئے وقت بہت کم ہے ہمارے پاس۔“ ہم تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف لپکے۔

فاروقی صاحب کا پتہ مجھے اپنے آبائی گھر سے ملا اس کے بعد پوچھتے پوچھتے ہم فاروقی لاج پہنچ گئے، رحمان بابا نے فاروقی صاحب سے ساری بات کی، حرا کی پرنسسی کی بات وہ گول کر گئے۔

فاروقی صاحب نے اپنی طرف سے اجازت

دے دی۔

جب میں اپنی منگیتر سے ملا تو حیران رہ گیا۔ وہ صبا تھی، صبا فاروقی، جس کی وجہ سے آج میں ابن آدم تھا جس کے مان اور یقین نے مجھے اس مقام پر پہنچایا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑنے لگا لیکن اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے میں اپنے مقام سے گر گیا۔ میں نے صبا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کو پوری سرگزشت سنا دی۔ اس نے بہت سکون سے میری بات سنی اور مجھے معاف کر دیا۔ محبت کی عظمت اور مفہوم صحیح معنوں میں آج مجھ پر عیاں ہوا تھا۔

فاروقی صاحب نے صبا کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ہم وہاں رکے نہیں ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ہم واپس فلیٹ پر آ گئے۔

رحمان بابا نے صبا کو سارا عمل سمجھا دیا اور تسلی و تشفی دیتے ہوئے کہا کہ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں قطعی فکر کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی ڈرنے کی بات ہے۔“

پھر انہوں نے ایک جگہ منتخب کی ہم تینوں اس میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تو انہوں نے گول دائرہ کی شکل میں حصار باندھ دیا۔

صبا نے آنکھیں بند کر کے عمل شروع کیا۔ میں ڈرے ہوئے کبوتر کی طرح کبھی آنکھیں بند کرتا کبھی کھولتا کبھی اونگھ جاتا۔ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں ایک عجیب سا احساس مجھے گھیرے میں لے رہا تھا گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی مجھے۔

ایسے میں فلیٹ کے داخلی دروازے سے میں نے اپنے ابا جان کو آتے دیکھا، ان کے پیچھے کوئی اور بھی خراماں خراماں چلا آ رہا تھا، جب ابا جان دائرے سے کچھ ہی دوری پر رہ گئے تو وہیں رک کر بولے۔ ”دیکھو اکبر بیٹا میں اپنے ساتھ کسے لایا ہوں۔“ ان کے پیچھے جو ہستی کھڑی تھی وہ جب سامنے آئی تو میں بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، وہ میری امی جان تھیں۔

امی نے اپنی بانہیں پھیلا لیں اور بولیں۔ ”آؤ بیٹا میرے گلے لگ جاؤ۔“ ممتا کی تڑپ ان کے لہجے



سے چھلک رہی تھی، میں نے امی جان کو صرف تصویروں میں دیکھ رکھا تھا، میں امی جان کو دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ جی میں آیا کہ ان کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ ساری پریشانیاں ان کو سناؤں اور کسی چھوٹے بچے کی طرح مچلتے ہوئے سو جاؤں۔

میں نے اس ارادے سے آگے بڑھنا چاہا تو بابا نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا میں نے ان سے ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگانا شروع کر دیا۔

ادھرامی جان مسلسل مجھے پکار رہی تھیں اس سے پہلے کہ میں جذبات میں آ کر کوئی جارحانہ قدم اٹھاتا، بابا نے ابا جان اور امی کی طرف پھونک ماری تو وہ چیختے ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ پھر ان کے جسموں نے آگ پکڑ لی، جیسے ہی ان کے جسموں نے آگ پکڑی میری چیخ نکل گئی۔

بابا نے مجھے دونوں کندھوں سے تھام لیا ان کے ہونٹ مسلسل بل رہے تھے۔

عما ان ساری باتوں سے بے نیاز کچھ بڑھے جارہی تھی اس کے ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے بدل رہی تھیں۔

میں بہت نڈھال تھارات کا دوسرا پہر چل رہا تھا جیسے ہی وال کلاک نے 12 بجائے ایک زلزلہ سا برپا ہو گیا درود یوار ہلنے لگے ہر چیز اپنی جگہ سے لڑکھنے لگی رحمان بابا اور صبا کی آنکھیں تو بند تھیں جبکہ میں کھلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اتفاقاً ہی میری نظر چھت پر پڑی تو چھت دھڑام سے میرے اوپر گرنے لگی میں ڈر کر رحمان بابا سے لپٹ گیا اور سختی سے آنکھیں میچ لیں جب کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو زلزلے کے کہیں کوئی آثار باقی نہ تھے جیسے کبھی کوئی زلزلہ آیا ہی نہ ہو۔

ابھی یہ مصیبت ٹلی نہ تھی کہ نئی افتاد آن پڑی۔ اطراف میں چیخ و پکار شروع ہو گئی اسی چیخ و پکار میں قہقہوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے فطری بحس کے ہاتھوں مجبور ہو کر غور کیا تو وہ نسوانی قہقہے تھے آواز

کچھ جانی پہچانی سی تھی اس شور و غل میں پتھر برسے شروع ہو گئے خدا جانے وہ پتھر آ کہاں سے رہے تھے جو سب کے سب حصار کے باہر گر رہے تھے۔ گویا ہمیں ڈرانے کی کوشش کی جارہی تھی جس میں وہ کسی حد تک ناکام رہے تھے کیونکہ میرے سوا اس منظر کو کوئی دیکھ نہ رہا تھا۔

بابا اور صبا آنکھیں بند کئے اپنے کام میں مصروف تھے ایسی کوئی بھی چیز ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی۔

جب یہ طوفان شور و غل تھا تو ہر طرف سناٹا چھا گیا لاؤنچ کا منظر بہت خوبصورت ہو گیا کھلی کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر آرہی تھی بہت سکون دہماحول ہو گیا تھا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بابا کا ہاتھ چھوڑ کر سائیڈ پر ہو کر بیٹھ گیا۔

ابھی میں ٹینشن فری ہوا ہی تھا کہ گھنگھروں کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی، میں نے چونک کر بابا اور صبا کی طرف دیکھا، وہ ہنوز آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے جیسے ابدی نیند سو رہے ہوں، ان کے ہونٹ بل رہے تھے جوان کے زندہ ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔

میں نے ان سے نگاہ ہٹالی تو میرے بالکل سامنے حصار کے باہر ایک ہیولا سا کھڑا تھا، جسمانی ساخت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے، آہستہ آہستہ ہیولے نے ظاہر ہونا شروع ہوا۔

وہ حرا تھی جو بہت میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر زبریلی مسکراہٹ تھی۔

”آدم میرے پاس آؤ۔“ اس کی آواز سن کر میں جیسے کسی ٹرائس میں آ گیا وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ ”آدم میرے پاس آؤ۔“ اس کا سراپا ایک بار پھر مجھے دعوت گناہ دے رہا تھا، میں سب کچھ بھول کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور حصار سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ صبا میرے سامنے حائل ہو گئی۔

”رکوا کبر۔“ صبا کی آواز سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا میں جیسے نیند سے جاگ گیا۔ ”اکبر یہ حرا نہیں ایک بدروت ہے جو تمہاری جان لینا چاہتی ہے۔“ میں رک گیا۔ صبا نے مجھے اپنے پیچھے ایسے چھا



لیا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں لے لیتی ہے۔

حرا کا خوبصورت سراپا بدلنا شروع ہو گیا، وہ بہت ہی بد صورت بن گئی جسے ایک نظر دیکھ کر دل کی دھڑکن رک جائے اس نے گول گول دائرے کی طرف پھر کی کی طرح گھومنا اور قبضے لگانا شروع کر دیا اس کے قبضے اتنے خوف ناک اور اذیت ناک تھے کہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں صبا اپنا عمل پورا کر چکی تھی۔

حرا کے غیر انسانی تکلیف دہ قبضوں کا شور رکنے میں نہ آ رہا تھا۔ پھر اچانک وہ رکی، اس نے قبضے لگانا بند کر دیا ایک بار پھر اس کی ہیبت تبدیل ہو گئی اور وہ نازک سی خوبصورت سی حرا کے روپ میں واپس آ گئی۔

”آدم کو مجھے دے دو لڑکی، یہ میرا ہے اس سے میری شادی ہوگی۔“ وہ صبا سے مخاطب تھی۔

صبا رعب سے بولی۔ ”یہ ہرگز ممکن نہیں آدم کبھی تمہارا نہیں تھا، نہ مرنے سے پہلے نہ ہی مرنے کے بعد۔“ صبا کی بات پر حرا غضب ناک ہو گئی اور دھمکیاں دینے لگی، جب اس کی دھمکیوں کا صبا پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے صبا کی منتیں شروع کر دیں اس کی آہ وزاری دل پر چوٹ سی لگا رہی تھی میں حرا کی اس حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھ رہا تھا۔ حرا کی آہ وزاری مسلسل جاری تھی کہ صبا بولی۔ ”ایک شرط پر آدم تمہیں مل سکتا ہے۔“

میں نے حیرت سے صبا کو دیکھا۔ وہ مکمل حرا کی طرف متوجہ تھی۔ ”یہاں آ کر آدم کو لے جاؤ۔“

میں حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ ”تو کیا سچ میں صبا مجھے حرا کے حوالے کر دے گی کیا وہ مجھے موت کے حوالے کر دے گی؟“ بابا کی طرف دیکھا تو ہدستورا اپنے عمل میں مصروف تھے۔

مجھے موت کے خوف نے لرزا کر رکھ دیا۔ حرا نے صبا کی شرط مان لی تھی، وہ ابھی ہماری طرف بڑھی ہی تھی کہ اچانک ایک مکروہ صورت بوڑھا نمودار ہوا۔

”رک جاؤ حرا، مت جاؤ اس لڑکے کی طرف، میں تمہیں اس جیسے ہزاروں مہیا کروں گا۔“ اس بوڑھے کے نمودار ہوتے ہی بابا بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس

بوڑھے سے مخاطب ہوئے۔

”سنگھاب تیرا سارا خون کی کھیل ختم ہو گیا۔“

اس نے بابا کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور حرا کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر حرا ایک ہیجانی و جنونی سی کیفیت میں بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ اور جیسے ہی وہ حصار کے ساتھ ٹکرائی تو اس کا وجود دھماکے سے پاش پاش ہو گیا، اس کا یہ انجام دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے حرا کا خاتمہ ہو گیا۔

سنگھاب نے جب حرا کا انجام دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم ابھی تک حصار میں تھے، صبا نے مجھے سہارا دیا اور صوفے تک لے آئی، بابا نے حرا کے ٹکڑے جمع کر کے ان پر پھونک ماری تو وہ غائب ہو گئے، گھر کی ابتر حالت بھی خود بخود سدھ گئی۔

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے برائی کے ایک بہت بڑے طوفان کا رخ موڑنے میں ہماری مدد کی، حرا کا وجود ختم ہو گیا۔“

”میں اب چلتا ہوں بچو۔“ رحمان بابا ہم دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

”ابن آدم کا اینڈ ہو گیا۔“ میں ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں ابن آدم کا اینڈ کبھی نہیں ہونے دوں گی جب تک میں زندہ ہوں۔“ صبا کے لہجے کا یقین اور مان ابھی تک برقرار تھا۔

پھر میں نے صبا کو شاکی نظروں سے دیکھا تو وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ ”صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے مسٹر آدم۔“ گویا اس نے مجھے دل سے معاف کر دیا تھا۔

اب ہمیں ایک نئی شروعات کرنی تھی، ایک مکمل اور خوشیوں بھری زندگی کی شروعات۔ میں نے صبا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکرانے لگا اور صبا کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔







## بھیا نک انجام

محمد ابو ہریرہ بلوچ - بہاولنگر

نوجوان کو مارنے کے لئے چڑیل نے اپنے تمام حربے آزمائے اور اس کا ایک بھی وار نوجوان پر کارگر ثابت نہ ہوا، کیونکہ نوجوان حصار میں بیٹھا عمل پڑھنے میں مشغول تھا کہ پھر چڑیل کی دلدوز چیخ سنائی دی اور.....

رات کے گھٹاؤپ اور ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراؤنی کہانی

زیادہ ٹھنڈ ہوگی تو وہ گھر سے نکلتے وقت کوئی گرم چادر وغیرہ ضرور لے آتا۔ اب اس کے پاس صرف ایک کوٹ تھا جسے اس نے سردی سے بچنے کے لئے پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اسے سردی سے بچانے کے لئے کافی نہیں تھا۔

اپنے گھر سے تو وہ جلدی نکلا تھا۔ پر راستہ خراب ہونے کی وجہ سے بس بھی خراب ہوگئی تھی۔ جس وقت بس نے اسے اڑے پر اتارا اس وقت رات کے تقریباً دس بج

یہ ستمبر کی سرد راتوں کی بات ہے۔ عبد اللہ ایک سنسان سڑک پر محو سفر تھا۔ وہ اپنے آبائی گاؤں چندن پور اپنے دادا دادی سے ملنے جا رہا تھا۔ آسمان پر چھائے بادل کسی بھی وقت بارش ہونے کا اعلان کرنے والے تھے۔ حالانکہ جس وقت عبد اللہ اپنے گھر سے نکلا تھا اس وقت موسم بالکل صاف تھا۔ سردی کا اتنا احساس اس وقت نہ تھا جتنا کہ اب ہو رہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہاں اتنی



چکے تھے۔ سردی سے اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ گہری دھندرات کی تاریکی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر چونکہ اڈے پر کوئی بس نہ تھی اور نہ ہی وہاں سے کسی اور بس کے ملنے کا امکان تھا اس لئے اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دادا دادی سے ملنے وہ گاؤں پہلی بار جا رہا تھا۔ گاؤں جانے کا پورا راستہ اس کے ابو نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اسے اکیلا جانے سے روکا بھی تھا لیکن اس نے کہا کہ وہ ”دادا، دادی کو سر پر اتر دے گا۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا تا کہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ اچانک آسمان پر بجلی چمکی جس سے وہ گھبرا گیا۔ وہ مضبوط دل کا مالک تھا لیکن خوف ایک قدرتی امر ہے جو کہ بڑوں بڑوں کی ہوا نکال دیتا ہے، بجلی کی چمک کسی بھی وقت بارش کے ہونے کی پیشین گوئی تھی۔ اب بجلی وقفے وقفے سے کڑک رہی تھی۔ وہ کچھ ہی قدم چلا ہوگا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بارش ہلکی ہلکی بوند باندی کی صورت میں تھی۔ اس کے پاس اس سے بچنے کے لئے کوئی چھتری وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ایک نزدیکی درخت کے نیچے پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔ اس نے ایک بڑے گھنے درخت کا انتخاب کیا۔ یہ درخت ارد گرد کھڑے تمام درختوں سے پرانا اور گھنا تھا اس کی شاخیں مضبوط اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔

درختوں سے چھن کر گرتی بارش کی بوندیں جب زمین پر پڑتیں تو ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی۔ اندھیری رات میں یہ آواز بہت پر اسرار لگ رہی تھی۔ وہ بارش کے رکنے کی دعائیں کرنے لگا۔ لیکن بارش تھی کہ تھمنے کے بجائے پہلے سے بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

بارش کے ساتھ ساتھ بجلی کی ہر چمک اور کڑک کچھ لمحوں کے لئے ماحول کو روشن اور خوفناک بنا دیتی تھی۔ اس کے خوف میں متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ بہت خوفزدہ تھا۔ مسلسل ایک گھنٹہ برسنے کے بعد بارش کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا آ کر بالکل ہی ختم ہو گیا۔

عبداللہ تقریباً مکمل بھیگ چکا تھا۔ کیونکہ بارش کے وہ قطرے جو کہ پتوں سے چھن کر آ رہے تھے وہ ان سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سردی میں اب مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے ان سب کو نظر انداز کیا اور درخت کے نیچے سے نکل کر پھر سڑک پر چلنے لگا۔ بارش ہونے کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ کیچڑ ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے بھر گئے تھے۔ بارش تو بند ہو گئی تھی لیکن بجلی کی چمک اب بھی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اس وقت وہ درختوں کے درمیان بنے ایک کچے راستے پر چل رہا تھا ابھی وہ دس منٹ ہی چلا ہوگا کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ بارش اس مرتبہ پہلے سے تیز تھی وہ دوڑ کر ایک درخت کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ یہ پہلے درخت کی نسبت چھوٹا اور کم گھنا تھا۔

موسم کی اس اچانک تبدیلی سے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دفعتاً بجلی پھر چمکی جس میں اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو خود کو ایک اجڑے ہوئے کھیت کے پاس پایا جو کہ غالباً مکئی کا تھا، بارش آدھا گھنٹہ تک اسی طرح برسی اور دل کھول کر برسی۔ بجلی پھر چمکی اس دفعہ اس کی چمک اور کڑک اس قدر زوردار تھی کہ عبداللہ کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ بجلی کی روشنی میں اس نے ایک اور درخت دیکھا جو کہ اس سے تقریباً 100 میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اسے اس درخت کے پاس ایک سایہ نظر آیا جو کہ درخت کے ساتھ پشت لگائے کھڑا تھا۔

رات کے اس پہر ایک انجان جگہ پر سایہ دیکھ کر ڈرنا ایک فطرتی امر ہے اس لئے وہ ڈر گیا اس نے اس سائے کی طرف دیکھا سایہ کسی لڑکی کا لگتا تھا، اس کے ذہن میں عجیب سے خیالات ابھرنے لگے بارش ایک دفعہ پھر بند ہو چکی تھی انسانی ہمدردی کے ناطے وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا تا کہ اس سے پوچھے کہ وہ کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہی ہے؟ لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ خیر اس نے دل کو بچتے کیا اور اس کی طرف چل پڑا۔ آخر وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا وہ ایک لڑکی ہی تھی اس کی پشت اس طرف تھی اور منہ دوسری طرف تھا۔



”کون ہو تم؟“ بلاآخر عبداللہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

عبداللہ کے اس سوال پر وہ مڑی تو اسے دیکھتے ہی وہ سکتے میں آ گیا۔ اتنے میں زوردار بجلی چمکی تو لڑکی کا سراپا نظر آیا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اس کا بھیگا سنگ مرمر سا جسم عبداللہ کے حواس پر چھا گیا۔ وہ عبداللہ کی طرف غور سے دیکھنے لگی..... ”میرا نام صبا ہے۔“ لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ ”پر اتنی رات گئے تم یہاں پر کیا کر رہی ہو؟“ یہ سوال عبداللہ نے اگرچہ نارمل انداز میں کیا تھا لیکن حقیقت میں وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

”میں یہاں نزدیک ہی رہتی ہوں۔ میں شہر گئی تھی اپنے ابو کی دوائی لینے، وہ بہت بیمار ہیں۔ لیکن آتے ہوئے دیر ہو گئی اور پھر بارش کے سبب مجھے یہاں رکنا پڑا۔“

”پر تم کون ہو؟“ لڑکی نے عبداللہ سے سوال کیا۔

”میرا نام عبداللہ ہے۔ میں شہر سے آیا ہوں اپنے دادا دادی سے ملنے۔“ عبداللہ نے تعارف کروایا۔

”کہاں رہتے ہیں وہ؟“ لڑکی نے ایک اور سوال کیا.....

”وہ چندن پور گاؤں میں رہتے ہیں، اور وہ میرا آبائی گاؤں ہے، بس راستے میں خراب ہو گئی تھی اس لئے دیر سے پہنچا اور پھر کوئی سواری نہ ملنے پر پیدل چل پڑا اور پھر بارش کے سبب مجھے بھی یہاں رکنا پڑا۔“ عبداللہ نے مختصر آبتلایا۔ ”کیا تم نے چندن پور گاؤں کا نام سنا ہوا ہے؟“ عبداللہ نے سوال کیا وہ اس سے جان بوجھ کر باتیں پڑھا رہا تھا تا کہ دوپل مزید اس کے ساتھ بتا سکے۔

”ہاں سنا بھی ہوا ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن وہ یہاں سے بہت دور ہے اگر اسی طرح پیدل چلتے رہے تو ڈھائی تین گھنٹوں میں پہنچو گے۔ تم ایک کام کرو آج رات ہمارے گھر قیام کر لو صبح ہوتے ہی میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں گی۔“ عبداللہ اس لڑکی کی ہمت پر حیران تھا۔ سخت سردی اور لڑکی کو سردی کا بالکل احساس نہ تھا اس کے برعکس اس نے خود ایک کوٹ اور مونے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان سب کے باوجود اسے زبردست ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

”اس وقت رات بہت زیادہ ہو چکی ہے اگر وہاں جاؤ گے تو راستے میں تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ راستے میں جنگلی جانور، بھیڑیے بہت ہیں اس لئے تم نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔“ لڑکی نے عبداللہ کو راستے میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ کچھ سوچ کر فیصلہ کرتا لڑکی نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی مانند خنک تھا اس کے چھوتے ہی عبداللہ کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رنگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اس لڑکی سے چھڑانا چاہا لیکن اس کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت تھی۔ وہ اس لڑکی کے روپ پر حیران و پریشان تھا۔ وہ عبداللہ کا ہاتھ پکڑے راستے سے ہٹ کر کھیتوں کے درمیان بنی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگی، عبداللہ کا ہاتھ بدستور اس لڑکی کے ہاتھ میں تھا کبھی کبھار وہ مڑ کر اسے مسکرا کر دیکھتی تو وہ بھی آگے سے رسماً مسکرا دیتا لیکن حقیقت میں وہ اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس اس کو آنے والے خطرات کا الارم دے رہی تھی۔

”تمہارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟“ عبداللہ نے بے تکلفانہ سوال کیا، وہ خود بھی حیران تھا کہ اس نے ایسا سوال کیوں اور کیسے کیا۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے عبداللہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں اور میرے بوڑھے والد، ماں بچپن میں ہی چھوڑ کر چل بسی اس وقت میں سات سال کی تھی ابو نے ہی میری پرورش کی ہے۔“

اب لڑکی نے عبداللہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ چاہتا تو وہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ لڑکا ہو کر لڑکی سے ڈر۔ شرم کی بات ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا یہ سوچ کر وہ مسلسل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ لڑکی اسے ساتھ لئے آدھا گھنٹہ چلتی رہی۔ آخر وہ ایک بوسیدہ گھر کے پاس پہنچ گئے۔ گھر انتہائی خستہ حال اور بوسیدہ تھا۔ گھر درختوں کے درمیان گھر ہوا تھا۔ عبداللہ کو اس جگہ سے ڈر لگنے لگا اور خاص طور پر اس لڑکی سے جو اس وقت اس کے ساتھ تھی۔ اس لڑکی نے کھنڈر نما گھر کا انتہائی بوسیدہ اور بڑا دروازہ دھکیلا تو وہ چہ چہاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ گھر میں مکمل اندھیرا تھا



سے ہوتی ہوئی ایک ہال میں لے آئی یہ ہال باقی تمام کمروں سے جن سے وہ گزر کر آیا تھا وسیع تھا۔ اس بڑے ہال میں صرف ایک چارپائی تھی اس میں ایک چراغ جل رہا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس چراغ سے پھوٹنے والی روشنی سرخ رنگ کی تھی جو کہ اس ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ ”تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔“ صبا نے کہا اور پھر عبد اللہ کا جواب سنے بغیر ہی چلی گئی۔

عبداللہ ایک دفعہ پھر اس وسیع و عریض ہال میں تنہا رہ گیا تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں گرم بھاپ اٹھتا کھانا اور پانی کا ایک جگ تھا۔ جس میں سرخ رنگ کا گاڑھا مشروب تھا۔ عبداللہ کو بھوک تو تھی ہی گرم کھانا دیکھ کر اور بھی تیز ہو گئی، اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ تھوڑے وقت میں کھانا کیسے تیار ہو سکتا ہے۔ عبداللہ نے جیسے ہی پہلا نوالہ لیا اسے قے آ گئی، کیونکہ اس کھانے کا ذائقہ بالکل عجیب تھا۔

”کیا ہوا؟“ صبا نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ عبداللہ نے  
 بہانہ کیا۔

”ٹھیک ہے پانی تو پی لو۔“ صبا نے کہا تو عبداللہ نے جگ سے گلاس بھرا اور غما غٹ پی گیا۔ پانی پیتے ہی عبداللہ کو اپنے سر میں درد محسوس ہوا۔ اور اس کے بعد وہ ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

رات کے نہ جانے کون سے چہر اس کی آنکھ کھلی  
کمرے میں لائین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، عبد اللہ کو اپنے  
اوپر ایک سایہ جھکا محسوس ہوا۔ عبد اللہ نے جیسے ہی اس کو  
بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا  
کیونکہ اس کے اوپر جھکنے والی ایک چڑیل تھی جو کہ اس کا خون  
پی رہی تھی۔ اس چڑیل کا چہرہ انتہائی سیاہ تھا اس کے چہرے  
پر بے شمار جھریاں تھیں اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ،  
اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا  
اور دوڑ لگا دی۔ وہ اس کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف  
بھاگنے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دروازہ اب کھلا ہوا تھا۔  
وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے اپنی رفتار میں بالکل کمی نہ کی

**Dar Digest 198** November 2015



اور اندھا دھند بھاگتا رہا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ اب کہاں بھاگا جا رہا ہے اسے فکر تھی تو صرف اپنی جان بچانے کی، اس دھوکہ دینے والی چڑیل سے۔

آسمان اب بالکل صاف ہو چکا تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے جگہ جگہ کیچڑ بن گیا تھا۔ مسلسل بھاگنے سے وہ بہت تھک گیا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اچانک اس کا پاؤں کسی بڑے پتھر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

اس نے جب آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک اجنبی مقام پر پایا وہ گھبرا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ ”لیٹے رہو بیٹا۔“ اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو اس کی نظر ایک باریش بزرگ پر پڑی جن کی عمر کم از کم اسی سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں سیج تھی اور بدن پر سفید لباس تھے۔

”آپ کون ہیں؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟ اور مجھے یہاں کون لایا؟؟؟“ عبداللہ نے کئی سوال ایک دم بزرگ سے کر ڈالے۔ وہ بزرگ پہلے تو تھوڑا مسکرائے پھر بولے۔ ”تم تھوڑا آرام کر لو پھر میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔ تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔“

”نہیں باباجی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پلیز بتائیں کہ میں کہاں ہوں؟“ عبداللہ نے بزرگ سے التجا کی۔

جب بزرگ نے عبداللہ کو اس قدر پریشان اور حیرت زدہ دیکھا تو بولے۔ ”تم مجھے اس راستے میں بے ہوش پڑے ملے تھے۔ تمہاری حالت اس وقت بہت زیادہ خراب تھی اور تم پسینے میں شرابور تھے۔ لگتا ہے تمہارے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے، مجھے بتاؤ، بیٹا تم بے ہوش کیوں ہوئے تھے؟ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔“ عبداللہ نے بزرگ کو اپنا مخلص سمجھا اور اپنے ساتھ گزر اسارا واقعہ کہہ سنایا۔

بزرگ اس کی کہانی کو توجہ سے سنتے رہے پھر بولے۔ ”اوہو..... تو یہ بات ہے۔“

”پر آپ کون ہیں باباجی؟“ عبداللہ نے دوبارہ

وہی سوال دہرایا۔

”میرا نام عبدالرحمن ہے اسی جنگل میں میرا مسکن ہے۔“ بزرگ نے تعارف کروایا۔

”بہت سی سرکش اور ضدی چڑیلوں اور بدروحوں کو میں نے قید کر رکھا ہے اس جنگل کی ہر چیز پر میری حکومت ہے۔ پر لگتا ہے تم نے جس چڑیل سے پیچھا چھڑایا ہے وہ بہت ہی خطرناک اور طاقتور تھی۔ ایک بات یاد رکھو چڑیل جس انسان کا خون ایک بار چکھ لیتی ہے اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک اس کے سارے جسم کا خون نہ نچوڑ لے۔ اور اس نے تمہارا خون چکھ لیا ہے اور اب وہ تمہیں ضرور ڈھونڈے گی۔“ بزرگ نے عبداللہ کو یہ سب بتلایا تو وہ گھبرا گیا۔ اس کا واسطہ زندگی میں چڑیل سے نہیں ہوا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں صرف کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا جن کہانیوں کو سن کر وہ ہنتا تھا۔ ایک دن اس کی اصلی زندگی میں بھی رونما ہوں گی۔

بزرگ نے عبداللہ کا ذرا چہرہ دیکھا تو اسے دلاسا دیا کہ ”اب تم بے فکر ہو جاؤ یہ میرا علاقہ ہے اور یہاں پر میرا راج چلتا ہے میری مرضی کے بغیر کوئی بھی جن بھوت یہاں نہیں آسکتے۔ یہاں پر بھی جن رہتے ہیں پر وہ سب میرے ماتحت ہیں۔“

مجھے پتا کرنا ہوگا کہ وہ چڑیل جس سے تم ملے تھے وہ کون تھی؟ یہ سب معلوم کرنے کے لئے مجھے آج رات عمل کرنا ہوگا، اب تم فی الحال آرام کرو، میں نے تمہارے ناشتے کے لئے کہہ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر بزرگ جھوپڑی سے باہر نکل گئے۔

عبداللہ ایک بار پھر تنہا رہ گیا اس نے جھوپڑی کا جائزہ لیا۔ اس میں گھاس پھوس کا فرش پانی کا ایک گھڑا اور مٹی کا گلاس موجود تھا۔ لیکن جہاں وہ بزرگ بیٹھے تھے وہاں پر کسی جانور کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی۔ ”کھانا کھا لو باباجی۔“

عبداللہ نے پلٹ کر دیکھا تو خوف سے اس کی سانس رکنے کو تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ آواز دینے والا کوئی انسان نہیں بلکہ ایک



عجیب الخلق وجود تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے ڈرتے ہوئے لہجے میں اس عجیب الخلق سے پوچھا۔ ”میرا نام کالو سنگھ ہے۔ اس نے انسان کی طرح آگے بڑھ کر کہا اور کھانا چار پائی پر رکھ دیا۔ ”میں بابا جی کا بھگت ہوں۔“ عبد اللہ نے کالو سنگھ سے کئی اور سوال کر ڈالے۔

”میں ایک جن ہوں بابو جی، پہلے بابا جی نے مجھے قید کیا تھا پھر مجھے آزاد کر دیا لیکن ان کی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر میں ان کے پاس ہی رہ گیا۔“ وہ غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بھوک تو عبد اللہ کو زوروں کی تھی گرم کھانا دیکھ کر اور بھی تیز ہو گئی۔ اس نے پہلے کھانے کی طرف اور پھر اس عجیب الخلق وجود کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے باہر بھیجنا چاہتا ہے اس لئے چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عبد اللہ کھانے پر نوٹ پڑا۔ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ وہ اسے منٹوں میں چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے جگ سے پانی پیا جس سے اس کی کھوئی توانائی بحال ہو گئی جب وہ کھانا کھا چکا تو وہ اندر آیا اور برتن لے کر چلا گیا۔ کھانا کھا کر عبد اللہ چار پائی پر لیٹ گیا۔ وہ دل ہی دل میں اس جڑیل اور بزرگ کے بارے میں سوچنے لگا کہ پتا نہیں بابا جی اس جڑیل کے بارے میں جان پائیں گے یا نہیں، اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد کب وہ نیند کی گہری وادیوں میں چلا گیا اسے پتا ہی نہ چلا۔

شام کے وقت تک وہ سوتا رہا۔ شام کو بزرگ کے اٹھانے پر اس کی آنکھ کھلی جو کہ اسے کھانا کھانے کا کہہ رہے تھے۔ اس نے اٹھتے ہی سب سے پہلے اس جڑیل کے بارے میں پوچھا کہ اس کا پتا چلا کہ نہیں۔ ”بیٹا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ اس کے لئے عمل آج رات کروں گا۔ تم بے فکر رہو اگر خدا نے چاہا تو اس کی کمزوری معلوم کر کے اسے فنا کر دوں گا۔“ بزرگ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولے۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا پھر ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے لگا۔

شام کو جاتے ہوئے بزرگ نے عبد اللہ کو سختی سے منع کیا کہ ”آج رات تم اس جھونپڑی سے باہر مت نکلنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“ ”ٹھیک ہے بابا جی جیسا آپ کا حکم۔“ عبد اللہ نے مودب لہجے میں کہا۔

”شباباس بیٹا یہ ہوئی نا اچھی بات۔“ بزرگ نے اسے تھکی دی۔ ”اب تم سو جاؤ مجھے عمل کے لئے جانا ہے دعا کرنا کہ میں کامیاب لوٹوں۔“ یہ کہہ کر بزرگ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ عبد اللہ پھر لیٹ گیا۔ اس بار اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس کو بزرگ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اس جڑیل کو ختم کر دیں گے۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔

رات کو اسے محسوس ہوا جیسے اسے کوئی باہر بلارہا ہو۔ پہلے پہل تو اسے یہ وہم لگا پر جب آوازیں مسلسل سنائی دینے لگیں تو اسے یقین ہو گیا کہ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھ کر باہر جانے والا تھا کہ اس آواز کے بارے میں معلوم کر سکے پھر اسے بزرگ کی ہدایت یاد آ گئی کہ ”بیٹا آج کسی صورت بھی باہر مت نکلنا۔“ اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور آ کر دوبارہ لیٹ گیا۔ ساری رات اسے یہی آوازیں پریشان کرتی رہیں پھر اس نے ان سب کو ان سنا کر دیا اور یونہی کروٹ بدلتے رات گزر گئی۔

صبح اس کے لئے کالو سنگھ ناشتہ لے کر آ گیا۔ اس نے اس سے بزرگ کے بارے میں پوچھا کہ وہ آئے کہ نہیں۔ ”..... نہیں ابھی تک نہیں آئے پر آئے تو میں آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیے اور ناشتہ کر لیجئے۔“ عبد اللہ نے اٹھ کر گھڑے سے پانی لیا اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے لگا حسب عادت وہ برتن خالی ہوئے تو کالو سنگھ اسے اٹھا کر چلتا بنا۔ اب اسے بابا جی کا انتظار تھا۔ تاکہ ان سے عملی طور پر جڑیل کے بارے میں معلوم کرے۔ صبح کے 9 یا 10 بجے اس کا یہ طویل انتظار رنگ لایا اور بابا جی واپس آ گئے، آتے ہی عبد اللہ نے ان سے جڑیل کے بارے میں پوچھا۔

”غور سے سنو بیٹا وہ بہت ہی ظالم اور طاقتور جڑیل ہے رات کے عمل میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بہت ہی



خطرناک ہے۔ معصوم اور سیدھے سادھے مسافروں اور راہ گیروں کو بہلا پھسلا کر مندر میں لے جاتی ہے جہاں وہ تمہیں بھی لے گئی تھی۔ پھر وہ وہاں ان کا خون پیتی ہے۔ لوگوں کا خون پی کر ہی وہ نوجوان اور خوب صورت دکھتی ہے ورنہ اس کا اصلی چہرہ وہی ہے جو تم نے خون پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور جس بوڑھے کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ درحقیقت وہ اس کا گرو ہے جو کہ بدروح ہے۔ خون پینا ان دونوں کا مشغلہ ہے۔

بیٹا ان کی طاقتیں انسانی خون پینے اور گوشت کھانے سے بہت بڑھ گئی ہیں۔ بیٹا ان کو مارنا اب بہت ہی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ اگر ان کا کوئی حل نہ کیا گیا تو وہ ایسے ہی معصوم اور بے قصور لوگوں کو مارتے اور ان کا خون پیتے رہیں گے اور اپنی طاقت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔“

”باباجی میں ان کو ضرور ختم کروں گا۔“ بزرگ کی باتیں سن کر عبداللہ جوش اور جذبے سے بولا۔

”شباباش بیٹا! ایک اچھے مسلمان سے یہی امید ہو سکتی ہے۔“ بزرگ عبداللہ کی ہمت کی داد دیتے ہوئے بولے۔

”بیٹا میرے ساتھ تمہیں بھی ایک خطرناک عمل کرنا ہوگا جس سے تم کو بے پناہ طاقتیں حاصل ہو جائیں گی اور انہی طاقتوں سے تم ان دونوں کا مقابلہ کر کے انہیں ختم کر سکتے ہو۔ ویسے تو یہ عمل میں خود بھی کر سکتا تھا۔ لیکن تمہارا ساتھ ہوگا تو تمہیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ بیٹا اس عمل میں تمہیں ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا جائے گا اور تمہارے عمل کو ناکام بنانے کے لئے کئی حربے آزمائے جائیں گے اور حصار سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن یاد رکھو اگر تم عمل چھوڑ کر حصار سے باہر آ گئے تو اپنی جان سے جاؤ گے اور اس کے برعکس اگر تم ثابت قدم رہو گے تو جیت تمہاری ہوگی۔“ بزرگ نے عبداللہ کو عمل کے خطرات سے تفصیلاً آگاہ کیا۔

”میں ہر طرح کی مصیبت اور آفت کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں باباجی۔“ عبداللہ

نے پختہ عزم سے کہا۔ پھر بزرگ نے اسے عمل کے کلمات یاد کرا دیئے، جسے اس نے اچھی طرح یاد کر لیا۔ بزرگ دوبارہ بولے۔ ”بیٹا یہ عمل تین دن کا ہے کیونکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں اور ہاں یہ عمل تمہیں جنگل میں کرنا ہوگا۔“ پھر بزرگ نے اسے ایک خنجر اور تعویذ دیا اور بولے۔ ”ان کو سنبھال کر رکھنا اور تعویذ کو خود سے جدا نہ کرنا کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے کسی بھی بھوت یا جن کا وار بے اثر ہے۔“

عبداللہ نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ رات کے 8 بج رہے تھے۔ جنگل بہت زیادہ گھنا تھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر ایک جگہ کو صاف کیا پھر اپنے ساتھ لائے خنجر سے حصار کھینچا اور اس میں بیٹھ کر عمل کے کلمات کا ورد کرنے لگا۔ کچھ پل تو سب کچھ ٹھیک رہا پھر تیز ہوا چلنی شروع ہو گئی لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ ہوا حصار کے باہر ہی تھی۔ ہوانے خطرناک صورت اختیار کر لی ایسے لگنے لگا جیسے درخت جڑوں سے اکھڑنے والے ہوں۔ کچھ دیر بعد طوفان کا زور ٹوٹ گیا اب ہر طرف پتے ہی پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اسے شیروں کی آواز سنائی دی، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، اسے دو شیر اپنی طرف آتے دکھائی دیئے یہ شیر بہت ہی خونخوار لگ رہے تھے وہ آہستہ آہستہ عبداللہ کی طرف بڑھنے لگے ایک بار تو اس کا دل کیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے پھر بزرگ کی آواز پر اس کی ڈھارس بندھی کہ ”بیٹا یہ سب نظر کا دھوکہ ہے۔“

خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور زور زور سے عمل کے الفاظ دہرانے لگا شیروں کی آواز اسے قریب سے قریب تر آتی محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو شیر بالکل ہی قریب آ گئے پھر ان دونوں نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن وہ حصار سے ٹکراتے ہی غائب ہو گئے۔ اب وہ ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا کے لئے تیار تھا۔

رات کے 2 بجنے والے تھے کہ اسے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اس نے دیکھا کہ ایک پانچ سالہ بچہ جو شکل و صورت کے لحاظ سے بہت ہی معصوم تھا بیٹھا رو



رہا تھا۔ اسے اس بچے پر بہت ترس آیا پھر اس نے ایک خوفناک بلا کو دیکھا جو اس بچے کی طرف بڑھ رہی تھی اس بلا کی طرف دیکھ کر وہ بچہ اور اونچی آواز سے رونے لگا۔ وہ بلا اس قدر خوفناک تھی کہ خدا کی پناہ۔ بلا نے قہر آلود نظروں سے عبداللہ کو دیکھا پھر بولی۔

”اے لڑکے اپنا عمل چھوڑ دے ورنہ اس بچے کو کھا جاؤں گی۔“ اس کی آواز ایسی تھی جیسے بجلی کڑک رہی ہو اس نے اس بلا کی بات پر دھیان نہ دیا اور عمل پڑھنے میں مصروف رہا۔

عبداللہ کو بزرگ نے بتایا تھا کہ عمل میں نظر آنے والے واقعات محض فریب اور نظر کا دھوکہ ہوں گے اور عمل کو ختم کرنے کے لئے ہوں گے۔ اس لئے وہ ثابت قدم رہا۔

اس بلا نے اس روتے بچے کو اٹھایا اور اس کی نظروں کے سامنے چیر پھاڑ کر کھا گئی۔

عبداللہ کے لئے وہ منظر دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔

اس بچے کو کھانے کے بعد وہ عبداللہ کی طرف بڑھی اور بولی۔ ”اے لڑکے اب بھی وقت ہے میری بات مان لے اور عمل چھوڑ دے اور یہاں سے چلا جانا ورنہ تیرا حشر میں اس سے بھی برا کروں گی۔“ عبداللہ نے اس کو محض دھمکی سمجھا اور عمل پڑھنے میں مشغول رہا۔ پھر وہ بلا غصے سے اس کی طرف بڑھی اس کے تیور کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ پر جیسے ہی وہ حصار سے ٹکرائی اسے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اس کے سامنے جلنے لگی۔ اس کی چیخیں پورے جنگل میں گونج رہی تھیں۔ عبداللہ کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ اس نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ پھر پوری رات پر امن رہی۔

عبداللہ کا ایک رات کا عمل مکمل ہو گیا کیونکہ صبح ہو گئی تھی پھر اسے بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ”اپنی آنکھیں بند کر لو بیٹا اس نے ایسا ہی کیا اور جب آنکھیں کھولیں تو خود کو بابا جی کی جھونپڑی میں پایا۔ بزرگ اٹھ کر عبداللہ سے ملے اور ایک رات کا عمل پورا ہونے پر اور ثابت قدم رہنے پر مبارکباد دی۔ پھر عبداللہ کے لئے کھانا لایا گیا۔ کھانا

کھانے کے بعد بزرگ نے اسے سو جانے کے لئے کہا کیونکہ آج آنے والی رات پھر اسے جاگنا ہے۔ رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لئے وہ بستر پر لیٹ گیا اور میٹھی نیند لینے لگا۔

شام تک وہ سوتا رہا۔ پھر حسب معمول اٹھ کر کھانا کھایا پھر بزرگ نے اسے رات کے عمل کے خطرات سے آگاہ کیا اور ثابت قدم رکھنے کی تلقین بھی کی۔ اس نے عمل کے کلمات بزرگ کو سنائے تاکہ اگر اس میں غلطی ہو تو اصلاح ہو جائے لیکن وہ اسے اچھی طرح یاد ہو گئے تھے۔

پھر اس نے خنجر اور تعویذ جو کہ بزرگ نے اسے دیئے تھے اٹھائے، بابا جی نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں اور آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا کیونکہ اس کے عمل کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جب کھولیں تو اپنے آپ کو عمل والی جگہ پر کھڑا پایا۔

بزرگ کے پاس واقعی بہت طاقتیں تھیں جس کی وجہ سے وہ اسے منٹوں میں اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیتے۔ ورنہ اگر اسے پیدل چلنا پڑتا تو نہ جانے وہ اس جگہ پر کتنی دیر میں پہنچتا۔ اس نے اپنی جگہ کو صاف کیا حصار کھینچا اور بیٹھ کر ورد کرنے لگا۔ وہ اب آنے والے خطرات سے پہلے ہی آگاہ تھا کہ آج کی رات پہلے والی رات سے زیادہ سخت ہوگی۔

اسے بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ آسمان سے بارش ہونے لگی وہ ڈر گیا کیونکہ یہ عام بارش نہیں بلکہ خون کی بارش تھی حیرت کی بات یہ تھی کہ کل کی طرح یہ سب حصار کے باہر ہو رہا تھا۔ پھر اسے دور سے اپنی طرف ایک لڑکی آتی دکھائی دی وہ جب اس کے نزدیک آئی تو عبداللہ اس کے حسن میں کھو کر سب کچھ بھول گیا۔ وہ لڑکی حصار سے تھوڑا ہٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بت بنا اس حسن کی دیوی کو تنکے جا رہا تھا۔ وہ لڑکی افسردہ تھی پھر اس نے برونا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی عبداللہ کے دل کو بھاگنی۔ وہ بھی ممکنہ باندھے عبداللہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ”کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ اگر کرنا چاہتے ہو تو حصار سے باہر نکل آؤ ہم شادی کر کے



ایک نئی دنیا بنائیں گے۔“

تو ایک چمکتی تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ عبد اللہ پہلے تو اس سے ڈر رہا تھا مگر اب وہ تیار تھا۔ اور پھر جیسے ہی بوڑھے نے وار کیا تو اس کا وارنا کام گیا۔

پھر اچانک بوڑھے کی گردن کٹ کر دور جا پڑی گردن کے کٹتے ہی خون فوارے کی مانند بہنے لگا۔ وہ کچھ دیر تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

پھر عبد اللہ کو بابا جی کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹا جلدی سے آنکھیں بند کرو ورنہ چڑیل آ کر تمہیں مار ڈالے گی۔“ عبد اللہ نے ہدایت پر عمل کیا اور فوراً سے پہلے جھونپڑی میں تھا۔ بابا نے اسے خوشی سے گلے لگایا۔ ”واہ بیٹا واہ۔۔۔ تم نے تو آج کمال کر دیا۔ اب تم آسانی سے چڑیل کو مار سکو گے۔“

”بابا جی میری جیت میں سب سے بڑا کمال تو آپ کا ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے اب باتیں چھوڑو اور کھانا کھا کر آرام کرو، آج آخری رات کا عمل باقی ہے، یہ رات باقی دو راتوں سے زیادہ سخت ہوگی، اس میں تمہارے پاس اتنی خوفناک شکل والی چڑیلیں آئیں گی جن کا تصور بھی تمہارے رونگٹے کھڑنے کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن بیٹا اپنے دل کو مضبوط رکھنا اب منزل بالکل قریب ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے ضرور حاصل کر لو گے۔“ بزرگ نے عبد اللہ کو ہمت دلائی اور وہ انہیں خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر عبد اللہ کے لئے گرم کھانا لایا گیا جسے اس نے جی بھر کر کھایا۔ کھانا کھا کر بزرگ اسے کچھ دیر عمل کے متعلق بتلاتے رہے اور پھر بزرگ ہی کے کہنے پر وہ لیٹ گیا۔ لیٹے ہی وہ میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔ آج اس کی آنکھ خلاف توقع عصر کے قت کھل گئی اس نے جھونپڑی میں دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا بابا جی بھی کہیں باہر چلے گئے تھے۔

اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے اور پھر جھونپڑی سے باہر نکل آیا وہ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اسے ایک طرف سے بزرگ آتے دکھائی دیئے وہ

عبد اللہ اس کے حسن کے سحر میں جکڑ چکا تھا۔ وہ حصار سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹا یہ سب ایک فریب ہے اس لڑکی کی باتوں میں مت آؤ یہ خوب صورت نہیں بلکہ بد صورت چڑیل ہے، حصار سے باہر نکلتے ہی یہ تمہیں مار ڈالے گی اور خون پئے گی۔“

بابا جی کی آواز سن کر وہ اس لڑکی کے سحر سے آزاد ہوا۔ اس نے خود کو بہت ملامت کیا اور عمل دوبارہ پڑھنے میں لگ گیا۔ اس لڑکی نے اسے بہت بہلایا پھسلایا پر اب وہ سنبھل چکا تھا۔ لڑکی نے اسے دولت اور شہرت کا لالچ دیا پر اب وہ اس کے مکر میں کہاں آنے والا تھا۔ جب اس کی تمام تر ترکیبیں ناکام ہو گئیں تو لڑکی نے اپنا روپ بدلنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے دو لمبے لمبے دانت ظاہر ہو گئے۔ اس کے ناخن کئی انچ کے ہو گئے اس کی ناک بالکل غائب ہو گئی اور بال زمین کو چھونے لگے۔ وہی لڑکی جس کو پہلے وہ حسن کی دیوی سمجھ رہا تھا فدا ہوا جا رہا تھا اب اس کو دیکھ کر کراہیت ہو رہی تھی لڑکی آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے لگی اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو سے عبد اللہ کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ دل یوں زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیوں کے پنجر کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

قریب آتی آتی جب وہ حصار سے نکل رانی تو اسے آگ لگ گئی وہ یوں جلنے لگی جیسے اس پر پیٹرول چھڑک کر جلا دیا گیا ہو۔ اس طرح جلتی وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی اور اس کے ساتھ ہی عبد اللہ کے دوسرے دن کا عمل بھی پورا ہو گیا۔ عبد اللہ نے حصار سے باہر قدم رکھا اس کے سامنے وہی مندر والا بوڑھا ظاہر ہو گیا وہ غصے سے لال پیلا ہوا جا رہا تھا۔ بوڑھے نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ پڑھ کر اس کی طرف پھوک ماری تو تیروں کی ایک بوچھاڑ عبد اللہ کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن وہ قریب آتے آتے غائب ہو گئے۔

بوڑھے نے اپنا وارنا کام دیکھا تو اور بھی زیادہ غصہ ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلانے



بہت پریشان لگ رہے تھے وہ اس کے پاس سے گزر کر بغیر کوئی بات کئے جھونپڑی میں داخل ہو گئے بزرگ کے اس رویے پر اسے حد سے زیادہ حیرانی ہوئی وہ بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔

بزرگ اندر سر جھکائے گہری سوچ میں غرق تھے۔  
”کیا ہوا بابا جی؟“ عبداللہ نے پریشانی سے سولا کیا۔

”کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں۔“ بزرگ نے صاف جھوٹ بول دیا۔۔۔۔۔

”کچھ بتائیں کیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پہلے آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔“ عبداللہ بولا۔

”بیٹا اس چڑیل کو پتا چل گیا ہے کہ تم نے ہی اس کے گرو کو مارا ہے، اب وہ تم پر کسی بھی وقت حملہ کر سکتی ہے۔

اس نے ایک رات کا ایسا چلہ کر لیا ہے جس کی وجہ سے اس کے شیطان آقا نے اسے بے انتہا طاقتیں دے دی ہیں اور اس بوڑھے نے بھی مرنے سے پہلے اپنی ساری

شکتیاں اسے دان کر دی تھیں جس سے وہ مزید طاقتور ہو گئی ہے اور تمہیں جو طاقتیں اس قمل سے ملیں گی وہ اس کے

مقابلے کے لئے کم ہیں تمہیں اس سے لڑنے کے لئے اس سے بھی زیادہ طاقت کی ضرورت ہوگی۔ میں اسی وجہ سے

پریشان ہوں کہ تم اس کا مقابلہ کیسے کر پاؤ گے۔“

بزرگ کی باتیں سن کر اس کا منہ توری کی طرح لٹک گیا۔ ”اب ایک ہی صورت ہے بیٹا۔“ بابا جی نے

افسردگی سے کہا۔  
”وہ کون سی۔“ اس نے بزرگ سے سوال کیا۔

”مجھے بھی اپنی کچھ طاقتیں تمہیں دینی ہوں گی، صرف اسی صورت میں تم اس کے مقابلے ٹھہر پاؤ گے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ بیٹا اب میں بوڑھا ہو گیا

ہوں، پتا نہیں کب موت کا پیغام آ جائے تو میری کچھ طاقتیں جو میں نے اکٹھی کی تھیں ضائع ہو جائیں گی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ سب میں تمہیں سونپ دوں۔“

بزرگ کی باتیں سن کر عبداللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”بابا جی میں

آپ کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا، پھر بھی آپ نے مجھے اپنے

بیٹے کی طرح رکھا، میری پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھا مجھ پر اتنی عنایتیں اور مہربانیاں کیں کہ جن کا بدلہ میں آپ کی غلامی کر کے بھی ادا نہیں کر سکتا، اب آپ اپنی زندگی کا حاصل بھی مجھے دے کر ایک اور احسان کرنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں بیٹا ایسی باتیں مت کرو تم میرے بیٹے جیسے ہو تم نے مجھے اپنا دکھ بتایا تو میں نے تمہاری مدد کر دی، میں نے تم پر کوئی احسان تو نہیں کیا بلکہ یہ سب تو انسانیت کے

ناٹے میرا فرض تھا اور ویسے بھی اگر اپنی طاقتیں تمہیں نہ دوں تو کس کو دوں گا، میں انہیں ضائع بھی تو نہیں کر سکتا۔“

بزرگ نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔  
”ٹھیک ہے بابا جی میں نے آپ کو استاد سمجھا ہے

اس لئے آپ کی جو مرضی کریں میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔“

”شباباش بیٹا۔“ پھر بزرگ اسے لے کر اس کھال پر بیٹھ گئے جو کہ جھونپڑی میں ایک کونے میں بچھی ہوئی تھی۔

بزرگ نے اسے اپنے سامنے بیٹھایا اور دونوں بیٹھنے کے لئے کہا۔ عبداللہ نے ایسے ہی کیا پھر ان کے حکم پر اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ پھر بزرگ عبداللہ

کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھنے لگے، پھر پھونکیں مارنی شروع کر دیں۔ ان کی ہر پھونک پر عبداللہ کی حالت

بدل جاتی اسے یوں لگتا جیسے اس کے جسم میں کوئی گرم شے داخل ہوئی جا رہی ہو۔ وہ اسی حالت میں ایک گھنٹہ

بیٹھے رہے پھر بابا جی کے حکم سے عبداللہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے آپ میں واضح

تبدیلیاں نظر آئیں اس کی آنکھوں میں بھی وہی چمک تھی جو بابا جی کی آنکھوں میں تھی۔

”اب تم عام انسان نہیں رہے اس وقت تمہارے قبضے میں کئی روہیں، بدروہیں، جن چڑیلیں آچکی ہیں۔

بیٹا ان طاقتوں کو کبھی غلط استعمال نہیں کرنا، ہمیشہ انسانیت کی خدمت کرتے رہنا، کسی کو مایوس نہیں کرنا۔“ اس کے

علاوہ بھی کئی اور نصیحتیں بزرگ نے کیں جن پر قائم رہنے کا عبداللہ نے وعدہ کیا۔



آج اس کے عمل کی آخری رات تھی۔ بزرگ نے اس کے لئے بہت ساری دعائیں کیں پھر بولے۔ ”آج رات تمہارے پاس وہی جڑیل آئے گی تم نے اس سے بالکل نہیں ڈرنا۔ چاہے جو بھی ہو جائے، اپنے عمل کو مکمل کرنا اور کسی صورت حصار سے باہر نہیں نکلنا۔“

رات ہونے والی تھی۔ عبد اللہ نے جی بھر کر بزرگ سے باتیں کیں، پھر بابا جی نے عبد اللہ کو گلے سے لگایا اور کہا۔ ”اب تمہارے عمل کا وقت ہو گیا ہے لیکن یاد رکھنا جو ہدایات میں نے تمہیں دی ہیں اس پر عمل پیرا رہنا ورنہ بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔“ اس نے بابا جی سے وعدہ کیا کہ وہ کسی صورت ان کی باتوں کو نہیں بھولے گا، پھر بابا جی نے عبد اللہ کو طاقتوں کے استعمال کا طریقہ بھی بتا دیا۔ عبد اللہ نے آنکھیں بند کر کے عمل پڑھا اور مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔

آج رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ جنگل میں ماسوائے گیدڑوں اور جھینگڑوں کے کچھ نہیں تھا پورے جنگل پر مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے حصار کھینچا اور بیٹھ کر عمل کا ورد کرنے لگا، اسے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کئی خوفناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں جب اس نے آوازوں کی سمت دیکھا تو اس کا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا کیونکہ اس کی طرف سینکڑوں گوشت سے عاری ڈھانچے دوڑے چلے آ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور تیز بھالے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے کچا چبانے والے ہیں، اس نے دل کو مضبوط رکھا اور عمل میں مشغول رہا کیونکہ اسے بابا جی کی بات یاد تھی کہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ڈھانچے حصار سے ٹکراتے ہی غائب ہو جاتے۔ ایسا صبح تک ہوتا رہا۔

آخری وقت میں وہی لڑکی نمودار ہوئی جو اسے پہلی بار راستے میں ملی تھی۔ اس کے انگ انگ سے مستی ٹپک رہی تھی۔ وہ مستانی چال چلتی ہوئی قریب آئی، اس نے عبد اللہ کو بہت لہرایا، کئی حربے آزما ڈالے مگر بے سود، پھر اس نے اپنی شکل بدلنا شروع کر دی اس کے سارے جسم پر لمبے لمبے بال اگ آئے جن میں زہریلے کیڑے کلبلا

رہے تھے اس کی آنکھیں تار کول جیسی ہو گئیں اس کے دو دانت جو کہ سامنے تھے باہر کونکل آئے یہ وہی چہرہ تھا جسے عبد اللہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اس نے خون پیا تھا۔ اس نے عبد اللہ سے وعدہ کیا کہ وہ وہاں سے چلی جائے گی اور کبھی کسی کو تنگ نہیں کرے گی لیکن اس کی معافیاں بھی دھوکہ ہی تھیں۔

صبح ہونے والی تھی عبد اللہ کا عمل پورا ہو گیا، اس لئے اس نے بسم اللہ پڑھ کر حصار سے باہر قدم نکال لئے، اس کا باہر نکلنا تھا کہ جڑیل اس پر برس پڑی، اس نے عبد اللہ پر کبھی آگ کے گولے پھینکے تو کبھی تیر، کبھی خون کی بارش کی تو کبھی سانپ بچھو مگر سب کے سب عبد اللہ کے قریب آتے آتے ختم ہو جاتے۔

جب اس جڑیل نے اپنے سارے دارنا کام دیکھے تو وہ گڑ گڑانے لگی۔ عبد اللہ نے عمل کے الفاظ پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو اس کے اعضا جسم سے الگ ہونا شروع ہو گئے، اس کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ عبد اللہ نے مزید عمل پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ مصیبت کے ٹلنے پر عبد اللہ نے خدا کا شکر ادا کیا، تیز آندھی شروع ہو گئی اور بے شمار بلیوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے اپنی ساتھی کی موت پر آنسو بہا رہی ہوں۔

پھر عبد اللہ نے دل میں بزرگ کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں تو وہ بزرگ کے سامنے تھا۔ اسے دیکھتے ہی فرط جذبات سے بابا جی کی آنکھیں نم ہو گئیں، بابا جی نے عبد اللہ کو گلے سے لگایا اور بولے۔ ”جڑیل کا خاتمہ ہو گیا ہے، اب وہ اپنے دادا دادی سے ملنے جاسکتا ہے۔“

لیکن عبد اللہ اب اپنا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ اس نے بابا جی سے ڈھیروں دعائیں لیں اور واپس گھر آ گیا۔ اور بابا جی ی ہدایت کے مطابق ضرورت مند اور دکھی لوگوں کی مدد میں وقت گزارنے لگا۔





# قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اندھیروں میں نکلتا ہے تو میرا گھر نہیں ملتا  
(عبدالکریم۔ کوٹھاکلاں)  
اگر معلوم ہوتا کہ عشق اتنا تڑپاتا ہے  
تو ہم دل جوڑنے سے پہلے ہاتھ جوڑ لیتے  
(ندیم بلوچ نوید شوکت۔ کوٹھاکلاں)

اک شام کے سائے تلے بیٹھے رہے وہ دیر تک  
آنکھوں سے کی باتیں بہت منہ سے کچھ کہا نہیں  
احساس کی خوشبو کہاں، آواز کے جگنو کہاں  
خاموش یادوں کے سوا میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں  
(محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

تو بھی نہ ملا تو کدھر جاؤں گا  
سوکھے پتوں کی طرح بکھر جاؤں گا  
یوں بھی ہوگا تم دیکھنا اے صنم  
تم سے بچھڑوں گا اور مرجاؤں گا۔  
(عمر دراز۔ کھڈیاں خاص)

آپ ساحل پر ہیں دیکھ کے حیران کیوں ہیں  
ہم وہی ہیں جنہیں چھوڑ آئے تھے طوفانوں میں  
(ثوبیہ۔ کنگن پور)

اپنوں سے مکھ موڑے نہیں جاتے  
سلسلے یوں ہی توڑے نہیں جاتے  
جن کو پایا ہو دسل کی مرادوں سے  
اقبال وہ لوگ چھوڑے نہیں جاتے  
(محمد اقبال۔ کنگن پور)

تو دور بھی ہے اور پاس بھی ہے  
کہیں کہیں تیری لکمی کا احساس بھی ہے  
دوست تو اور بھی بہت ہیں مگر  
تو پیرا بھی ہے اور خاص بھی ہے  
(کاشف عبید کاوش۔ بنگرام)

کتنے دنوں کے پیاسے ہوں گے یارو سوچو تو  
شبنم کا قطرہ بھی جن کو دریا لگتا ہے  
(مہر پرویز دولو۔ میاں چنوں)

☆☆

کرے کون دور وحشتیں اس دل کی بخاری  
یہ مریض نیم جاں اب ٹھہرا لا علاج ہے  
آج بھی دشت محبت میں تنہا کھڑی ہوں بخاری  
کسی نے کہا تھا صرف ”میری“ ہو کر رہنا  
(مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا)

رکا ہوا ہے میری آنکھ میں وہ ایک لمحہ  
بچھڑے وقت کسی کو میرا صدا دینا  
جو کر رہے ہو محبت تو یہ دھیان رہے  
بہت کٹھن ہے کسی یاد کو بھلا دینا  
(آصفہ سراج۔ لاہور)

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
دکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں  
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا  
(صائمہ اسلم۔ گوجرانوالہ)

کیوں پاس آ کے جانے کی بات کرتے ہو  
کچھ دیر تو پاس بیٹھو نظریں سیراب کرنے دو  
(وثیقہ زمرہ۔ سمندری)

یوں بھی ہنس کر شہر کو ویران چھوڑ آئے  
لوگوں میں اس سے عشق کے امکان چھوڑ آئے  
لہجے کے بعد اب وہ بدلتا نگاہ بھی  
رستہ بدل کے ہم اسے حیران چھوڑ آئے  
(محسن عزیز حلیم۔ کوٹھاکلاں)

بسالتے ہیں ذہنوں میں ہزاروں بت محبت کے  
وہ جس کو پوجتے تھے آج وہ پتھر نہیں ملتے  
وہ محسن دن میں شرماتا ہے باہر ہی نہیں آتا





پھر کسی قاسم و طارق کی ضرورت ہے  
گلشن حق کے نگہبان غزل رہنے دے  
(حکیم خان حکیم.....کامل پور موسیٰ انک)

اجڑے ہوئے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں  
ہر شخص کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں  
کوئی جا کے جہاں میں نہیں ہے آتا  
خوف کے سائے کتنے مہیب ہوتے ہیں  
خیالوں میں آکے جو مٹتے نہیں کبھی  
وہ کتنے پیارے میرے حبیب ہوتے ہیں  
تھک ہار کے سوجاتا ہوں میں آخر کار  
جذبہ زندگی کے کتنے قریب ہوتے ہیں  
مجھے بھی آئے گا گزرے دنوں کا خیال جاوید!  
حسن کے بھی پھر کتنے عجیب ہوتے ہیں  
(محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد)

حسرت رہے کہ اب مر ہی جائیں ہم  
کہ اپنا نام و نشان بھی نہ پائیں ہم  
اس محبت میں رستہ ہے، نہ منزل ہے  
ذر لگتا ہے کہیں کھو نہ جائیں ہم  
لاکھوں مجبوریاں راہ روکے کھڑی ہیں  
تم ہی کہو ذرا کس طرف جائیں ہم  
اپنے آنسو چھپا کر اپنی آہیں دبا کر  
بول بھلا کس طرح اب مسکرائیں ہم  
اے دنیا والو تم ہی انصاف کرو ناں.....  
آخر کب تک اپنی حسرتوں کو دفنائیں ہم  
ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکا ہے وجود اپنا  
چلو اپنی لاش کو خود ہی اٹھائیں ہم  
سانسیں دم آخر الجھ رہی ہیں سینے میں  
اب دیکھئے بخاری کب سکون پائیں ہم.....  
(مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا)

مجھے زندگی کبھی  
یوں بھی مل

زبان خوشبو میں تجھ سے کہا ہے  
صبا کی بات کو میں نے سنا ہے  
مرے جذبوں کی سچائی کو دیکھو  
یہ وہ جادو ہے جو تم پر چلا ہے  
پیاسا جو رہا دریا کنارے  
بہت اس میں کمال و حوصلہ ہے  
جو پتہ شاخ سے ٹوٹا وہ مردہ  
اشارہ یہ خزاؤں نے دیا ہے  
ہوا خوشیوں کی آتی ہے جہاں سے  
دریچہ وہ مجھے ہی کھولنا ہے  
بیاں ہوں جس میں دکھ میرے وہ سارے  
کسی کو اس طرح کا خط لکھا ہے؟  
رہی خانم یہ اپنے رت کی رحمت  
یہی احساس تو اس نے لیا ہے  
(فریدہ خانم۔ لاہور)

تھم گیا درد کا طوفان غزل رہنے دو  
دل ہے اب بے سرو سامان غزل رہنے دے  
یہ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں ہے جاناں  
میں ہوں تیرا مجھے پہچان غزل رہنے دے  
لٹ گیا راہ محبت میں میرا شوق سفر  
بہہ گئے اشکوں میں ارمان غزل رہنے دے  
میں نے کب تم سے محبت کی تمنا کی ہے  
اپنے دشمن کا کہا مان غزل رہنے دے  
دونوں اطراف سے ٹھکرایا ہوا بیٹھا ہوں  
جان سلامت ہے ایمان غزل رہنے دے  
جان جائے گی تم سب ختم مصائب ہوں گے  
عشق ہوتا نہیں آسان غزل رہنے دے



میرے گلے میں بانہیں ڈال کر  
میرے درد سارے ملا کر  
میرے غموں کو جڑ سے اکھاڑ دے  
میری ہر خوشی پر دھمال کر  
میری تاریک رات کو

اجالادے

مجھے لے جا غموں سے

نکال کر

مجھے زندگی کبھی یوں

بھی مل

میرے گلے میں بانہیں

ڈال کر

میرے گلے میں بانہیں

ڈال کر.....!

(سیدہ عطیہ زاہرہ - لاہور)

دوستوں کی محفل میں آنا جانا تو سیکھے  
جان جہاں دور جدید کے تقاضے نبھانا تو سیکھے  
ہر لمحہ ہر وقت ایک ہی موڈ میں نہ رہا کیجئے  
ہنسنے والوں کے ساتھ کھل کر مسکرانا سیکھے  
اب آبی گئے ہیں تو کچھ دیر ٹھہر جائیے  
محفل یاراں ہے کچھ پیٹا پلانا تو سیکھے  
مسرور رہیں گے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے  
دوستوں کی خوشی میں خوش ہو جانا تو سیکھے  
(طارق محمود - کامرہ انک)

زندگی پہلے جو ہوتی تھی بہاروں کی طرح  
ہو گئی وہ زندگی اب خار زاروں کی طرح  
ہو گیا وہ شخص میرا دشمن جاں ہو گیا  
جو رہا ہے ساتھ میرے رازداروں کی طرح  
نہ کہیں جلتا دیا ہے نہ کہیں دست دعا  
حال اپنا ہے انہیں ٹوٹے مزاروں کی طرح  
وہ بدلتے موسموں کے ساتھ ہی چلنے لگا  
زندگی اس نے گزاری بے قراروں کی طرح  
اب تو احساس مروت مٹ گیا ہے اس طرح

شہر میں ہم پھر رہے ہیں بے سہاروں کی طرح  
کیا ہوا رنگ خزاں چہرے پر ان کے آگیا  
جو شگفتہ تھے کبھی رنگیں بہاروں کی طرح  
ہے قمر ان سے تو سائے کی توقع ہی عبث  
ہو گئے جو لوگ سوکھے شاخساروں کی طرح  
(ریاض حسین قمر - منگلا ڈیم)

اے کاش دل نادان ایسا نہ کیا ہوتا  
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا  
اے کاش دل نادان.....  
وعدہ وفا کا ہم نے کس موڑ پہ ہے توڑا  
بنتے کسی چمن کو ویران کر کے چھوڑا  
معصوم کسی دل کو دھوکا نہ دیا ہوتا  
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا  
اے کاش دل نادان.....  
چاہت کی نئی دنیا کیوں بسائی ہم نے  
دولت سے محبت کی قیمت لگائی ہے ہم نے  
نیلام میں ہوئی تھی دل تو نہ بکا ہوتا  
اے کاش دل نادان ایسا نہ کیا ہوتا  
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا  
(آصفہ سراج - لاہور)

گھر واپس جب آؤ گے تم  
کون تمہیں پہچانے گا  
کون کہے گا تم بن سا جن یہ نگری سنسان  
بن دستک دروازہ گم سم بن آہٹ دہلیز  
سونے چاند کو تکتے تکرے راہیں پڑ گئیں مانند  
پل جیسے پتھر بن جائیں گھڑیاں جیسے ناگ  
دن نکلے تو شام نہ آئے  
آئے تو بحران  
کون کہے گا تم بن سا جن یہ نگری سنسان  
گھر واپس جب آؤ گے تم کیا دیکھو کیا پاؤ گے  
یار نگار وہ سنگی سا تھی  
مد بھریاں تھیں اکھیاں جن کی باتیں پھلجھڑیاں  
بجھ گئے تارے لوگ وہ پیارے رہ گئیں کچھ لڑیاں



دھول بول بولے دیکھو ایک گریزاں موج کی خاطر

صحرا صحرا پھرتے ہیں

تم بھی پھر درویش صفت اب

رقصاں رقصاں حیراں حیراں

لوٹ کے پھر کیا آؤ گے اور کیا پاؤ گے کیا پاؤ گے

کون کہے گا تم بن سا جن یہ نگری سنان

یہ نگری سنان

(محمد علی چغتائی..... خیر پور ٹامیوالی)

کیوں آنکھ تیری نم ہے تیری اپنی ہنسی پر  
دل کس نے کر دیا تیرا دیران بات کر  
(سنبھل ماہین..... سرگودھا)

زندگی باگیشتری سارنگ، دپک سونی

بت تراشی، رقص موسیقی، خطابت شاعری

پنکھڑی، تتلی، صنوبر، دوب، نسریں، چاندنی

لاجوردی، شربتی، دھانی، گلابی، چمپی

زعفرانی، آسمانی، ارغوانی، زندگی

لاجوتی، مدھ بھری، کوئل، سہانی زندگی

ہر نفس پروتی، پھول برساتی زندگی

خیمہ زربفت میں پازیب جھنکاتی ہوئی

مرکیاں لیتی، ٹھکتی، ناچتی، گاتی ہوئی

دوڑتی، بڑھتی، ہسکتی، جھومتی، گاتی ہوئی

اک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی

اک انگڑائی کے پل پہ لہراتی ہوئی

زندگی مڑتے ہوئے پتوں پر بوند دل کی دھنک

صبح سرما کی کرن، شام بہاراں کی دھنک

شہر تن میں پھول والوں کی گلی ہے زندگی

گردن آفاق میں چپا کلی ہے زندگی

(محمد عدن رامش..... راولپنڈی)

پچھڑ کر وہ مجھ سے پھر واپس لوٹ آنا بھول جاتا ہے

رلا کر مجھ کو پھر رات بھر صبح کو ہنساتا بھول جاتا ہے

اس کی ایسی ادائیں اکثر مجھ کو کر دیتی ہیں خفا

ہو جاتا ہوں جب خفا وہ بھی منانا بھول جاتا ہے

لا پرواہی دیکھی ہے اس کے ہر کام میں

دے کر زخم جدائی کا مرہم لگاتا بھول جاتا ہے

کہا تھا ایک دن نہ لکھا کرو میرا نام دیواروں پر

بھول کر لکھ دیتا ہے پھر لکھ کر مٹاتا بھول جاتا ہے

اس کی یادیں کتنی خوب صورت ہیں حبیب

جب بھی آتی ہیں ہمیں زمانہ بھول جاتا ہے

(رانا حبیب الرحمن..... لاہور)

☆☆

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر پر رہا کرو

یہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا گر گلے ملو گے تپاک سے

یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا اس پر اثر نہ ہو

اسے اتنی گرمی شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو

کبھی حسن پردہ نشین ہو ذرا عاشقانہ مزاج میں

جو میں بن سنور کے چلا کروں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو

(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ یار)

کچھ گناہ بخشے نہیں جاتے گناہ ذرا سوچ کے کیا کرو

کچھ خطا بخش نہیں جاتی خطا ذرا سوچ کے کیا کرو

دل جوڑ کے پھر توڑا نہیں جاتا، یہ کام ذرا سوچ کے کیا کرو

کچھ یادیں بھلائیں نہیں جاتیں ادائیں ذرا سوچ کے کیا کرو

کچھ الفاظ بھلائے نہیں جاتے کلام ذرا سوچ کے کیا کرو

کچھ درد بھولائے نہیں جاتے درد ذرا سوچ کے کیا کرو

ہر زخم مٹائے نہیں جاتے زخم ذرا سوچ کے کیا کرو

(ضخیم الحسن..... ہڈالی)

خاموش کیوں کھڑا ہے خن جان بات کر

مر جائے گا وگرنہ میری بات مان کر

کس نے کہا کہ بات کا مطلب بھی ہو کوئی

اس طور کی ہے یہی پیمان بات کر

چپ چاپ بار ماننا مناسب نہیں تیرا

اسی شان کے نہیں ہے یہ شایان بات کر



محبت کی تلاش میں

بھٹکنے والی لڑکی

بھول گئی تھی کہ

محبت ہر ایک کو نہیں ملتی

کچھ لوگ سدا بھٹکتے رہتے ہیں

کہ جن کی آنکھیں تو جاگتی رہتی ہیں

پر مقدر سوئے رہتے ہیں

(بلقیس خان۔ پشاور)

شورش قلب نے عذاب کیا

پیرہن سانس کا خراب کیا

کس نے خیرات دی ہے جلوؤں کی

کس نے تابندہ آفتاب کیا

جونہی شعروں کا انتخاب کیا

درد دل کا کشید کر بیٹھے

ہم نے اشکوں کو ہی شراب کہا

سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی

جس کلی کو ابھی گلاب کہا

ایک نیکی بھی نہیں قمر میری

جو کہتی اعمال کا حساب کیا

(چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان)

وعدے پر اعتبار کر کے

بگاڑ لی زندگی میں نے

تمہارے آنے کے انتظار میں

یونہی گزار لی زندگی میں نے

عشق کے حسین خیالوں میں

سنواری زندگی میں نے

تمہارے آنے کی خوشی میں

بچھادی پھلواری میں نے

بہت دیر کردی آنے میں

اب تو شادی کر لی میں نے

(سلیم بیک ہمدانی۔ کراچی)

موسموں کی عجیب سازش میں

گھر بھی جلتا ہے تیز بارش میں

جانے کیا کیا سوال پوچھیں گے؟

آج وہ زخم دل کی پرستش میں

فکر پرواز کرتی رہتی ہے

چشم و لب کی ہزار بندش میں

ہم نے کیا کیا عذاب جھیلے ہیں

اف ایک زندگی کی خواہش میں

رنگ تعبیر ڈھل گیا سارا واجد

ہم نے جو خواب دیکھے تھے پچھلی بارش میں

کتنی صدیوں کا درد ہے پنہاں

ایک لمحہ خوشی کی کاوش میں

ہم نے خود کو بھلا دیا واجد

ایک اسے بھولنے کی خواہش میں

(پروفیسر ڈاکٹر واجد یگینوی۔ کراچی)

ہم ہار گئے تم جیت گئے

ہم اپنی ہار سناتے گئے

تم اپنی جیت منالینا

تم ہم سے کچھ کچھ بہتر ہو

ہم کم تر ہیں تم بہتر ہو

تم اپنے پیار کو پالینا

تم جیت کی مستی میں آ کر

دل سے ہمیں بھلا دینا

ہم اپنی ہار منائیں گے

ہم سب کو یہ بتائیں گے

(عثمان غنی۔ پشاور)

ظلمت آگے انسان بھی چپ ہے

اور وقت کا سلطان بھی چپ ہے

جبر کے عکاس ہیں چہرے

ظلم کا ترجمان بھی چپ ہے

آہوں کا زندان بھی چپ ہے

انسان ہے حیوان یا درندہ!

اس کی کوئی تفسیر تو سوچو!

امن کی کوئی تدبیر تو سوچو!

کب تک مائیں بین کریں گی!

کوئی زندہ ضمیر تو سوچو!

عدل کی کوئی زنجیر تو سوچو!

شدت پسندی کی بے مقصد جنگ میں

سہاگ جس کا اجڑ گیا ہے

بیٹھی بال نوج رہی ہے

اور یہ بھی سوچ رہی ہے

حق کا پندار بھی چپ ہے

گلی اور بازار بھی چپ ہے

چہروں پر ہے وحشت طاری

رعایا کا مختار بھی چپ ہے

دھڑکن کی رفتار بھی چپ ہے

غاصب کے ہر ظلم کے آگے

بستی کا سردار بھی چپ ہے

انصاف ڈر کی صلیب پہ لٹکا

قاضی کا دربار بھی چپ ہے

زندگی خونی نہر میں ڈوبی

کشتی جیسے لہر میں ڈوبی

آزادی نفس کے پہر میں ڈوبی

فضا گولے بارود سے لرزی

دہشت مرے شہر میں ڈوبی

غیرت کا رواج بھی چپ ہے

بے رحم سماج بھی چپ ہے

فطرت اور مزاج بھی چپ ہے

باہر خوف ناج رہا ہے

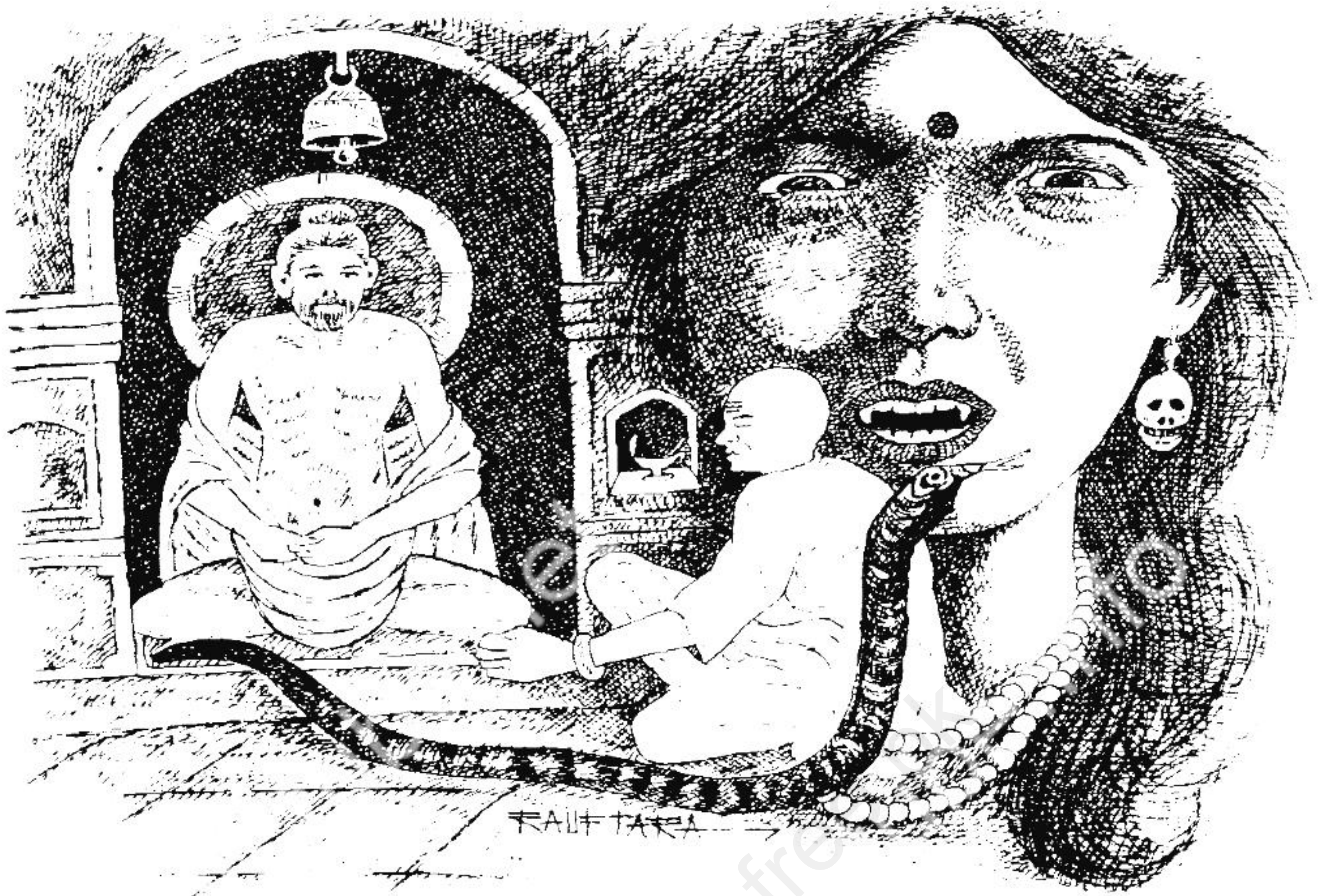
کل بھی چپ ہے

آج بھی چپ ہے

(عامر زمان عامر۔ بورے والا)

☆☆





## آسیبی جنگل

رضوان علی سومرو - کراچی

کلام الہی کا سننا تھا کہ سامنے کھڑی حسین و دیدہ زیب لڑکی کی شکل اچانک بدھیت ہو گئی اور اس پر لرزہ طاری ہو گیا وہ کپکپانے لگی اور اس کے حلق سے بھیڑیے سے مشابہ چیخ برآمد ہونے لگی کہ اتنے میں.....

خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی اور جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

خانے میں کھس گیا۔ فریش ہونے کے بعد اب اس کا ارادہ صرف اور صرف خواب خرگوش کے مزے لینا تھا۔ ایک تیز قسم کی چیخ سے مشابہ آواز سن کر انسپکٹر بیدار ہو گیا۔ فوری طور پر سمجھ نہ سکا کہ وہ کس قسم کی آواز ہے۔ مکمل طور پر ہوش و حواس میں آنے میں اسے چند منٹ ضرور لگے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ جس جگہ وہ موجود ہے، وہاں اس کا بستر نہیں ہے بلکہ ایک سجا سجایا

**سورج** غروب ہو چکا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ساتھ ہی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ انسپکٹر ساجد اپنی گاڑی میں ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپس جا رہا تھا۔ پولیس فورس کا وہ سب سے جانباز اور نڈر افسر مانا جاتا تھا۔ آج اس کی طبیعت تھوڑی ناساز تھی۔ اس لئے وہ اپنا کام جلد ختم کر کے گھر کے لئے نکل پڑا تھا۔ فلیٹ میں پہنچ کر وہ فریش ہونے کے ارادے سے غسل



دربار ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ طبیعت ناسازی کے سبب جلد سو گیا تھا۔ مگر یہ شاہی دربار اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ بہر حال وہ یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا۔

دربار کے دائیں بائیں شاہی کرسیاں بچھی تھیں جس پر مختلف لوگ اپنے عہدوں کے حساب سے براجمان تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کی کرسیاں ابھی تک خالی تھیں۔ شاید ان کے دربار میں آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ دربار کے وسط میں ایک نہایت ہی خوب صورت اور حسین لڑکی سر جھکائے مجرمانہ انداز میں کھڑی تھی، اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے، دفعتاً سنگھ پھونکنے جانے کی آواز سن کر انسپکٹر چونک پڑا۔ سنگھ کی آواز اس بات کی علامت تھی کہ راج دربار میں مہاراجہ آ رہے ہیں۔

”بادب، بالملاحظہ ہو شیار

مہاراج رنجیت سنگھ کے اوتار

سورج دیوتا کے پرستار

نئے ہونے والے مہاراجہ بھیم سنگھ

بدھار رہے ہیں“

انسپکٹر ساجد نے دیکھا ایک شخص جو نہایت خوب صورت اور زرق برق لباس میں ملبوس تھا دربار میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ شخص انتہائی تکبرانہ چال چلتا ہوا تخت پر بیٹھ گیا۔

”راج دربار شروع کیا جائے.....“ مہاراجہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

مہاراجہ کی بات سن کر ایک دوسرا شخص جو کہ تخت کے بعد سب سے اونچی گدی پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

”مہاراجہ کی جے ہو..... دیوتاؤں کا شبھ سایہ آپ پر سدا قائم رہے۔ بھگوان کرے آپ ہمیشہ یونہی شکتی شالی رہیں اور ہماری رکھشا کرتے رہیں۔“

انسپکٹر ساجد نے دیکھا وہ شخص اپنی تعریف سن کر انتہائی خوش ہونے لگا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انسپکٹر ساجد پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ انسپکٹر نے مہاراج کا چہرہ دیکھا تو اسے اپنے پیشہ ورانہ

تجربے کی بنا پر اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ یہ شخص انتہائی خطرناک اور عیار ہے۔ سب سے بڑی بات اس کی آنکھوں اور چہرے کی بناوٹ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا یہ شخص اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ”مہامنتری اس لڑکی نے کیا پاپ کیا ہے؟“ مہاراجہ نے اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو اس کی تعریف کر رہا تھا۔

”سرکار..... یہ کنیا بڑی چلتی ہے، اس نے آپ کے بڑے بھائی مہاراج اجیت سنگھ کا خون کیا ہے.....“ مہامنتری نے عیاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر سر جھکائے کھڑی لڑکی نے چونک کر ان دونوں کی جانب دیکھا دوسرے ہی پل اس کی غزالی آنکھوں میں نفرت و حقارت ناچنے لگی تھی۔

”پاپی میں نہیں، تم دونوں ہو..... کام تمہارا، نام میرا..... پرنتو میں تمہارا انت ہوں..... بھگوان کی دیا سے مجھے وہ شکتی حاصل ہے جس سے تم دونوں پاپی میرے ہی ہاتھوں سر و ناش ہو جاؤ گے.....“ وہ لڑکی کسی ناگن کی طرح پھنکارنی ہوئی بولی تھی۔

اس کی بات سن کر مہامنتری اور راجا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ مہامنتری چور نظروں سے دوسرے درباریوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ میانوں تک پہنچ چکے تھے۔ حکم ملنے کی دیر بھی کہ اس گستاخ لڑکی کا سرتن سے جدا ہو جائے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے انسپکٹر نے جو منظر دیکھا وہ انتہائی حیرت انگیز اور خوفناک تھا۔

قیدی لڑکی آن ہی آن میں ایک سانپ کا روپ لے چکی تھی۔ وہ سانپ عام سانپوں سے جسامت میں بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ سانپ کا رنگ انتہائی گہرا سبز تھا۔ دوسرے لمحے سانپ نے بجلی کی تیزی سے مہامنتری کے اوپر جست لگائی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر انسپکٹر اپنے حلق سے خارج ہونے والی دلخراش چیخ پر بڑی مشکل سے ضبط کر سکا۔

چیخ کی آواز کے ساتھ ہی انسپکٹر ساجد کی آنکھ کھل گئی تو گویا یہ خواب تھا۔



انسپکٹر کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ انسپکٹر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کہ یہ سب ایک خواب نہیں ایک حقیقت ہو، لڑکی کی صورت اس کے دل و دماغ میں نقش ہو گئی تھی۔ خواب میں دیکھی جانے والی صورت اس کو بھلانا مشکل ہو رہا تھا۔ انسپکٹر نے اٹھ کر گھڑی دیکھی تو گھڑی رات کے 2 بجے کا وقت دکھا رہی تھی۔

انسپکٹر نے دوبارہ سے پہلو بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن شاید نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بس اس کا ذہن اس لڑکی اور اس خوفناک خواب کے بیچ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اپنے سفر پر گامزن تھی، نیند انسپکٹر ساجد کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ آرام کرسی پر بیٹھا سوچوں میں مگن تھا۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کی تصویریں اور دہشت گردوں کا بھیانک انجام تھا۔ دھماکے میں مسجد کے پیش امام سمیت بہت سارے لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔

دفعۃً اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ جو بہت حد تک سیٹی سے مشابہت رکھتی تھی۔ انسپکٹر بیٹھے بیٹھے چونک پڑا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آواز اسے کمرے سے ہی آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے الماری کی جانب بڑھا، جہاں اس کے ذاتی استعمال کا پستول رہتا تھا۔

سیٹی جیسی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس بار وہ آواز الماری کی جانب سے آئی تھی۔

شاید کوئی چوہا وغیرہ ہوگا..... انسپکٹر نے دل میں سوچا۔ اور آگے بڑھ کر الماری کھول دی..... دوسرے ہی لمحے وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا..... اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت ناچنے لگی تھی۔

کپڑوں کے اوپر سبز رنگ کا ایک سانپ پھن کاڑھے بیٹھا جھوم رہا تھا..... سانپ کے انداز سے کہیں سے بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ڈسنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ بس وہ یک ٹک انسپکٹر کو ہی گھورے جارہا تھا۔

دفعۃً انسپکٹر کی آنکھوں سے خوف و دہشت کا

احساس زائل ہونے لگا، عجیب بے خودی اور مستی سی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سانپ کی جانب بڑھنے لگا۔ جیسے کہ اس سانپ نے اسے کسی تنویری عمل کے زیر اثر کر لیا ہو..... جیسے ہی وہ سانپ کے قریب پہنچا۔

سانپ نے اچک کر اس کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ یہ سب اچانک ہی ہوا تھا۔ اس پر تیزی سے غشی طاری ہونے لگی پھر وہ دھڑام سے فرش پر گر گیا۔

☆.....☆.....☆

تیز تیز گھنٹیوں کے شور کی آواز سے انسپکٹر کی آنکھ کھل گئی، گھنٹیوں کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں سریلی جھنکار کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ساتھ ہی کچھ سازوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند رکھنا ضروری سمجھا۔

”وید جی..... راج کمار کو ہوش آنا چاہئے..... ورنہ ہم کچھ کھالیں گے.....“ آواز انتہائی سریلی اور کافی مترنم و دلکش تھی۔

”ناں..... ناں بھگوان کا مندر تو سب کے لئے ہوتا ہے، اسے ضرور ہوش آ جائے گا.....“ ایک مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

انسپکٹر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ اسے تو سانپ نے ڈسا تھا پھر ”میں یہاں کیسے؟“

انسپکٹر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اس کی پہلی نظر ایک سادھو کے لباس میں ملبوس ایک بوڑھے شخص پر پڑی جس کی وضع قطع مندر کے پجاریوں جیسی تھی۔ وہ ایک چبوترے پر چیت پڑا تھا اس کے بالکل پیچھے ایک قد آدم مورتی نصب تھی شاید وہ ان کا پتھر کا دیوتا تھا۔ انسپکٹر کی اپنی وضع قطع بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے بھی ہندو شہزادوں جیسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

مندر انتہائی پر شکوہ تھا جس کی ہر چیز سونے کی معلوم ہوتی تھی۔ ساجد ابھی اسی صورتحال پر غور کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کہ مورتی کے سامنے



سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”شکر ہے بھگوان کا تمہیں ہوش آ گیا..... ورنہ زہر بہت خطرناک تھا۔“  
بوڑھا پجاری مسکرا کر بولا۔

”زہر.....“ انسپکٹر حیرت بھرے لہجے میں بولا  
اسے وہ سانپ یاد آ گیا جس نے اسے ڈسا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا مگر ہاتھ پر کوئی سانپ کا نشان نہ تھا۔ انسپکٹر پریشان ہو گیا۔ ”یہ کیا معاملہ ہے؟“ دفعتاً اس کے کانوں میں پجاری کی آواز گونجی۔  
”ہاں زہر..... مگر راج کمار تم نے زہر کھایا کیوں؟“ پجاری بولا۔

”میں نے زہر.....“ اس کے منہ سے حیرت بھرا جملہ نکلا.....

لڑکی نے اس کا جملہ سن لیا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے ہی انسپکٹر کی طرف پلٹی تو وہ حیران ہو گیا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جو اس دن خواب میں نظر آئی تھی۔ جو سانپ بن کر اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔  
دفعتاً انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

”روپ متی پوجا کہاں ہے؟“ یہ بات بول کر انسپکٹر حیران ہو گیا۔ اس طرح کا جملہ بولنے میں اس کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی اور ہی ہے۔

”مار دیا..... میں نے اس حرامزادی کو..... اس نے تمہیں مجھ سے چھیننا چاہا تھا، راج کمار.....“

”ہم تم سے نفرت کرتے ہیں اور صرف پوجا سے پیار.....“ ساجد نے دانت پیس کر کہا۔ ساجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی اور ہی شخصیت تحلیل ہو گئی ہے۔ جو اس سے یہ سب کروا رہی ہے۔

”راج کمار تم صرف اور صرف میرے ہو..... میں اپنے پریم میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لئے اس کو مار دیا۔“  
لڑکی کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔

”ہم تم سے نفرت کرتے ہیں..... تم نے اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی اسے ڈس لیا۔ اسے تڑپ کر گرتے دیکھ کر ہم نے بھی زہر پی لیا..... لیکن بد قسمتی سے بچ گئے لیکن اب نہیں.....“

یہ کہہ کر ساجد چوتھے کی طرف بڑھا جہاں مورتی نصب تھی مورتی کے ہاتھ میں ایک ترشول تھا۔  
”رک جاؤ.....“ راج کمار، تم یوں نہیں جاسکتے..... تم میرے ہو.....“ لڑکی رو دینے والے لہجے میں بولی۔  
”نہیں..... ہم مرنا چاہتے ہیں.....“ ساجد کے اندر کی دوسری شخصیت سے آواز آئی.....  
”نہیں..... نہیں..... راج کمار رک جاؤ.....“ لڑکی چیخی۔

لیکن راج کمار کے اندر جیسے بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ راج کمار نہایت تیزی سے مورتی کے ہاتھ میں نصب ترشول کی جانب بڑھا۔ اس سے قبل وہ ترشول نکال پاتا ایک تیر زن کی آواز کے ساتھ راج کمار کی پیٹھ میں پیوست ہو گیا۔ لڑکی چیخ کر اس کی جانب بڑھی اس سے قبل وہ اس تک پہنچتی سپاہیوں کی وردیوں میں ملبوس لوگوں نے اسے گھیر لیا۔

اس کے ساتھ ہی ساجد کی آنکھ کھل گئی۔ ساجد اسی جگہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ گویا وہ سب کچھ بحالت بے ہوشی میں ہوا تھا۔ اب وہ خواب تھا یا حقیقت اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔

☆.....☆.....☆

پان شاپ والے نے ان دو مشکوک بندوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ تھانے میں موجود تھا اور نہایت سہا ہوا تھا۔

”ص..... صاحب..... مم..... مم..... میں بال بچے دار آدمی ہوں..... اگر میں نے ان کی شناخت دے دی تو وہ مجھے مار دیں گے۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری شناخت خفیہ رہے گی.....“ انسپکٹر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔



”جی.....“ پان والا۔ بدستور سہے ہوئے لہجے میں بولا۔

پان والا جیسے جیسے بتاتا جاتا محکمہ پولیس کا گرافک ڈیزائنر تصویر بناتا جاتا، انسپکٹر ریاض اور انسپکٹر ساجد بھی اس کے سامنے کھڑے تھے، جیسے ہی دونوں تصویر مکمل ہوئیں جو چہرے سامنے آئے انہیں دیکھ کر انسپکٹر ساجد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ دونوں وہی چہرے تھے جو اس نے خواب میں دیکھے تھے۔ مہاراجہ اور مہامنتری کے تھے جن پر وہ لڑکی سانپ بن کر حملہ آور ہوئی تھی۔

انسپکٹر ساجد حیرت سے ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ جو وہ خواب میں دیکھ چکا تھا۔

”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ دونوں وہی ہیں۔“ انسپکٹر ریاض نے پان والے سے پوچھا۔

”جی بالکل..... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں..... کہ یہ دونوں وہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو.....“ انسپکٹر نے کانٹیل کو اشارہ کیا۔

جس نے پان والے کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ پان والے کے جاتے ہی انسپکٹر ریاض نے انسپکٹر ساجد کی طرف دیکھا جو کہ ابھی تک محو حیرت تھا۔

”ان دونوں کے نام ارجن اور شنکر ہیں.....“

”ایں.....“ انسپکٹر ساجد چونک پڑا۔

”کیا کہا تم نے۔“ انسپکٹر ساجد نے اس سے کہا۔

”ان دونوں کے نام ارجن اور شنکر ہیں.....“ انسپکٹر ریاض نے کہا۔

”مگر یہ دونوں وہی ہیں جو میرے خواب میں آئے تھے.....“ ساجد نے زیر لب کہا۔

”کیا..... کہا.....“ انسپکٹر ریاض نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کا گرفتار ہونا بہت ضروری ہے ورنہ بہت سے سوال تشنہ رہ جائیں گے.....“

ممالک کے ایجنٹوں نے خرید لیا ہو۔“

”کچھ بھی ہو..... ان کی گرفتاری بے حد ضروری ہے.....“ انسپکٹر ساجد بولا۔

دو چار دن کی دوڑ دھوپ اور تفتیش کے بعد پتہ چل گیا تھا کہ یہ دونوں مجرم سرحدی گاؤں کی طرف بھاگے ہیں جہاں سے وہ شاید سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

”ریاض..... ان دونوں کے پیچھے میں جاؤں گا.....“ انسپکٹر ساجد نے کہا۔

”تم اکیلے..... وہ بہت خطرناک ہیں..... میں بھی ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں دوست تمہارا شکریہ..... موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب آنی ہوگی ضرور آئے گی.....“

انسپکٹر ساجد نے مسکرا کر کہا۔

”جیسی تمہاری مرضی..... میرے دوست.....“

ریاض نے جواباً مسکرا کر کہا۔

☆.....☆.....☆

انسپکٹر ساجد نے سرحدی گاؤں کے بوڑھے چوہدری کی طرف دیکھا جس کی عمر 65 سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ انسپکٹر ساجد 4 روز قبل اس گاؤں میں پہنچا تھا اور گاؤں کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ سرحدی گاؤں بہت زیادہ خوب صورت اور حسین تھا اگر کوئی اس گاؤں کو پھولوں کی وادی کہتا تو غلط نہ تھا۔

یہ گاؤں حسین و جمیل پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی، ویسے مسلمان بھی اس گاؤں میں تھے جو کہ تعداد میں کم تھے۔

اس گاؤں میں سب سے پر اسرار اور عجیب و غریب واقعات سے مزین ایک پہاڑی تھی جس کا نام کالی پہاڑی تھا، کالی پہاڑی تک پہنچنے کے لئے پرانے جنگلات کو عبور کرنا پڑتا تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ جو ان جنگلات میں داخل ہوا زندہ واپس نہیں آیا۔

”ہاں تو چوہدری صاحب..... ان دونوں آدمیوں کو دیکھا ہے اس گاؤں میں.....“ انسپکٹر ساجد نے دو



تصویریں دکھاتے ہوئے کہا جو کہ ارجن اور شکر کی تھیں۔  
 ”اس گاؤں میں اس طرح کے دونوں بندے  
 گزشتہ ایک ماہ سے نہیں دیکھے چھوٹا سا تو گاؤں ہے  
 انسپکٹر صاحب.....“ چوہدری نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ذرا یاد کریں غور سے دیکھیں..... یہ دونوں  
 خطرناک قاتل ہیں امام صاحب کی شہادت میں ملوث  
 ہیں.....“  
 ”گاؤں میں تو داخل نہیں ہوئے..... ہو سکتا ہے  
 کہ گاؤں کے باہر سے کالی پہاڑی پر چلے گئے ہوں.....“  
 چوہدری صاحب سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔  
 ”کالی پہاڑی.....“ ساجد نے حیرت و استعجاب  
 سے کہا۔

”جی..... باہر سے ایک مختصر راستہ ہے، جس پر  
 چلنے سے جنگلات کو کراس نہیں کرنا پڑتا ہے..... اور  
 جانے والا آسانی سے کالی پہاڑی پر پہنچ جاتا ہے۔“  
 ”کالی پہاڑی یہ کیا ہے؟“  
 ”کالی پہاڑی پر ایک انتہائی پرانا مندر ہے جو کہ  
 نہ جانے کتنی صدیوں پہلے بنا تھا، اس کے بارے میں  
 عجیب و غریب پراسرار روایات سنتے چلے آ رہے ہیں کہ  
 یہ مندر آئیبی ہے۔ جو اس مندر کے اندر جانے کی کوشش  
 کرتا ہے اسے موت آ جاتی ہے۔“ چوہدری نے کہا۔  
 ”تو آپ کا خیال ہے کہ یہ دونوں آدمی پیچھے  
 راستے سے مندر میں داخل ہوئے ہیں۔“

”جی..... نہیں..... میں یہ کہہ رہا ہوں ہو سکتا ہے  
 کہ وہ دونوں آدمی مندر میں داخل ہوئے ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے چوہدری صاحب..... میں جاؤں گا  
 اس مندر میں۔“ انسپکٹر ساجد نے پر عزم لہجے میں کہا۔  
 اب ساجد کے پاس کالی پہاڑی تک جانے کے  
 دو راستے تھے۔ ایک راستہ گاؤں کے باہر سے جاتا تھا  
 اور ایک راستہ جنگلات سے ہو کر گزرتا تھا۔

کافی سوچنے کے بعد ساجد نے جنگل کے راستے  
 جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے باہر کا راستہ مختصر ضرور  
 تھا مگر خطرناک اور دشوار گزار تھا۔ اس لئے اس نے

جنگل کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔  
 ایک مضبوط جیپ ایک رسی اور دوسرا سامان لے  
 کر ساجد اپنی منزل کی جانب چل پڑا تھا، اسے ایسا لگ  
 رہا تھا جیسے کہ کالی پہاڑی پر ہی اسے تمام سوالات کے  
 جوابات مل جائیں گے۔

ساجد جنگل کے قریب پہنچ کر رک گیا نہ جانے  
 کیوں اسے عجیب و غریب سے خوف کا احساس ہو رہا  
 تھا، لیکن اسے کوئی طاقت کشاں کشاں جنگل کے اندر  
 جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے  
 کوئی کہہ رہا ہو کہ جیپ جنگل کے باہر ہی چھوڑ دو۔

چنانچہ اس نے جیپ جنگل کے باہر جھاڑیوں کے  
 پاس کھڑی کی اور اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔  
 جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ویسے ویسے اندھیرا  
 بڑھتا جاتا ایک بات اس نے محسوس کی تھی، اس نے اب  
 تک کسی بھی درندے یا پرندے کی آواز نہیں سنی تھی اور  
 ہوا بھی جیسے بند تھی، عجیب قسم کا سناٹا اس نے جنگل میں  
 محسوس کیا، جیسے کہ جنگل میں ان درختوں کے علاوہ اور  
 کوئی بھی نہ ہو۔

دفعتاً اس نے عجیب سی آواز سنی آواز تیز قسم کی  
 سیٹی سے مشابہت رکھتی تھی، سیٹی کی آواز سنتے ہی ساجد  
 بری طرح سے چونک پڑا۔ بڑی سرعت سے اپنا پستول  
 نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا وہ سیٹی کی آواز کی جانب  
 بڑھنے لگا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک طویل میدان تھا۔  
 ساجد میدان میں داخل ہو گیا۔ پستول اب بھی  
 اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چونکے انداز میں آگے بڑھتا  
 رہا تھا۔ لمبا اور طویل میدان عام میدانوں سے ہٹ کر  
 تھا۔ اس کی مٹی بھوری کی جگہ سبز بھی جبکہ میدان میں  
 تھوڑے فاصلے پر ٹنڈ منڈ سے چھوٹے چھوٹے درخت  
 تھے جو کہ بالکل بھی قدرتی معلوم نہیں ہو رہے تھے۔  
 درختوں کا رنگ بھی سنہری مائل تھا۔

ساجد شدید ترین حیرتوں کے ساتھ آگے بڑھتا  
 رہا، دفعتاً اسے اسی طرح کی تیز قسم کی سیٹی کی آواز پھر



سنائی دی تھی۔

سینی کی آواز سن کر وہ بری طرح سے اچھل پڑا تھا۔ اچانک اسے اپنے اندر ایک خوف سا محسوس ہوا، اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے آس پاس کوئی ہے، اس احساس کے ہوتے ہی وہ مزید ڈر گیا۔ اچانک اس کے کانوں میں رونے کی آواز گونجنے لگی وہ آواز کسی شیر خوار بچے کی تھی۔ اس آواز کو سنتے ہی جیسے اس کے قدموں کو پر لگ گئے، وہ اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا، بھاگتے بھاگتے اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ گر پڑا، گرتے ہی اس کے ہر احساس کے گرد اندھیرا چھا گیا۔

☆.....☆.....☆

سکھ کے پھونکے جانے کی آواز سن کر ساجد کو ہوش آ گیا۔ اسے اپنا سر بالکل بھاری سا محسوس ہو رہا تھا بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سر پر مسلسل ہتھوڑے پڑ رہے ہوں، ساجد نے ہلنے کی کوشش کی تو منہ سے بے ساختہ سسکاری نکل گئی، جسم کا جوڑ جوڑ جیسے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے کراہنے لگا، تھوڑی دیر میں اسے سکون محسوس ہونے لگا، اسے ایسا لگا کہ جسم کی توانائی بحال ہو رہی ہو۔ عجیب و غریب قسم کی بے معنی سی آوازیں سن کر آنکھیں کھول دیں۔

اپنے چاروں طرف عجیب و غریب قسم کے لوگوں کو دیکھ کر وہ سہم گیا، وہ لوگ انتہائی کالے رنگ کے بدنما اور عجیب سے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر اسے ہولی وڈ کی فلمیں یاد آ گئیں جن میں جنگلی قبیلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

ساجد بڑی سرعت سے اٹھ بیٹھا..... اسے اٹھنے میں انتہائی شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی، جس جگہ ساجد موجود تھا، اس جگہ روشنی ناکافی تھا، اس لئے اس جگہ کا تعین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے موجود لوگوں کو دیکھ کر بہت زیادہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ ساجد کو بہت زیادہ پر شوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”کون ہو تم.....“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

اس کی بات سن کر سارے لوگ چونک پڑے اور

بڑی تیزی سے دو لوگوں نے اس کے ہاتھوں کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

”جواب کیوں نہیں دیتے! مجھے اس طرح کیوں پکڑا ہوا ہے؟“

”میں جواب دیتی ہوں تمہیں کہ ہم کون ہیں.....“ ایک انتہائی سریلی آواز سن کر بری طرح سے وہ چونک پڑا..... آواز دینے والی اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ جس جانب سے آواز آئی تھی اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ اس کی آواز سن کر سارے جنگلی نما لوگ اس وقت رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے نظر آئے۔

دفعاً اس پوری جگہ انتہائی تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ روشنی کہاں سے آرہی تھی یہ تو اسے پتہ نہ چلا لیکن وہ جگہ جہاں وہ تھا اس کا وہ اچھی طرح سے جائزہ لے سکتا تھا۔

یہ ایک پتھریلی کوٹھری تھی بالکل ویسے ہی جیسے کہ سینٹرل جیل میں قیدیوں کے لئے ہوتی ہے۔ ساجد نے سامنے دیکھا تو اسے ایک انتہائی خوب صورت اور حسین لڑکی کھڑی نظر آئی، ساجد نے زندگی میں کبھی اتنا حسن نہیں دیکھا تھا لڑکی سر سے پیر تک دعوت گناہ تھی۔ اس نے انگریز عورتوں کی طرح سوئمنگ کا سٹیوم نما کوئی چیز پہن رکھی تھی، جسم کے بقیہ حصوں پر رنگ و روغن سے لپ کیا ہوا تھا۔ ساجد نے سر گھما کر دیکھا تو وہ جنگلی اب بھی رکوع کی حالت میں کھڑے تھے۔

”یہ سب میرے غلام ہیں اور ہم سب چاند کے پجاری ہیں.....“ لڑکی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ لڑکی درحقیقت میں حسن و جوانی کا شاہکار تھی۔ اس کی آواز خود اس کی طرح انتہائی خوب صورت تھی۔

”مگر تم لوگ ہو کون؟“ ساجد نے پوچھا۔

”کہا نا کہ ہم چاند کے پجاری ہیں اور ہر سال چاند کا دیوی کے آگے بلی دیتے ہیں۔“ لڑکی نے رکوع میں جھکے ہوئے لوگوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگ اٹھے اور اپنے قدموں وہاں سے باہر نکل گئے۔

”بلی دیتے ہو مگر کس کی؟“ ساجد نے حیرت سے



پوچھا۔

انسانوں کی اور آج تمہاری باری ہے، اور وہی رات ہے..... جب تمہیں قربان کیا جائے گا۔“

اتنا سننا تھا کہ ساجد کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا، ساجد نے دونوں ہاتھوں سے پسینہ پونچھا اور تھوک نلگتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھ کر گویا ہوا۔ ”تو گویا یہ جنگل تم لوگوں کی وجہ سے آسبی ہے.....“

”نہیں یہ جنگل واقعی آسبی ہے لیکن چونکہ ہم چاند کا کے پجاری ہیں، جس کی وجہ سے ہم محفوظ ہیں۔“ ساجد نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”اب تو کہانی ختم.....“

میرے پاس کتنا وقت ہے.....“ ساجد نے اس سے پوچھا۔

”صرف دو گھنٹے.....“ لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔  
”ساجد میاں..... یہی وقت ہے کچھ کرنے کا.....“ ساجد نے دل ہی دل میں سوچا۔

”مگر تم لوگ یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟“ ساجد نے یونہی پوچھ لیا۔

میں اس سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں۔“ لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔

اس وقت ساجد کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دفعۃً ساجد نے بیٹھے بیٹھے زقند لگائی اور بجلی کی تیزی سے لڑکی پر جا کر لڑکی اس ناگہانی افتاد سے بری طرح بوکھلا گئی، اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی ساجد نے اس کو یکے بعد دیگرے اس کے منہ پر دو مکے جڑ دیئے..... لیکن دوسرے پل ہی اس نے ساجد کو ہوا میں اچھال دیا۔ ساجد ہوا میں اچھل کر واپس فرش پر پڑا، لڑکی بھنا کر جیسے بھوک شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔

ساجد فرش پر کراہ رہا تھا، لڑکی نے ساجد کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا، خون پونچھتے ہوئے ساجد کی ناک پر زوردار ٹکرماری اور ساجد چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے لمحے ساجد نے خود کو سنبھالا اور پولیس

ٹریننگ کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے لڑکی کو گھوم کر کلک ماری اور پے در پے کئی کلکیں لگا دیں، ساجد کا خیال تھا کہ وہ اتنی مار کھانے کے بعد ٹھنڈی ہو جائے گی لیکن ساجد کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

لڑکی الٹی قلابازی کھاتی ہوئی آئی اس کی دونوں لائیں ساجد کی طرف تھیں، دونوں لائیں ساجد کے سینے پر بھرپور انداز سے پڑی تھیں، ساجد سینے پر لات کھا کر گر پڑا۔ گرتے ہی ساجد چیخ مار کر فرش پر کراہنے لگا۔

لڑکی فاتحانہ انداز سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔  
دفعۃً ساجد کو کچھ خیال آیا اس نے موزے میں اڑسا ہوا پستول نکالا اور پے در پے دو تین فار ایک ساتھ کر دیئے۔ لیکن دوسرے پل اس نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ مگرچ تھا۔

تینوں گولیاں لڑکی کے سینے پر لگی تھیں، ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے سینے پر تین سوراخ ہو جاتے، لیکن گولیاں لڑکی کے سینے سے ٹکرا کر دور جا گریں، جیسے وہ سینہ پتھر کا ہو۔

”اب تم کو کون بچائے گا..... تم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ میرے بارے میں۔“ لڑکی قہقہہ لگا کر بولی۔

ساجد کو ایسا لگا کہ جیسے لہو اس کی شریانوں میں جم کر رہ گیا۔ لڑکی آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات انتہائی خطرناک تھے، صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اب وہ کوئی انتہائی خطرناک قدم اٹھائے گی، ساجد نے پے در پے سارا پستول اس پر خالی کر دیا، گولیوں کی آواز سن کر سارے جنگلی اندر داخل ہو گئے، اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے ساجد کو پکڑ لیا، لڑکی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی، دفعۃً دروازہ کھلا نیلے رنگ کا دھواں کوٹھری کے اندر داخل ہو گیا، دھواں کافی تعداد میں اندر داخل ہو رہا تھا۔

دھواں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر لڑکی چونک پڑی، دفعۃً ساجد کا ہاتھ کسی نے پکڑ لیا۔

ساجد کا ہاتھ انتہائی سرد ہاتھوں نے تھام رکھا تھا۔ ساجد کو ایسا لگا کہ وہ ہاتھ نہیں برف کی سرد سل ہو، جس



## مچھر

مالک (نوکر سے) تم نے مچھر نہیں مارے۔ میرے کان میں گنگنارہے ہیں۔  
نوکر بولا۔ ”صاحب.....! مچھر تو مار دیئے ہیں۔ یہ تو ان کی بیوائیں ہیں جو غم سے رو رہی ہیں۔“

(محمد وارث آصف - واں پھراں)

ساجد نے سوچا کوئی پھل دار درخت ڈھونڈا جائے تاکہ اس کا پھل کھا کر بھوک مٹائی جائے۔  
ساجد تھوری دیر بعد اٹھا اور پھل دار درخت کی تلاش میں آگے بڑھنے لگا جیسے وہ آگے بڑھا اس کو گھوڑوں کی ٹالپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ساجد فوراً ایک درخت کے پیچھے ہو گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ساجد نے دیکھا۔

”تین گھڑ سوار سر سے پاؤں تک کالے لباس میں ملبوس اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔ ایک گھڑ سوار کے گھوڑے پر ایک بچی لدی ہوئی تھی جو کہ سب ہوش تھی۔ انہوں نے اس بچی کو زمین پر بیچ دیا۔“

”سردار..... کیا ارادہ ہے؟“ ایک گھڑ سوار نے دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ آواز انتہائی خریزاتی ہوئی تھی۔  
”ذبح کر دو سالی کو بہت تنگ کیا ہوا ہے اس نے۔“ پہلے نے تیسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تیسرے گھڑ سوار نے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا۔“

ساجد یہ منظر دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اس کے اندر سویا ہوا پولیس آفیسر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

”اے..... رک جاؤ..... یہ جرم میں تم لوگوں کو نہیں کرنے دوں گا۔“ ساجد ان کی طرف دیکھ کر چلایا۔  
ساجد کی آواز سن کر وہ تینوں چونک پڑے، لڑکی کو

میں زندگی کا احساس بالکل نہ تھا۔  
”جلد نکل چلو تمہاری منزل یہ نہیں۔“ آواز انتہائی سریلی اور خوب صورت تھی۔

”تم کون ہو؟“ ساجد نے پوچھا۔  
”یہ وقت زیادہ باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ دھوئیں کا پردہ زیادہ دیر تک نہیں رہے گا۔“ سرد ہاتھ نے تقریباً ساجد کو گھسیٹتے ہوئے کہا۔

ہاتھ ساجد کو گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے باہر لے گیا۔ ساجد کو ایسا لگا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہو۔ ہاتھ اس کو گھسیٹتے ہوئے آگے آگے لے جا رہا تھا۔ بس اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دھوئیں کے پیچوں بیچ چلا جا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھواں چھٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ اسی جنگل میں کھڑا ہے۔

”یہاں سے بالکل سیدھے چلے جاؤ۔“ تمہاری منزل زیادہ دور نہیں..... مگر خبردار..... راستے میں جو کچھ دیکھو اس پر کسی بھی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہ کرنا ورنہ نتائج کے ذمہ دار خود ہو گے۔“

ساجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے آواز پہلے بھی سنی ہے لیکن کہاں اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ ساجد کی منزل کالی پہاڑی تھی۔ جہاں وہ دو مجرم چھپے ہوئے تھے؟ جن کے چہرے بالکل ویسے ہی تھے جیسے کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا؟ اس لئے وہ وہاں جا رہا تھا، ساجد آرام، آرام سے چلتا ہوا جنگل کے گھنے حصے میں داخل ہو گیا، وہ آہستہ آہستہ اس بچی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ اس پگڈنڈی کے دونوں اطراف بڑے بڑے وسیع و عریض درخت، جھاڑیاں خود رو پودے موجود تھے۔ ساجد بڑے آرام سے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اس نے جھاڑیاں کاٹ کر راستہ بنانے کے لئے خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

جنگل بڑھتا ہی جا رہا، نہ جانے ساجد کتنی دیر تک چلا ہوگا۔ اب ساجد کافی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

بھوک و پیاس کا احساس اب شدت سے سر اٹھانے لگا تھا۔



چھوڑ کر ساجد کی طرف دیکھنے لگے، اسی لمحے لڑکی بھی بیدار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ بھی ساجد کو نہایت عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”چھوڑ دو اس لڑکی کو.....“ ساجد انتہائی سرد لہجے میں چلایا۔

جواب دینے کے بجائے لڑکی سمیت وہ چاروں ہنسنے لگے۔

لڑکی کو ہنستا دیکھ کر ساجد کو نہایت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ کسی گڑبڑ کا احساس بھی۔

ان تینوں نے اپنے چہرے پر پڑے ہوئے کالے نقاب اتار دیئے۔

ان کے چہرے دیکھ کر ساجد کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہ منظر انتہائی خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔

لڑکی کے ناخن مڑنے لگے تھے، آنکھیں بے حد

نیلی ہونے لگی تھیں چہرے کی کھال جگہ جگہ سے ادھر اُدھر

لگی تھی..... جبکہ وہ تینوں گھڑ سواروں کے چہرے.....

چہرے نہیں استخوانی کھوپڑیاں تھیں..... جن کے

سوراخوں سے کالے سانپ جھانک رہے تھے۔

انتہائی خوفناک منظر دیکھ کر ساجد سمجھ گیا کہ اس کا

کھیل ختم ہو چکا ہے۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا نا.....“ ایک ہلکی سی

سرگوشی ساجد کے کانوں میں گونجی۔

”مگر.....“

”اگر مگر..... کچھ نہیں۔“ اب میں کچھ نہیں کر سکوں

گی.....“ آواز ہلکی ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔

ساجد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے،

موت اس سے چند لمحوں کے فاصلے پر تھی۔ اس پر اسرار

آسیبی جنگل میں اس کی قبر بن جائے گی.....

وہ چاروں طرف عفریت عجیب و غریب آوازیں

نکالتے ساجد کو دبوچنے آگے بڑھ رہے تھے۔

ساجد کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ بلند آواز

سے آیت الکرسی پڑھنے لگا۔

اور پھر کلام الہی کو سن کر وہ عفریت رک گئے۔ یہ کلام کی تاثیر تھی وہ عفریت پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ ان کے حلق سے اب چیخیں نکلتے لگی تھیں۔ اللہ کے کلام کا ہی اثر تھا کہ ساجد کے دل کو طمانیت محسوس ہونے لگی تھی اسی بل عفریتوں کے جسموں کو آگ لگ گئی، ان کی بھیاں تک چیخیں جنگل کی فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی تھیں۔

چند منٹوں کے بعد وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔

ساجد دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا

آگے بڑھنے لگا جیسے ہی درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا

اسے اپنے سامنے پہاڑیوں کا طویل سلسلہ نظر آیا جو کہ

انتہائی وسیع و عریض پہاڑیاں، ساجد نے کمر پر بندھی

رسی کھولی اور کوئی ایسی چیز ڈھونڈنے لگا کہ جس کا کنڈا

بنایا جاسکے۔

جلد ہی ساجد کو ایسی چیز مل گئی تھی جس کا وہ کنڈا

بنا سکے یہ لوہے کا ایک کڑا تھا جو کہ رنگ آلود ہو چکا تھا۔

ساجد بڑی تیزی سے پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ گیا۔

پولیس ٹریننگ میں وہ رسی کی مدد سے اترنے اور

چڑھنے کی تربیت لے چکا تھا۔ اس لئے وہ جانتا تھا کہ

اس کی مدد سے پہاڑی پر چڑھ جائے گا۔

آدھے گھنٹے کی انتھک محنت اور جدوجہد کے بعد

وہ پہاڑی پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہاڑی پر چڑھتے ہی ساجد کو اپنے سامنے قدیم

اور بوسیدہ سی عمارت نظر آئی جو کہ طرز تعمیر سے مندر لگتا

تھا۔ یہ عام مندر سے مختلف گنبد نما بنایا گیا تھا۔ مندر کے

دروازے پر انتہائی قد آدم مجسمہ نصب تھا اس مجسمہ کو دیکھ

کر ساجد کو میوزیم میں نصب وہ مجسمہ یاد آ گیا جو کہ مایا

تہذیب کی کھدائی کے دوران نکلا تھا۔

ساجد نے جیسے ہی دروازے کو دھکا دیا وہ از خود

اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ ساجد جیسے ہی اندر داخل ہوا

دروازہ بند ہو گیا، سامنے ایک طویل برآمدے نما

راہداری تھی، راہداری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر

مختلف مجسمے نصب تھے جو کہ پتھر کے تھے، ہر مجسمہ امتداد



زمانہ کے باعث سیاہ کالا ہو چکا تھا۔

ساجد مختلف مجسموں کو دیکھتا ہوا راہداری میں آگے بڑھنے لگا۔ راہداری عبور کرنے کے بعد ساجد ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہو چکا تھا۔ ہال کی چھت گنبد نما تھی، ہر طرف بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں، سامنے ایک سنگی چبوترے پر ایک بڑا پتھر کا بت نصب تھا۔ جو کہ کافی طویل اور دیو قامت تھا۔

☆.....☆.....☆

ساجد جیسے ہی ہال میں آگے بڑھا اسی لمحے ایک منٹ سے بھی کم وقفے کے اندر پورا ہال روشنی میں نہا گیا ساجد کے اوپر نہ جانے کہاں سے پھولوں کی برسات ہونے لگی..... پھولوں کی برسات اس قدر تھی کہ دو سیکنڈ کے اندر پورا ہال خوشبو اور پھولوں سے لد گیا.....

ساجد کی نظر مورتی پر پڑی وہ حیرت سے چونک گیا، کیونکہ مورتی کے سر پر ایک سانپ پھن اٹھائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا، سانپ انتہائی خوب صورت اور گہرے سبز رنگ کا تھا، اس کے جسم پر جگہ جگہ سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، آنکھوں میں اتنی مسحور کن چمک تھی، ساجد کئی لمحے تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ دفعتاً ساجد کی نظر مورتی کے دائیں اور بائیں طرف پڑی، دو شخص زنجیروں میں بندھے کھڑے تھے ان کے چہروں پر نقاہت طاری تھی، صاف ظاہر ہو رہا تھا ان دونوں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ ساجد نے ان دونوں کو صاف پہچان لیا، یہ دونوں وہی تھے جن کی تلاش میں وہ یہاں تک آیا تھا۔ ارجن اور شنکر جو کہ پیش امام صاحب کی اور دیگر نمازیوں کی شہادت کے ذمہ دار تھے، ان کی حالت کافی پتلی تھی، صاف لگ رہا تھا زندگی کسی بھی لمحے ان کا ساتھ چھوڑنے والی ہے۔

”ان کا یہ حال کس نے بنایا؟“ ساجد زیر لب بڑبڑایا۔

اچانک فضا میں گھنٹی کی آواز گونجی..... ساتھ ہی ساتھ سنکھ کی آوازیں ساجد کے کانوں میں گونجنے لگیں..... جیسے ہی سنکھ کی آواز تھمی مورتی پر بیٹھا ہوا

سانپ زندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔

سنکھ کی آوازیں کرا رجن اور شنکر بھی ہوش میں آگئے تھے۔ سانپ نے قہر آلود نظروں سے ان دونوں قیدیوں کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے سانپ نے اڑتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر ڈس لیا۔ ان دونوں کے حلق سے نکلنے والی چیخ انتہائی کرہہ تھی..... تھوڑی ہی دیر میں وہ پانی بن کر بہنے لگے اور پھر چند لمحے بعد وہاں کچھ نہ تھا۔

سانپ فرش پر گر کر تڑپنے لگا، چند لمحوں بعد سانپ کی جگہ ایک خوب صورت اور حسین لڑکی موجود تھی جس کی آنکھیں بند تھیں، چہرے پر سکون اور طمانیت کا احساس تھا۔

چند لمحوں بعد لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور ساجد کی طرف بڑی ہی محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”میری تمپا پوری ہو گئی راج کمار تم آگئے.....“ وہ مسکرا کر بولی۔

ساجد نے اس لڑکی کی طرف غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

لڑکی آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوچھا کہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر مورتی کو پرنام کیا اور والہانہ انداز میں رقص کرنے لگی..... رقص کے انداز میں جوش و خود سپردگی تھی، ساجد کے کانوں میں گونجنے والی سریلی آوازیں اس کے پاؤں کی ہر جنبش میں مدغم ہو چکی تھیں ساجد نے اس قدر والہانہ رقص بھی نہیں دیکھا تھا، ساجد اپنے وجود کا ہر احساس کھو چکا تھا۔ اس وقت سارے ماحول پر پراسراری بے خودی چھائی تھی.....

دفعتاً وہ لڑکی رقص کرتے کرتے ساجد کے پاس آئی اور اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

”کون ہو تم؟“ ساجد نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مجھے پہچانو..... راج کمار..... پہچانو راج



کمار.....“

ساجد کانپ کر رہ گیا یہ وہی آواز تھی جس نے اس کو جنگلیوں سے نجات دلائی تھی۔

”راج کمار..... مجھے پہچانو..... وقت کی گرد اپنے ذہن سے ہٹا کر دیکھو تمہیں اپنی روپ متی یاد آئے گی..... جس نے تمہارے پریم میں پوجا کو مار دیا..... تم نے ہیرے کی انگٹھی چاٹ لی لیکن تم بچ گئے..... تم نے میرے کارن دوسرا جہنم لیا ہے۔“

”کیا بک رہی ہو؟“ ساجد نے جھلا کر کہا۔

اچھا سنو شاید تم کو یاد آئے۔ ”آج سے ہزار سال پہلے اس جگہ ایک بہت شاندار ریاست تھی۔ ریاست کا مہاراجہ شش پال بہت بڑا دھرماتما اور پر جا کا خیال رکھنے والا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے ایک کا نام اجیت سنگھ، دوسرے کا نام جگجیت سنگھ تھا۔ ریاست کے دستور کے مطابق مہاراجہ کی موت کے بعد اجیت سنگھ کو راج گدی پر بیٹھنا تھا اجیت بہت سندر اور نیک دل گیانی تھا، بھگوان کا سچا بھگت یہ مندر اس نے بنوایا تھا ان کا وقت زیادہ یہیں گزرتا تھا پر جا بھی اس سے خوش تھی۔

اس کے برخلاف جگجیت سنگھ بہت گھمنڈی اور ظالم تھا، دن رات شراب پی کر باندیوں اور کنیزوں کی آبرو سے کھیلتا تھا، لوگ اس کے ظلم سے پریشان تھے مگر خوف کے مارے مہاراجہ سے شکایت کرنے کی ہمت نہ تھی یہ جسے تم ارجن کے نام سے جانتے ہو، یہی جگجیت تھا، اور تم اجیت.....“ اتنا کہہ کر لڑکی سانس لینے کے لئے رکی۔

مگر ساجد چیخ پڑا۔ ”نہیں..... تم جھوٹ کہتی ہو.....“

”داستان ابھی ختم نہیں ہوئی.....“ لڑکی نے پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

”مہامنتری چکروتی جس کی بیٹی جگجیت سنگھ سے منسوب تھی۔ مہامنتری جگجیت کو مہاراجہ بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اجیت کو ختم کرنے کی ٹھانی کام بہت مشکل تھا۔ اس زمانے کے راجاؤں کا دستور تھا کہ وہ اپنے محل میں وش کنیا ہیں (زہریلی لڑکیاں) ضرور رکھتے تھے راجہ انہیں اپنی جان کی حفاظت کرنے کے لئے

پالتے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رہتے تھے۔ انہی دنوں محل میں میرا اور ایک راج نرنگی جو کہ وش کنیا بھی تھی بڑی دھوم تھی اس کا نام پوجا تھا، چکروتی نے پوجا کو لالچ دے کر اجیت سنگھ کو مارنے بھیجا تا کہ اجیت سنگھ جیسے ہی اس کے ہونٹوں پر پیار کرے مر جائے۔

لیکن پوجا تو خود ہی اجیت سنگھ کے پریم کا شکار ہو گئی۔ اس کے دل میں وہ جوت (شمع) جلی جسے پریم کہا جاتا ہے۔ پیار تو تیاگ مانگتا ہے اس لئے اس نے تیاگ دیتے ہوئے راج کمار اجیت سنگھ یعنی تم کو سب بتا دیا۔

راج کمار جو کہ خود بھی پوجا سے سچا پریم کرتا تھا نے پوجا کو معاف کر دیا۔ اور اپنے راجا بننے کے انتظار کرنے کو کہا کیونکہ وہ راجا بن جاتا تو پوجا کے ذریعے پوجا کو وش سے آزاد کروا دیتا۔

چکروتی اور جگجیت سنگھ نے مجھے بلایا اور زہر سے آزادی کا لالچ دے کر راج کمار کو ٹھکانے لگانے کو کہا میں نے زہر سے آزادی کے لالچ میں اجیت کو ختم کرنے کا سوچا۔ لیکن میں بھی پریم بندھن میں جکڑ گئی۔ اجیت سنگھ کو نظر بھردیکھنا ہی قاتل ثابت ہوا۔ مگر اجیت تو پوجا کا تھا اور وہیں میرے دل میں پوجا کے لئے نفرت پیدا ہوئی..... محبت کی نفرت..... اپنے محبوب کو حاصل کرنے کا جنون یہ جنون مجھ سے کچھ بھی کرا سکتا تھا..... میں جب بھی اجیت اور پوجا کو پیار بھری باتیں کرتے دیکھتی تو میرا روم روم جھلس جاتا پھر ایک دن میں نے ایک منصوبہ بنایا ایک انتہائی خوفناک منصوبہ۔

میں نے اپنے آپ کو ناگ دیوتا کے سامنے ارپن فیصلہ کیا تا کہ ناگ دیوتا کا ایک روپ مجھے مل جائے یہ بات میں نے چکروتی اور جگجیت سنگھ کو بتائی کیونکہ دیوتا کے سامنے زتھ کی پوجا کے لئے ان دونوں کی انومتی (اجازت) ضروری تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی اجازت کے لئے میں چکروتی سے ملی۔

”میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔“



چکروتی نے کہا۔  
 ”مجھے ناگ دیوتا کی پوجا کرنی ہے۔۔۔۔۔ اس کے لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“  
 ناگ دیوتا کا ایک روپ مجھے ملے گا اور میں پوجا کوڈس لوں گی پوجا خودوش کنیا ہے۔ اس لئے ناگ دیوتا کا زہرا سے مار سکتا ہے۔“  
 ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پوجا کے ہٹ جانے کے بعد تم راج کمار کو مار دو گی۔“ چکروتی نے کہا۔  
 ”میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔۔۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہت دور۔۔۔۔۔ میرا پریم پوجا کی یاد بھلا دے گا۔۔۔۔۔“  
 اتنا کہنے کے بعد لڑکی سانس لینے کے لئے رکی۔۔۔۔۔ جبکہ ساجد کے چہرے پر جیسے کہ داستان کے سحر میں گم تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا وہ اس داستان کا کوئی ایک کردار ہو۔  
 ”پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔ کیا پوجا مر گئی؟“  
 ”ہاں۔۔۔۔۔“ لڑکی نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔  
 ”پوجا تو مر گئی مگر تم میرے نہ ہوئے۔۔۔۔۔ تم نے پہلے جنم میں مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے ناگ دیوتا کی پوجا کی اس نے خوش ہو کر مجھے ناگن کا ایک روپ دے دیا۔ میں نے پوجا کوڈس لیا وہ مر گئی۔ راج کمار نے زہر کھالیا مگر میں نے اسے مندر میں لے جا کر رکھ دیا۔ میری پوجا سے خوش ہو کر ناگ دیوتا نے راج کمار کو زندہ کر دیا۔“  
 راج کمار نے خودکشی کرنے کی کوشش کی اس منظر کو تم خواب میں دیکھ چکے ہو، اسے چکروتی نے مار دیا۔  
 راج دربار میں مجھ پر الزام لگایا گیا۔۔۔۔۔ میں نے سانپ بن کر ان دونوں کوڈس لیا۔۔۔۔۔ وہ دونوں مر گئے یہ بھی تم خواب میں دیکھ چکے ہو۔ میں نے خود کو فوج کے حوالے کر دیا۔  
 قید خانے میں پوجا کر کے شیوجی سے مدد کی درخواست کی انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ ”راج کمار دوسرا جنم لے گا مگر وہ تمہیں جب ملے گا۔۔۔۔۔ جب تم ان دونوں پاپوں کو راج کمار کے سامنے مارو گی اس کے لئے

تمہیں ہزار سال انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لئے تمہیں اپنا شریر چھوڑنا ہوگا۔“  
 ”تو میں نے آتما ہتیا کر لی۔ میری آتما ہزار سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ آج تم آگے راج کمار اب تم میرے ہو۔۔۔۔۔ میرے ہو۔۔۔۔۔“  
 یہ کہہ کر روپ متی رو پڑی۔۔۔۔۔ اسے روتے دیکھ کر ساجد کا دل نرم پڑ گیا۔  
 ”کیا چاہتی ہو تم؟“  
 ”تمہیں! راج کمار صرف تمہیں۔۔۔۔۔ سب یاد آ گیا۔۔۔۔۔“  
 ساجد کو یاد تو کچھ نہیں آیا تھا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔  
 ”آؤ۔۔۔۔۔ میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر اس نے ساجد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ساجد کو ایسا لگا کہ جیسے کہ کسی برف کی سل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔  
 وہ آہستہ آہستہ اسے چلاتی ہوئی ایک دوسرے ہال میں لے گئی۔ دوسرے ہال میں ایک سانپ کی ایک بہت بڑی مورتی رکھی تھی۔ جس کے سامنے ایک چبوترا تھا۔ جس پر خون کے دھبے سوکھے پڑ چکے تھے۔  
 ”راج کمار تمہیں یہاں مرنا ہوگا۔۔۔۔۔ تاکہ تم میرے ہو سکو۔“ روپ متی نے سرد لہجے میں کہا۔  
 ساجد موت کا سن کر کانپ گیا۔۔۔۔۔  
 ”مرنے سے پہلے تمہیں ناگ دیوتا کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ تاکہ تم۔۔۔۔۔ جسم کے پنجر سے آزاد ہو سکو۔“  
 ساجد یہ سن کر کانپ گیا۔۔۔۔۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر سے پاؤں تک ہلا دیا ہو۔  
 ”ساجد تم ایک کلمہ گو مسلمان ہو۔۔۔۔۔ اس پتھر کو سجدہ مت کرو۔۔۔۔۔ باطل مٹنے کے لئے آیا ہے۔۔۔۔۔“  
 ساجد کے اندر سے ایک آواز آئی۔  
 ساجد چونک گیا۔۔۔۔۔ اس کے اندر سے جیسے سویا ہوا مسلمان جاگ اٹھا۔۔۔۔۔ اس نے انتہائی ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔



”میں ایک مسلمان ہوں، مسلمان مرنا تو پسند کرتا ہے لیکن باطل کے آگے جھکنا نہیں۔“

اس کی باتیں سن کر روپ متی لال بھبھوکا ہو گئی اس کی خوب صورت آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

”تم..... میرے راج کما نہیں ہو سکتے..... تم کوئی اور ہو.....“

اتنا کہہ کر وہ مورقی کی جانب سر جھکا کر بیٹھ گئی اس کی پشت ساجد کی جانب تھی۔

وہ چند لمحے تک ساجد کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی رہی، جیسے ہی وہ ساجد کی جانب مڑی ساجد اسے دیکھ کر ڈر گیا..... اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا..... آنکھوں سے غصہ اور حقارت ظاہر ہو رہی تھی۔ ”تم نے ناگ دیوتا کی توہین کی ہے..... اب تمہیں موت سے کوئی نہیں روک سکتا، چاہے پھر مجھے ہزار سال تک ہی کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔“

ساجد ڈر کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن روپ متی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا تو سرخ روشنی کا ایک شرارہ نکل کر ساجد کے جسم سے جا ٹکرایا۔

روشنی کا شرارہ ٹکراتے ہی ساجد کو اپنے جسم میں آگ لگتی ہوئی محسوس ہوئی، ساجد فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ روپ متی حقارت بھری نظروں سے ساجد کو تڑپتا ہوا دیکھنے لگی.....

”تم نے میرے دیوتاؤں کو پتھر کہہ کر اپنی موت کو دردناک بنا لیا ہے اب میں تمہیں بتاؤں گی۔“

دوسری بار ہاتھ کا اشارہ کیا اس بار ساجد ہوا میں اچھلا اور چھت سے جا ٹکرایا..... اور مزید تڑپنے لگا.....

”م..... مم..... میں ایک مسلمان ہوں..... مسلمان صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے.....“

روپ متی نے جواب دینے کے بجائے تڑپتے ہوئے ساجد کی جانب پھر اشارہ کیا۔ ساجد اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا..... ساجد زمین پر جا گرا۔ دفعتاً اسی لمحے ساجد کے کانوں سے آواز ٹکرائی..... جو کہ انتہائی دھیمی تھی۔ ”پریشان کیوں ہو..... میرے عزیز..... ذکر الہی

کرو..... پھر دیکھو قدرت کا نظارا۔“

ساجد کراہتا ہوا اٹھا اور سورۃ اخلاص کا بلند آواز سے ورد کرنے لگا۔ کلام الہی کا سننا تھا کہ روپ متی پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پھر لرزہ کپکپی میں تبدیل ہو گیا..... روپ متی کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

ساجد نے سورۃ اخلاص با آواز بلند ورد شروع کر دیا تھا۔ مندر کے در و دیوار پر لرزہ طاری ہو گیا.....

ساجد پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ روپ متی کے جسم نے آگ پکڑ لی ہے۔

مندر کے در و دیوار زلزلے کی لپیٹ میں آ چکے تھے۔ ساجد نے دیکھا کہ پتھر کی مورقی سرنگوں ہو چکی ہے۔ روپ متی کی چیخیں ساجد کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے ساجد کا پیر پھسلا اور گر گیا تو ساجد کا سرستون سے ٹکرایا۔ اسی لمحے ساجد کے حلق سے چیخ نکلی اس کا ذہن اندھیرے میں گم ہونے لگا، نیم وا آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ مندر کے در و دیوار گر رہے ہیں۔ روپ متی آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی اس کی جانب بھاگی ہوئی آرہی ہے۔ پھر اس کے ذہن کے سارے دروازے بند ہو گئے اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

پھر جب ساجد کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جیب کے قریب پڑا ہوا ہے۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اسے گزشتہ واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے جان بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور جیب اشارت کر کے آگے بڑھا دی، اب سے ایک اور سفر کرنا تھا، جس میں جسم کی نہیں روح کی ضرورت ہوتی ہے، جس سفر میں صرف اللہ کو راضی کرنا ہوگا، دور کہیں سے ساجد کے کانوں میں اذان کی آواز گونجی اور ساجد نے جیب کا رخ مسجد کی جانب کر دیا۔







## اجر صبر

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان کو لہولہان کرنے کے بعد درخت سے باندھ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اسے پانی کی ایک بوند بھی نہ دی جائے اور پھر ایک وقت آیا کہ نوجوان کی روح اس کا جسم چھوڑ کر پرواز کر گئی اور پھر روح نے ایک فیصلہ کیا تو.....

محبت، خلوص اور چاہت کی دل گریتہ کہانی جس میں پڑھنے والوں کیلئے سبق ہی سبق ہے

کی گردن کو ایک مخصوص ڈھیل دے کر سنبل کے کھر درے تنے سے جکڑا گیا تھا۔ یوں کہ اگر وہ گردن کو حرکت دیتا تو بندش رگوں کو کاٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ارد گرد لا تعداد لوگ تھے جو اس کو دیکھ رہے تھے۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہم لوگ اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ مدد کرنا تو دور کی بات، الٹا کسی بے کس کی بے بسی کا تماشہ دیکھتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ درخت کے

محسن میرے وجود کو سنگسار کرتے وقت شامل تھا سارا شہر اک تہوار کی طرح اس کا نیم جان وجود بے چارگی کی رسیوں میں جکڑا تھا، وہ مجسم ”بے بس“ تھا بے بس جس کی رگوں میں بے قراری کا لاوا بار بار ”جانگنی“ کے عالم میں سر پٹختا تھا۔ اس کے گرد آلود پیر مضبوطی سے رسیوں میں جکڑے تھے۔ ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھے گئے تھے۔ اور اس



قریب چند لوگ آتشیں اسلحہ لئے کھڑے تھے۔ ان کا انداز کسی محافظ کا سا تھا اور وہ اس بندش زدہ وجود کی ”حفاظت“ پر مامور تھے۔ سنبل کا درخت ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

اچانک خاموش فضا میں قدموں کی چاپ ابھری..... نکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مشابہ سرگوشیاں یکلخت تھم گئیں۔ ہر آواز سو گئی..... آنے والا ایک باوقار شخص تھا۔ قیمتی لباس، اس کے باوجود شخصیت اور شانوں پر دھری بلیک شال..... اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ رسیوں میں جکڑے وجود کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی سیاہ آنکھیں اسی بے بسی پر مرکوز تھیں۔“ اب کیا کہتے ہو حیدر؟“ اس کی آواز بھی بارعب تھی۔

حیدر کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا اور لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب وہ بولا تو لہجہ اس کی جسمانی حالت کے برعکس تخفیف نہیں تھا۔ ”وہی جو پہلے کہتا تھا۔“

”اب بھی وقت ہے حیدر، معافی مانگ لو جان بچالو۔“

”محبت کرنا ہی انسان کا ”حق“ ہے مہر داد آفریدی اور حق کے لئے معافی نہیں مانگی جانی، اس کی جنائی نظریں مہر داد کے چہرے پر گڑی تھیں۔

”بہت ڈھیٹ ہو۔“ مہر داد کی سیاہ آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

”اے مستقل مزاجی کہتے ہیں مہر داد آفریدی۔“ اس نے گویا تصحیح کی تھی اور مہر داد آفریدی کا تن بدن سلگ اٹھا تھا۔ ”اے یہیں پڑا رہنے دو۔ اگلے ایک ماہ تک اس جگہ کے قریب نہیں پھٹکے گا، اسی طرح مرنا ہی اب اس کا مقصد ہے۔“ مہر داد کی آواز میں رعد کی کڑک تھی۔

”مقصد لکھنے والا اللہ ہے کفر مت بکو۔“ اس کی بات پر سناٹا چھا گیا۔

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مہر داد کے سامنے آنکھ بھی اٹھاتا، کجا کہ ایک عام سے ”کمی“ نے..... ”اللہ ہی نے تمہارے مقدر میں یہ لکھا ہے۔“ مہر داد پھنکارا۔

”تو پھر اللہ نے تمہارے مقدر میں بھی یہی لکھا ہوگا، کیونکہ وہ واحد منصف ہے جو واقعی ”انصاف“ کرتا ہے۔ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ جو مہر داد کو مزید بھڑکا گیا۔

”سب دفع ہو جاؤ یہاں سے، اگر کوئی اس کے قریب بھی پھٹکا، اس کا حشر اس جیسا ہی ہوگا۔ اس کا سرد لہجہ بھی کوہرا ساں کر گیا تھا۔ اور محض ایک منٹ بعد وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ مہر داد نے ایک قہر آفریں، زہر خندنگاہ حیدر پر ڈالی اور اپنے کارندوں کو ہاتھ سے اشارہ کر کے پلٹ گیا، کارندے بھی مودب ہو کر اس کی تقلید میں چل پڑے، اب وہاں صرف اور صرف حیدر تھا۔

لیکن نہیں..... وہاں کوئی اور بھی تھا..... جو حیدر کی بے بسی سے، اس کی مشکل سے واقف تھا اور اس کی مشکل دور کرنے پر قادر بھی تھا۔ ”اللہ! میں تجھ سے انصاف طلب کرتا ہوں، ویسے تو میں جانتا ہوں کہ میرے حال کی خبر تجھے مجھ سے بھی زیادہ ہے اور تو میرے بنانا ننگے بھی انصاف کرے گا لیکن میں تجھ سے مانگ اس لئے رہا ہوں کہ یہ تیرا حکم ہے کہ مجھ سے مانگو، میں دوں گا، اگر تو میری مدد نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا، بے شک تو ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور جلدی مدد کرنے والا ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

جب ہم سب مشکل میں از حد اذیت میں، بے حد کرب میں ہوتے ہیں تو لاکھ تڑپنے کے باوجود، یہ احساس کہیں دل کی گہرائیوں کو تقویت دیتا ہے کہ ہم اکیلے نہیں..... کوئی ہے جو ہمیں دیکھ رہا ہے، کوئی ہے جو ہماری اس حال، اس تڑپ، اس اذیت سے واقف ہے۔ جس اذیت کے دوزخ کی صورت الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اس سے بھی بخوبی واقف ہے اور وی ہے، واحد وہی ہے جو اس تکلیف کو ختم کر سکتا ہے، یہ احساس اور ”آس“ بن کر ہمیں دلاسا دیتا ہے۔ ہمارے ضبط کا حوصلہ بڑھاتا ہے، اگر یہ آس بھی نہ رہے تو..... پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ لیکن اللہ کی ذات سے مایوس کھڑا ہے۔ اللہ اپنے پکارنے والے کی مدد ضرور کرتا ہے جلد یا بدیر..... لیکن وہ انسان کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا ہے۔ وہ



ہے وہی ہے جو اچھے، برے ہر ایک کو دیتا ہے، بالا  
تفریق نوازتا ہے، یہی حقیقت حیدر کے ایمان میں تھی۔

☆.....☆.....☆

مہر داد آفریدی سے چھوٹا مہروز تھا اور اس سے  
چھوٹی مہر گل..... اس کے والد مہران آفریدی اپنے  
علاقے کی ایک بارسوک شخصیت تھے۔ اتنے بارسوخ  
کہ ارد گرد کی ساری معزز شخصیات ان سے دہتی تھیں،  
مہرینہ ان کی چچا زاد بھی تھیں، اور ان کو بھی وراثت میں  
کافی زمین ملی تھی، یوں مہران آفریدی سب سے  
بڑے زمین دار تھے، مہر داد پہلا بیٹا ہونے کی وجہ سے  
ان کا لاڈلا تھا اور مہروز اور مہر گل سے زیادہ توجہ اور محبت  
ملتی تھی وہ بچپن ہی سے باپ کے ساتھ زیادہ رہا تھا۔  
اسکول سے آکر اس کا زیادہ وقت مہران کے ساتھ ہی  
گزرتا تھا۔ گاؤں میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی  
جاسکتی تھی جو لوگ آگے جانا چاہتے تھے۔ ان کو اس کی  
اجازت نہیں ملتی تھی، ویسے بھی ان ”کمی کیوں“ نے  
زیادہ پڑھ لکھ کر کرنا بھی کیا تھا؟

تعلیم تو صرف جاگیرداروں کا حق تھی، وقت گزرتا  
رہا، مہر داد اور مہروز دونوں ہی شہر میں رہنے لگے،  
دوسرے، تیسرے دن مہر داد گاؤں کا چکر لگاتا تھا، آخر  
کو وہ سب اس کو سنبھالنا تھا، مہر گل نے محض بی اے  
کرنے کو کافی سمجھا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی، جیسا کہ مہران  
خان آفریدی کی بیٹی اور مہر داد کی بہن کو ہونا چاہئے تھا۔  
یعنی ایک خود سر، مغرور اور اوروں کو خود سے کمتر سمجھنا۔

گاؤں کی ہر لڑکی اس سے تنگ تھی کہ وہ بلا وجہ  
سب کو جی بھر کے ڈانٹتی تھی۔ پھر وقت نے ذرا سا کسمپا  
کر کروٹ لی اور مہران خان وقت کی گرد میں گم ہو گیا،  
باپ کی گدی بڑے بیٹے نے سنبھال لی۔ جس طرح  
مجنوں کو اگر صحراؤں سے لا کر شہر میں چھوڑ دیا جاتا، وہ  
تب بھی ”مجنوں“ ہی رہتا، اسی طرح مہران کے مرنے  
اور مہر داد کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ مہر گل نے  
باپ کی وفات کا بہت اثر لیا تھا۔ کیونکہ وہ باپ کی لاڈلی  
تھی۔ اگرچہ اسے وہ توجہ نہیں ملتی تھی مگر مہروز سے پھر بھی

اسے زیادہ اہمیت ملی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ یونہی ٹہلنے کی غرض سے اپنے دل کو  
بھلانے کے خیال سے باغ میں چلی گئی۔ شفاف  
دھوپ مالنے کے درختوں پر، بکھری ہوئی تھی۔ ہوا  
ساکت تھی۔ سناٹا ہر طرف اپنے پر پکپکائے ہوئے  
تھا۔ باغ میں ہو کا عالم طاری تھا۔ مالٹوں کی ترش مہک  
سارے میں پھیلی تھی، وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر  
کھڑی ہو گئی، حیدر ایک درخت سے نیچے اتر رہا تھا، وہ  
درختوں پر چڑھ کر خراب پھل اتار رہا تھا اور اب نیچے  
اترتے ہوئے اس کی نگاہ اس حسن کے مجسمے پر پڑی اور  
ساکت ہو گئی..... پھر نگاہ پلٹ کر نہیں آئی۔ ان پر  
قربان ہو گئی ہوگی۔“

اور نگاہ جب قربان ہوتی ہے تو سمجھو کہ ”سب  
کچھ“ قربان ہو جاتا ہے۔ اس نے خود کو اس غیر  
اختیاری حرکت سے باز رکھنا چاہا، مگر اس کی نگاہیں تو  
پلکیں تک جھپکنے کو تیار نہ تھیں وہ لاکھ کوشش کے باوجود  
نگاہیں پھیر نہ پارہا تھا اور جب ”نگاہ“ ہاتھ سے گئی تو  
”دل“ میں ہاتھ سے گیا..... اور جب ”دل“ ہاتھ سے  
گیا، تو پھر..... ”سب“ ہاتھ سے گیا..... پھر کچھ بھی  
ہمارے اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ کیونکہ..... اگر ہم  
دل سے جیت جائیں، تو ہم پوری دنیا سے جیت جاتے  
ہیں، لیکن..... اگر ہم اپنے ہی دل سے ہار جائیں، تو  
پھر ہم سب ہار جاتے ہیں۔

حیدر بھی صرف نگاہ سے نہیں ہارا تھا۔ وہ پوری  
کائنات ہار گیا تھا۔ مہر گل کو خدا نے حسن کی دولت سے  
بھی خوب نوازا تھا۔ یہی تو زندگی کی حقیقت ہے۔ کسی کو  
اللہ ”دے“ کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر..... یہی تو  
اصل آزمائش ہے۔ کچھ لوگ پا کر بھی اللہ کے ناشکرے  
ہی رہتے ہیں اور کچھ سب کچھ کھو کر بھی اللہ کا شکر ادا  
کرتے ہیں۔

”کیا بات ہے؟“ مہر گل کی آواز میں  
ناگواری تھی۔



”کک..... کچھ نہیں۔“ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ یہ تھی اس کہانی کی شروعات۔

☆.....☆.....☆

”میں رنگ شربتوں کا، تو میٹھے گھاٹ کا پانی..... مجھے خود میں گھول لے تو..... میرے یار بات بن جانی.....“ مہرگل زیر لب گنگتا رہی تھی۔ چارہ لے جاتے حیدر کے قدم ٹھنک کر رہ گئے تھے۔ اس کی نگاہ اٹھی تھی اور پھر حسب معمول پلٹنا بھول گئی تھی۔ ”اے..... ادھر آؤ۔“ مہرگل نے ناگواری سے اس کو پکارا تھا۔

حیدر کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔ چارے کا گٹھا وہیں رکھ کر اس نے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ”تم مجھے گھورتے کیوں ہو؟“ اس نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

”میں گھورتا نہیں، دیکھتا ہوں جی!“ اس کی نظریں مہرگل کے چہرے پر گڑی تھیں، جیسے اس سے اہم کوئی کام ہی نہ ہو۔ ان نظروں میں محبت تھی، عقیدت تھی اور..... پرستش تھی۔

”کس نے حق دیا تمہیں، مجھے یعنی مہرگل کو دیکھنے کا؟“ لہجے میں غصے کی آنچ تھی۔

”میرے دل نے..... میری محبت نے۔“ کیسی ہمت، جرأت اور مزے سے وہ ”اعتراف جرم“ کر رہا تھا۔ یوں کہ چہرے پر ندامت کا شائبہ تک نہ تھا۔

”کیا..... آ.....؟“ وہ تحیر سے چلائی۔

”جی۔“ وہ ابھی بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم جانتے ہو، تم یہ بکواس کس سے کر رہے ہو؟ دفع ہو جاؤ ادھر سے اور آئندہ اپنی نظروں کو سنبھال کر رکھنا، ورنہ ”کچھ بھی“ دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔“ مہرگل کی سیاہ آنکھوں میں طیش تھا۔

حیدر جانتا تھا، وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے، اسے دیکھنا واقعی اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی آنکھیں نکالی جاسکتی تھیں، لیکن کیا کیا جائے، یہی تو المیہ ہے چاہت کا کہ یہ ہمیشہ ”وہیں“ ہوتی ہے، جہاں اسے ”ہرگز بھی نہیں“ ہونا چاہئے۔

”میں آپ کے علاوہ کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔“

وہ مسکرایا تھا اور اس کی یہ مسکراہٹ مہرگل کے اندر آگ بھڑکا گئی تھی اس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ حیدر کا رخسار دھکا گیا تھا۔

اور عین اسی لمحے..... ایک آواز ابھری تھی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“ مہر داد نے کب وہاں آیا تھا۔

”لالہ!..... یہ بدتمیزی کرتا ہے۔“ اس نے حیدر کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

”تیری اتنی ہمت.....؟“ مہر داد کی بھرپور ٹھوکر اس کے پہلو پر پڑی تھی، وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔

”چلو معافی مانگو۔“ مہر داد کے خاص آدمی راشد نے لاٹھی کا دار اس کی کمر پر کیا تھا۔

”کس بات کی معافی؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور اگر یہ جرم ہے بھی تو مجھے اس پر فخر ہے۔“ وہ مسکرایا تھا اور راشد مہر داد کے اشارے پر اس پر پل پڑا۔

☆.....☆.....☆

حیدر کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، سوائے اللہ کے، ماں اسے پیدا کرتے ہی چل بسی، دو سال کا ہوا تو باپ کو سانپ نے ڈس لیا، موت کے مختلف روپ ہوتے ہیں اور اس کا ہر روپ اذیت ناک ہوتا ہے۔ جیسے..... جیسے زندگی کے کئی روپ ہوتے ہیں اور اس کا ہر روپ ہی اذیت ناک اور دلفگار ہوتا ہے..... زندگی نے حیدر کو بھی بڑی بے دردی سے برتنا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے بستی کی ایک بیوہ عورت نے گود لے لیا۔ وہ بے اولاد تھی۔ وہ خان حویلی میں ملازم تھی..... اس نے حیدر کو پالا تو سہی، مگر اسے پڑھانا نہ سکی، بمشکل کھانا ہی پورا ہوتا تھا۔ یوں حیدر دیگر لوگوں کی طرح واجبی سی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ اسے بچپن ہی سے کام پر لگا دیا گیا اور وہ پندرہ برس کا تھا تو اس کی واحد ہمدرد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ بے سہارا ہونے کے ناطے زندگی اس کے لئے مزید مشکل ہو گئی۔ اب اس کا اللہ کے سوا کوئی نہ تھا اور اسے اپنے اللہ پر کامل یقین تھا اور یہ ”کامل یقین“ ہی دراصل ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ اللہ کے ساتھ ہونے کے احساس..... کتنی تقویت دیتا ہے نا! خیر..... اب پانچ



برس مزید گزر چکے تھے۔ اس دوران حیدر زندگی کی تلخیوں کا عادی ہو چلا تھا۔

لیکن..... گزشتہ دنوں اسے محبت نامی عنفریت نے جکڑا تھا اور آج..... آج وہ سنبل کے کھر درے تنے سے بندھا مر رہا تھا۔ پل پل مر رہا تھا..... اوہ.....! یہ زندگی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے نا! اور محبت زندگی سے بھی بدتر..... بلکہ بدترین..... لوگ موت کو سفاک کہتے ہیں جبکہ محبت..... موت سے بھی کہیں سفاک ہے۔

موت ایک بار مارتی ہے۔ محبت بار بار..... ہر سانس میں، سانس سانس میں پل پل مارتی ہے۔ موت سانسیں نچوڑ لیتی ہے، محبت سانسوں میں صحرائی کانٹے، خشک ریت بھر دیتی ہے..... زندگی اور موت کے بیچ لٹکائے رکھتی ہے۔ نہ جینے دیتی ہے، نہ مرنے دیتی ہے، ہر پل..... پل پل ”جانکی“ میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ سانس ہمیشہ حلق میں اٹکی رہتی ہے، کسی سخت، نوکیلے پتھر کی طرح حلق میں پھنسی، چبھتی رہتی ہے، جسے نہ تو اگلا ہی جاسکے، نہ نگلا..... موت تو جانکی کی اس کیفیت سے، اس اذیت سے نجات دیتی ہے، اس نے خلق میں پھنسی سانس کی خشک ریت سے گھبرا کر آنکھیں موند لیں، لیکن..... جو اذیت ”اندز“ ہو، اس سے تو کسی طور نظریں نہیں جرائی جاسکتیں..... جانکی کی کیفیت سے گھبرا کر اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پیاسی ترسی ہوئی نگاہ آسمان پر گڑی تھی، جس کی رنگت کملا کر گول ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے ہجر میں چپکے سے مر گئے ہم تھی کمال وابستگی دل کو ہی آدمی کے ساتھ گرجتے کچھ دن اور تو دکھاتے نبھا کر بھی وہ زندگی کی بات تھی، گئی زندگی کے ساتھ ”حیدر مر گیا بی بی جی۔“ سا جھمی کی بات پر مہر گل کا پاپ کارن کھاتا ہاتھ لمحہ بھر کو تھما۔ ”میں آپ کے سوا کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔“ اس سرگوشی سے سچائی

مترشح تھی۔ ”اونہہ.....“ اس نے سر جھٹک کر کرٹل باؤل میں دھرے پاپ کارن سے منٹھی بھر لی۔

”اس کی لاش بہت بری حالت میں تھی جی! کھال ہڈیوں سے یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے اسے مرے لمبا عرصہ ہو گیا ہو۔ اور.....“

”بکو اس بند کرو۔“ وہ اس کی بات قطع کرتی چلا اٹھی۔ ”وہ اس قابل تھا۔ اپنی اوقات بھول گیا تھا وہ اور اوقات بھول جانے والے اسی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔“ وہ سا جھمی کو گھور کر وہاں سے تنہا ہوتی چلی گئی۔ اسی وقت تقدیر مسکرائی تھی..... اور تقدیر کی یہ مسکراہٹ استہزائیہ تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج ڈوب رہا تھا۔ مغربی سمت افق پر گویا کسی نے لہو چھڑک ڈالا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ لیکن اس شور پہ بھی ایک ویرانی، ایک خالی پن، ایک اداسی حاوی تھی۔ تاہم اس اداسی، اس خالی پن اور اس ویرانی کو صرف وہی لوگ محسوس کرتے ہیں، جن کے اپنے دل میں اداسی نے نیچے گاڑ رکھے ہوں، خالی پن نے جن کی اپنی تمام تر خواہشیں، تمام چاہتیں نچوڑ لی ہوں، ویرانی جن کی روحوں میں بسی ہو..... رنگ و بو کی روشن دنیا کے کینوں کو بھلا یہ سب کہاں محسوس ہوتا ہے؟ وہ دونوں ہاتھ پیٹ کی جیبوں میں پھنساے، سر جھکائے، چل رہا تھا۔ اس کی چال میں صدیوں کی تھکن تھی اور چہرہ..... اندرونی پریشانی کا غماز.....

ایک نسوانی چیخ اس کی سوچوں کے ارتکاز کو ایک دم بھٹکا گئی۔ اس نے چونک کر ارد گرد کو نگاہوں سے کھنگال ڈالا، تبھی اس کی نگاہ نے ایک ریشمی وجود کو چھوا..... وہ ایک سفیدے کے تنے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے لڑکی کے پاس پہنچنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ لڑکی سے ذرا فاصلے پر ایک دھاری دار ناگ کندلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا، ہاتھ بڑھایا اور ناگ کو ایک جھٹکے سے جکڑ لیا، اس نے ناگ کو کوڑے کی طرح



لہرایا اور ہاتھ گھما کر دور پھینک دیا۔ ”چلے! میں آپ کو گھرتک چھوڑ دوں۔“

لڑکی کی ڈری ڈری سی کیفیت دیکھ کر اس نے کہا۔ ”جج..... جی!“ وہ ایک طرف چل پڑی۔ اس کا خوف قدرے زائل ہوا تھا۔ ”آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“ لڑکی نے یقیناً اس کو مخاطب کیا تھا۔

”جی میں یونہی گھومتے گھومتے ادھر آ نکلا، ویسے مجھے احمر کہتے ہیں۔“

”میں مہر گل ہوں۔“

”میں اکلوتا ہوں، پاپا! بزنس مین ہیں، لیکن میں ابھی فارغ ہوں۔“ وہ اسے اپنے بارے میں مزید بتانے لگا۔ مہر گل کی حویلی تک پہنچنے تک دونوں پرانے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ کل پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہو گیا۔

مہر گل گھر میں داخل ہوتے وقت احمر ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بلا کی سحر انگیز شخصیت رکھتا تھا وہ چھا جانے والی شخصیت..... پرکشش لب و لہجہ مخاطب کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا تھا۔

اگلے چند دن میں وہ تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ گویا دنوں کا نہیں، برسوں کا ساتھ ہو، ہوتے ہیں نا کچھ لوگ ایسے کہ جن سے مل کے لگتا ہے کہ یہ تو ہمارے اپنے ہیں، اور دل کا کوئی گوشہ جو ہمیشہ سے خالی تھا، ان کے آنے سے وہ خلا بھر گیا ہے، کچھ ایسا ہی مہر گل کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن وہ مطمئن بھی تھی کہ احمر کو پالے گی۔ وگرنہ اس سے جدائی کا احساس ہی اس کی سانسیں اٹکائے دیتا تھا۔ ان دنوں گھر میں اس کی شادی کی باتیں چل رہی تھیں۔ تین چار رشتے بھی زیر غور تھے۔ مگر..... ظاہر ہے فیصلہ اس کی اپنی مرضی سے ہونا تھا اور اسے یقین تھا کہ مہر داد لالہ کو احمر پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ احمر کے والد کا بزنس بیرون ممالک میں بھی پھیلا تھا۔ فیملی بھی اچھی، غرض ہر لحاظ سے وہ ان کے ہم پلہ تھا۔

☆.....☆.....☆

جب کبھی زخم اتنے گہرے ہوں کہ جن کی گہرائی کا ہمیں خود بھی اندازہ نہ ہو، ان کے لئے سچائی کسی کام کی نہیں..... ان زخموں کو بھرنا ہی نہیں ہوتا، پھر ہم لاکھ کوشش کرتے پھریں، وہ زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ صدیوں بعد بھی ”تازہ“ رہتے ہیں۔

”احمر!“ اسے مہر گل کی آواز سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔ اس نے بغور مہر گل کے پرکشش چہرے کو دیکھا تھا۔ یہ چہرہ، یہ چہرہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ سیاہ..... تاریک..... بے حد تاریک سمندر کی سی آنکھیں اس کے لئے بے حد ”اہم“ تھیں۔ پہلی بار جب اس نے مہر گل کی سیاہ آنکھوں کو سیاہ سمندر سے تشبیہ دی تھی تو وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

”احمر، مہر داد لالہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

مہر گل کی نظریں زمین پر گڑی تھیں، ورنہ احمر کے چہرے کا اتار چڑھاؤ یقیناً دیکھ لیتی۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ یعنی اب وقت آ گیا تھا۔ یعنی اب ”اصل“ وقت آ گیا تھا..... ”مم..... میں..... تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا بولا تھا۔

مہر گل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا..... یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ ”کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟“ اس کے لہجے میں حیرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

”کرتا ہوں، میں نے اگر دنیا میں، اپنی زندگی میں کسی سے محبت کی ہے، تو وہ صرف مہر گل ہے۔“ اس کے انداز میں، اس کی آواز میں، اس کے لہجے میں، اس کی آنکھوں میں اور..... اس کے چہرے پر ”سچ“ رقم تھا.....

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر شادی نہیں کرنا چاہتے، لیکن کیوں.....؟“ مہر گل کی سوالیہ نظروں کا مرکز احمر کا چہرہ تھا۔

”جس سے محبت ہو، ضروری تو نہیں کہ اس سے



شادی بھی ہو جائے۔“ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

”لیکن یہ ممکن ہے احمر!“ وہ پر یقین تھی۔

”یہ ممکن نہیں۔“ وہ جواباً چلایا تھا۔

”تو پھر میں مہر داد لالہ کی مرضی سے شادی

کر لوں؟“

”ہرگز نہیں“ وہ بے ساختہ بولا تھا۔

”تم کسی اور کو کیسے قبول کر سکو گی؟“ وہ ٹھیک کہہ

رہا تھا وہ واقعی اور کسی کو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر شادی نہیں کرنا

چاہتے، میں کسی اور سے شادی کروں، یہ بھی نہیں

چاہتے، تو پھر آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ جھلا اٹھی، اس کی

سیاہ آنکھیں اب پانیوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔

”میں کیا چاہتا ہوں؟ میں چاہتا ہوں مہر گل

آفریدی! کہ.....

اللہ کرے! جہاں کو میری ”یاد“ بھول جائے

اللہ کرے! کہ ”تم“ کبھی ”ایسا“ نہ کر سکو

”میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو“ ”آرزو“

”میرے سوا“ کسی کی ”تمنا“ نہ کر سکو.....

”کیا مطلب؟“ وہ نہیں سمجھی تھی۔ وہ واقعی کچھ

نہیں سمجھی تھی۔ ”مطلب صاف ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ

تم ہر وقت، ہر لمحہ، ہر دھڑکن، ہر سانس صرف اور صرف

مجھے سوچو، صرف اور صرف مجھے چاہو۔“ خواہش شدید

ترین تھیں اور آنکھیں مصر تھیں کہ ایسا ہی ہو.....

”تو احمر ایسا تو ہو چکا ہے، ہر وقت ہر لمحہ میری

سوچ تمہارے ہی خیال کا طواف کرتی ہے، میری ہر

دھڑکن، ہر سانس تمہارے ہی نام کا ورد کرتی ہے احمر!“

وہ سر جھکا کر اعتراف کر گئی۔ لہجے میں بھرپور بے بسی

تھی۔ ”احمر نہیں مہر گل! حیدر۔“ اس نے مہر گل کی

سماعتوں میں ”صور“ پھونکا تھا اور صور پھونکنے جانے

کے بعد تو قیامت ہی آتی ہے۔ سو..... ”کک کیا؟“

اس کا انداز ڈرا ڈرا سا تھا۔ اس نے دیکھا اور..... اور

دیکھتی ہی رہ گئی۔

احمر کا چہرہ حیدر کے چہرے میں ڈھل چکا تھا۔ اس

کی سرسئی آنکھیں حیدر کی بھوری آنکھوں میں تبدیل

ہو چکی تھیں۔ اس کی گلابی مائل سفید رنگت حیدر کی گندمی

رنگت میں مدغم ہو چکی تھی اور اس کی فرنیچ کٹ، حیدر کی

چند دن کی بڑھی ہوئی شیو میں..... اس کے سامنے احمر

نہیں، حیدر تھا.....

وہ حیدر جو کہ مہینوں قبل مر چکا تھا۔

”ت..... تم؟“ بے یقینی اس کے لہجے میں

بکھری تھی۔

”ہاں مہر گل..... میں حیدر..... وہ حیدر..... جو

آج سے چھ ماہ، ستائیس دن پہلے مر چکا ہے اور جس

کے مرنے سے تمہیں ذرا بھی..... ذرہ بھر بھی فرق نہیں

پڑا تھا۔“ اس کے انداز و آواز میں، لہجے میں عجیب سا

درد اتر آیا تھا۔ ”ہم جس کے لئے جان سے گزر جائیں

اور وہ لمحہ بھر بھی ہمارے بارے میں نہ سوچے، درد تو ہوتا

ہے نا!“ وہ اس کے شفاف چہرے پر نگاہ جمائے بول رہا

تھا۔ اس چہرے پر جہاں حیرت میں اب شکست و

ریخت مدغم ہو رہی تھی۔ ”میں نے ہمیشہ صبر کیا..... اور

میں نے سنا تھا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

صبر کا اجر وہ خود کہتا ہے، کب حساب دوں گا اور میں نے

مہر گل!..... میں نے اس سے صبر کا اجر مانگا..... اپنی

مرضی سے مانگا..... اور اس نے مجھے اجر دیا..... جب ہم

مزدوری کرتے ہیں تو اجر ہمارا حق ہے۔ اسی طرح

جب ہم صبر کرتے ہیں، تو اجر ہمارا حق ہے، یہ اور بات

کہ یہ اجر ہمیں جلدی اس دنیا میں ملے، یا پھر.....

آخرت میں، روز محشر..... بات پھر وہی کہ جتنا زیادہ

صبر، اتنا زیادہ اجر۔“ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ اس کی

آنکھیں پہاڑوں سے اوپر..... کہیں دور مرکوز تھیں۔

اس کے لہجے کے گرد اذیت دھیرے دھیرے حصار

باندھ رہی تھی..... بھوری آنکھوں کے ”خالی پن“ کی

تہوں میں ہولے ہولے کرب کروٹیں لینے لگا تھا۔ مہر

گل دم بخود تھی.....

☆.....☆.....☆

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، محبتوں کے لئے



کیفیت کو صبر کہتے ہیں۔ ہر دکھ، ہر تکلیف کے وقت یہ خیال ذہن و دل میں ہو کہ ”اللہ دیکھ رہا ہے اور وہی ہے جو ”قادر“ ہے۔ اگر اس نے اس دکھ کو ہمارے مقدر میں لکھا، تو یقیناً اس میں ہماری ہی بھلائی ہوگی۔ یہ دکھ اللہ کی رضا سے ہمیں ملا ہے اور..... اللہ اگر ہم سے یہ چاہتا ہے تو بلا شک وہ ہمارے ہی بھلے کے لئے ہے۔ ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، اللہ سے نہیں بھاگ سکتے اور کیا کوئی ایسا ہے جو اللہ کے مقابلے میں ہماری مدد کر سکے؟ ہرگز نہیں..... تو پھر لوگوں کے آگے حالات کا رونا رونے کا فائدہ.....؟

لوگوں کے آگے رونے والے ”رسوائی“ پاتے ہیں اور ”اللہ“ کے آگے رونے والے ”بھلائی“ پاتے ہیں۔ ہر دکھ اللہ سے کہو، رونے کے لئے ”سجدے“ سے بہتر کوئی جگہ نہیں..... دکھ زیادہ ہوں، تو آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی چھلک پڑتے ہیں، مگر آنسوؤں کے درمیان اللہ سے شکوے نہیں کرنے چاہئیں..... صرف اس سے مدد اور صبر مانگنا چاہئے۔ وہ واحد ہے جو اپنے در سے کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا..... اس کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری دعاؤں کو قبولیت بخشے گا۔

ارشاد ربانی ہے۔ ”تم دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔“ تو کیا اللہ بھلا اپنے وعدے سے پھر سکتا ہے؟ ناممکن..... ہاں! قبولیت کی صورتیں مختلف ہیں۔ یا تو دعا اسی وقت قبول کر لی جائے گی یا اس کے بدلے میں کوئی سانحہ، کوئی حادثہ ہم سے ٹال دیا جائے گا، یا پھر وہ دعا آخرت کے لئے ذخیرہ کر لی جائے گی۔ جس کے بدلے میں اس دن..... یعنی یوم حساب، ہمارے گناہ مٹا دیئے جائیں گے۔

غرض دعا کی قبولیت میں جس قدر تاخیر..... اسی قدر فائدہ..... دعا قبول نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اللہ برتر نے اسے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ بے شک اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا.....“

میں نے بھی ہمیشہ اسی بات کو ذہن میں رکھا۔ پھر

خود کو ترستے ہی پایا۔ وہ عورت جس نے میری پرورش کی، سب سمجھتے ہیں کہ اس کا رویہ میرے ساتھ محبت و شفقت آمیز تھا۔ مگر..... یہ غلط ہے۔ حقیقت صرف خدا جانتا ہے کہ اس نے مجھے صرف اس لئے اپنے پاس رکھا کہ اسے کسی کام کرنے والے کی ضرورت تھی۔ اور میں نے باہر کے علاوہ گھر کا بھی ہر کام کیا..... اس کے باوجود ڈانٹ پھٹکار اور مار ہی میرے حصے میں آئی۔ بات بات پر مفت روٹیاں توڑنے کا طعنہ..... میں نے کئی بار گھر سے بھاگ جانے کا سوچا، مگر پھر یہ سوچ کر صبر کیا کہ میں اگر اس حالات کی ماری عورت کا غصہ سہ لوں گا تو مجھے اللہ کا غصہ نہیں سہنا پڑے گا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ جو حالات کے پھیڑے، وقت کے طمانچے کھاتا ہے، اسے اللہ رب العزت کا غصہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ اسے اللہ کا غضب نہیں جھیلنا پڑتا..... اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، وہ جو سب سے بلند، سب سے بڑا، سب سے قوی ہو، کیا ہم سے کوئی بھی اس کے غضب، اس کے غصے کا ایک ذرہ سہنے کی بھی طاقت ہے؟..... نہیں..... ہرگز ہرگز نہیں..... ہم سب مل کر بھی اس کے غضب کا ایک ذرہ سہنے کی طاقت نہیں رکھتے اور اگر ہم وقت کی ”بے رحمی“ حالات کی ستم ظریفی جھیل چکے ہوں، تو پھر اللہ کی رحمت ہمارا حق ہے۔ وہ جو بے حد رحیم ہے۔ رحمان ہے۔ کریم ہے..... اس کی رحمت بے پناہ ہے۔ ہماری سوچ کی حدود سے بھی کہیں بالاتر.....

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جو حالات کی بے رحمی، زمانے کی بے رحمی سہہ چکا ہو، اللہ اس پر ”رحم“ کرتا ہے۔ لیکن..... شرط صرف یہ ہے کہ وہ وقت و حالات و زمانے کی بے رحمی کا ”واویلا“ نہ کرے۔ بلکہ اس پر ”صبر“ کرے..... رونا چلانا، حالات کے شکر کرنا، زمانے کی بے نیازی کے گلے، اور جب ایسا کر کے بندہ تھک جائے تب چپ ہو جانے کو صبر نہیں کہتے..... رو کر چلا کر تو ہر کوئی چپ ہو ہی جایا کرتا ہے۔ کیونکہ چپ ہونا ہی پڑتا ہے۔ صبر وہ ہے جو ”خاموش“ رہ کر کیا جائے۔ ہر دکھ، ہر زیادتی، ہر ستم کو چپ چاپ ”پی“ جانے کی



میری منہ بولی ماں مر گئی..... میں انسانوں کے بیچ اکیلا رہ گیا۔ وہ بے شک مجھ سے لڑتی تھی مگر پھر بھی وہ میرے لئے سایہ تھی۔ میں نے خان حویلی کے مکینوں کے طنز، طعنے، نشتر، گالیاں اور پٹائی سہی..... جو ذرا سی بات پر..... پھر میری زندگی میں تم آ گئیں..... میں نے تمہیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس دن پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ محبت گھات زدہ شکاری کی طرح جست لگا کر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی اور چھپ کر، گھات زدہ اور ہمیشہ ناقابل تلافی ہوا کرتا ہے..... اس وار سے ہم ”بیچ“ بھی نہیں سکتے..... کیونکہ یہ وار ہمارے ”وہم و گمان“ کی سرحدوں سے بھی کہیں پرے ہوتا ہے..... میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے کبھی تمہیں پانے کی تمنا نہیں کی۔ بس صرف اتنا چاہا کہ کبھی تمہیں دیکھ لیا کروں اور تمہارے دل میں تھوڑی سی جگہ.....

پھر کیا ہوا؟ مجھے عالم بے بسی میں سنبھلنے سے متصل کر دیا گیا۔ پیاس، بھوک، نقاہت، اور مزید احساس کہ جس ہستی کے لئے میں یہ سب سہنے پر مجبور ہوں، اسے میرا ذرہ بھر بھی احساس نہیں، یہ احساس موت سے پہلے ہی ہمیں مارتا ہے اور پل پل مارتا ہی رہتا ہے، یہ احساس کہ ہماری ہر سانس، ہر دھڑکن کا جس کے نام کا ورد کرتی ہے، اسے ایک پل کی فرصت نہیں ہمارے لئے..... ہم جس کے لئے ”زندگی“ گنوا کر موت قبول کر رہے ہیں اس کی زندگی کا ایک پل بھی ہمارا نہیں، بہت تکلیف دیتا ہے یہ احساس..... لیکن بعض اوقات ہم کسی عام سے انسان کو کسی ”دیوتا“ کا درجہ دے کر مسلسل اس کی پرستش کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم نے اس کو ”دیوتا“ بنایا ہے تو ہم کو اس دیوتا کا ”قہر“ بھی سہنا پڑے گا۔ بھلا پتھر کے مجسمے کب کسی درد کو محسوس کر پاتے ہیں؟ میں نے بھی تمہیں دیوی بنایا اور نتیجتاً وہی ہوا جو ہونا تھا.....

جب میں مر رہا تھا..... اس لمحے اس آخری لمحے میں نے اللہ سے اپنے صبر کا اجر مانگا..... میں نے اپنے صبر کا اجر اس صورت میں مانگا کہ اس دیوی کو پتھر سے پگھلا

کر..... انسان بنادے..... درد کو محسوس کرنے والا انسان..... اور جب میں مر رہا تھا تو یہ احساس موت کو مزید جان لیوا بنا رہا تھا کہ میری موت کا تمہیں ذرا بھی افسوس نہیں..... تمہیں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا..... اور تمہارے اس فرق ”نہ پڑنے“ سے مجھے ”بہت فرق“ پڑا تھا..... غرض میں نے بہت تکلیف سہی..... اور یہ بھی صحیح ہے کہ جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی..... میں نے کہیں پڑھا تھا یہ جملہ اور میں نے سوچا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ مگر یہ میں جان گیا ہوں کہ ایسا ممکن ہے، مرتے وقت میں میرے ذہن میں یہ جملہ در آیا اور میں نے سوچا کہ بھلا مرنے کے بعد مجھے کیسے خوشی ملے گی..... کہ محبت کی خوشی اس بات میں ہوتی ہے نا کہ محبوب اس کی محبت میں مبتلا ہو جائے جس طرح انسان محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا، اسی طرح..... ٹھیک اسی طرح اس خواہش کو بھی نہیں نکال سکتا، یہ دونوں چیزیں فطری ہیں۔

اور بھی میرے ذہن میں آیا کہ صبر کا اجر تو ملے گا ہی، مگر اجر کی صورت تمہاری محبت مانگ لی جائے..... اور میں نے یہی کیا..... میں نے اللہ سے یہی دعا مانگی کہ میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو آرزو، میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو..... میں نے ٹوٹ کر خواہش کی کہ تمہاری سانس سانس میں میری محبت شامل ہو جائے..... میں نے اللہ سے مہلت لی..... اور احمر کے روپ میں یہاں آ گیا۔“ ہوا ہولے ہولے سرسرا رہی تھی، وقت لمحوں کی صورت بہہ رہا تھا، حیدر قدرے توقف سے پھر گویا ہوا۔ ”میں جب دوبارہ یہاں آیا تو یہ عزم لے کر آیا تھا کہ..... رسم فریاد، پھر کریں زندہ.....“ ”آؤ! پھر پتھروں کے دل چیریں۔“ اور میں نے پتھر کی ایک صورت کا دل چیرنا چاہا تھا اور پتہ ہے کیا؟ میں نے اس صورت کا پتھر دل چیر لیا..... اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ”گو کہ ہم فرہاد نہ تھے، لیکن اس کو راہ پر لائے ہیں۔“ ہم نے اس کے پتھر دل سے پیار کی نہر نکالی ہے۔“



اور کسی پتھر دل سے پیار کی نہر نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔“ وہ مسکرایا۔ وہ درد میں ڈوبی مسکراہٹ تھی، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کسی پتھر دل سے پیار کی نہر نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں مسلسل کوشش کی ضرورت ہے..... پیہم کوشش..... اور اس کوشش میں مسلسل خود اپنا لہو پینا پڑتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آبلہ کا کانٹوں پر چلنا اور چلتے ہی چلے جانا، یا پھر بنا کسی سہارے، بنا کسی ناؤ کے، خالی ہاتھ سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا..... یا پھر..... تاحد نگاہ بکھرے کانچ کے نوکیلے ٹکڑوں کو اپنی لہو لہو پوروں پر چننا..... ان سب کی منزل آسان نہیں..... کوئی معجزہ ہی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم صورت فرہاد، مسلسل کوشش سے منزل تک پہنچ تو جاتے ہیں مگر..... منزل کسی اور کا مقدر دیکھ کر اسی شیشے سے اپنی زندگی ختم کر بیٹھتی ہیں۔ حیدر پھر بھی خوش نصیب تھا کہ مرنے کے بعد ہی سہی، اس نے اپنی منزل پالی تھی، اس نے چاہا تھا کہ پتھر کی مورت ”دل“ بن جائے..... دل جو سب سے زیادہ درد محسوس کرتا ہے۔ اور پتھر کی وہ مورت قلب میں ڈھل گئی تھی..... درد محسوس کرنے والا قلب..... اور درد جب محسوس ہوتا ہے تو تکلیف تو ہوتی ہے..... اور جب تکلیف ہوتی ہے تو پل پل جان نکلتا ہونی ہے..... میں جارہا ہوں۔“ حیدر نے کہا۔

اور پھر مہر گل کا دل کسی نے تلوار کی نوک سے گھسیٹا۔ ”مجھے..... چھوڑ کر مت جاؤ۔“ وہ سر اپا التجا بن گئی۔ جانے والے کو مگر جانا تھا.....

”تم جانتی ہو، اب یہ ممکن نہیں۔“ اس نے پلکیں کرب سے پچی تھیں۔

”لیکن میں کیسے رہوں گی؟“ وہ ہراساں تھی۔ جن سے محبت ہو، جو ہر سانس میں شامل ہوں، جو خون بن کر شریانوں میں دوڑتے ہوں، جو روح کی گہرائیوں میں بستے ہوں، جن سے جدائی کا تصور ہی سانسوں میں ”دوزخ“ دہکا دے، ان کے بغیر رہنا پڑے تو یہی حالت ہوا کرتی ہے..... سانس پھر ہمیشہ حلق میں صحران کی

خشک ریت بن کر اٹکتی رہتی ہے..... جیسے کوئی حلق میں نوکیلا پتھر پھنسا دے۔ لیکن..... درحقیقت سانس ہی نوکیلا پتھر بن جاتی ہے۔ اور ”جانکئی“ کا یہ عالم..... آخری سانس تک طاری رہتا ہے، اور سانسوں پہ بھاری رہتا ہے.....

لوگ موت کو سنگدل اور سفاک کہتے ہیں، لیکن مہر گل! موت تو بہت مہربان شے ہے۔ یہ تو زندگی کی تلخیوں سے نجات دلاتی ہے اور لوگ محبت کو ایک خوب صورت اور دلفریب شے سمجھتے ہیں، مگر..... درحقیقت محبت تو موت سے بھی سفاک ترین ہے۔

موت ایک بار مارتی ہے اور محبت آخری سانس تک، ہر سانس میں بار بار مارتی ہے، ہمیشہ جانکئی میں مبتلا کئے رکھتی ہے..... ایسے میں انسان بے اختیار موت کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن دراصل وہ نجات چاہتا ہے۔ بھلا جانکئی سے کون نجات نہ چاہے گا؟ محبت صبر کرنا سکھاتی ہے اور صبر بہت اچھی شے ہے۔ صبر اللہ کے پیاروں کا شیوہ ہے۔

جو صبر کرتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ صبر کا اجر اس قدر زیادہ کیوں ہے؟ اور میں خوش ہوں کہ مجھے میرے صبر کا اجر مل گیا ہے.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوا تھا۔

مہر گل غم آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے تھی۔

”تم اب ساری زندگی اور کسی کو دل میں جگہ نہیں دے سکو گی اور جب دل میں کسی کو جگہ نہیں دے سکو گی تو زندگی میں بھی کسی کو جگہ نہیں دے سکو گی، کیونکہ..... تمہیں تمہارا دل اس کی اجازت نہیں دے گا، تمہیں میری محبت اس کی اجازت نہیں دے گی۔ تم ساری زندگی تنہا گزارو گی، میرے بغیر.....“ اس کا لہجہ سچائی کا غماز تھا۔

”میں خود کو ختم کر لوں گی۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر.....“ بے قراری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”ہرگز نہیں..... اس طرح تم ہمیشہ کے لئے اللہ کے ہاں نامراد ٹھہرو گی، بامراد وہی رہتے ہیں جو صبر



کرتے ہیں، یاد رکھنا، خودکشی کی معافی بالکل بھی نہیں..... ہر گناہ کی معافی ہے۔ لیکن..... اس کی نہیں..... کیونکہ گناہ خواہ کیسے ہی ہوں، شرک ہو، کفر ہو، معافی کی گنجائش ہے کہ بندہ توبہ کر لے تو وہ ”توبہ“ قبول کر لیتا ہے۔ لیکن خودکشی کی معافی نہیں..... کیونکہ ”موت کے بعد“ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ سو مہر گل! تمہیں زندہ رہنا ہے، اگر آخرت کی زندگی میں سکون چاہتی ہو، تو اس فانی زندگی میں ”بے سکونی“ کو قبول کر لو۔ اس میں عافیت ہے..... خیر..... تمہاری مرضی میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اتنی ہی مہلت ملی تھی۔

”مم..... میں کیسے رہوں گی؟“ وہ گھبرا گئی۔

”اللہ حافظ.....!“

”پلیز..... مت جاؤ.....“ سیاہ آنکھیں سمندر

بنی التجا کر رہی تھیں۔

”اب یہ ممکن نہیں.....“

اب ہم کو ڈھونڈنے کا تکلیف نہ کیجئے ہم کھو گئے! کہ آپ کا ملنا محال ہے.....! وہ مسکرایا تھا۔ وہ لہو لہو مسکراہٹ تھی۔ دل کو چیر دینے والی..... آنکھوں میں خون بھر دینے والی..... درد نے اپنے استخوانی، نوکیلے ہاتھ میں مہر گل کا دل جکڑ کر پوری قوت سے مسل ڈالا تھا۔ اس کا دل تڑپا تھا اور پوری شدت سے تڑپا تھا۔ پتھر جب گوشت و پوست کے قالب میں ڈھلا تھا تو یہ درد تو لازم تھا۔ ”اللہ حافظ.....!“ میں تمہارا انتظار کروں گا، مگر..... تمہیں ”اچھی حالت“ میں اپنے پاس آنے کا۔ ”حیدر کا وجود دھندلانے لگا اور دھندلاتے دھندلاتے بالآخر تحلیل ہو گیا۔ حیدر چلا گیا۔ اور درد تکلیف کرب، اذیت اور تڑپ باقی رہ گئی۔ ”محبت“ باقی رہ گئی..... ”جانکنی“ باقی رہ گئی..... وہ جانتی تھی کہ اب اسے آخری سانس تک یہ جانکنی جھیلنی ہے اور ہمیں یہ جانکنی ہر حال میں جھیلنی ہی پڑتی ہے۔ یہ بے بسی کا عالم ہی تو ہمیں احساس دلاتا ہے کہ محبت اور زندگی آسان نہیں..... اور مصائب کو جھیلنے والا ہی فلاح پاتا ہے..... حیدر چلا گیا تھا۔ مگر..... اسے صبر سکھا گیا تھا۔

اسے اگر صبر کا اجر مل گیا تھا تو مہر گل کو بھی صبر کا اجر ملنا ہی تھا۔ وہ صبر جو وہ پل پل اذیت جھیل کر، تادم آخر، زندگی اور موت کے بیچ معلق رہ کر کرتی۔

اگرچہ یہ پہاڑی زندگی گزارنے کا تصور ہی اس کا کلیجہ کھرچے دیتا تھا، مگر..... اسے یہ مصائب و آرام، آزمائش اور تڑپ کا یہ پہاڑ عبور کرنا ہی تھا۔ کہ اسے صبر کے جال میں حیدر قید کر گیا تھا۔ اور یہ جال اس قدر سخت تھا کہ روح تک جسم کے زندان میں بے قرار ہو کر پھڑ پھڑا اٹھی تھی۔ اس جال کی گرفت، شکنجہ، جس قدر سخت ہوگا، اسی قدر درد ہوگا اور جس قدر درد ہوگا اسی قدر صبر کرنا پڑے گا..... اور جتنا صبر، اتنا اجر..... مہر گل اب اس جال سے رہائی چاہتی بھی نہ تھی کہ اسے اس جال میں حیدر نے جکڑا تھا۔

بلا کی بدگمانی تھی، میرے صبا کو مجھ سے ”ذبح“ کے بعد بھی اس نے میرے کس کس کے ”پر“ باندھے.....!

اور اسے آئندہ زندگی اسی طرح بندھے ہوئے پروں کے ساتھ گزارنا تھی..... کیونکہ ”وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھی اور گھر کی سمت چل پڑی۔ اس کے قدموں سے صدیوں کی شکست، صدیوں کی تھکن لپٹی تھی۔ اسے اب ہمیشہ جانکنی کے عالم میں رہنا تھا۔ مگر..... ایک پر امید مسکراہٹ اس کے بھیکے ہونٹوں کو چھو گئی۔ ”کیونکہ..... کیونکہ جتنی زیادہ تکلیف، اتنا زیادہ صبر..... اور جتنا زیادہ صبر اتنا ہی زیادہ اجر.....“ اور اسے بھی ”صبر کا اجر“ اللہ سے حیدر کی صورت مانگنا تھا۔ اور بے شک اللہ بہترین اجر دینے والا ہے..... اللہ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکی بھی ضائع نہیں کرتا۔ معمولی سا عمل بھی سنبھال کر رکھتا ہے۔ اور بہترین اجر سے نوازتا ہے اور صبر تو بذات خود بہترین عمل ہے۔ اور اللہ اچھے اعمال کا بہترین صلہ دیتا ہے۔ تو پھر..... جتنا زیادہ صبر..... اتنا زیادہ اجر.....!!





دل گرفتہ دل شکستہ ناقابل فراموش ناقابل یقین سے دو چار عجیب و غریب حیرت سے روشناس کراتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے خوفناک وادی کے نشیب و فراز میں دندناتی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی شاہکار کہانی۔

حیرت و خوف کے گرداب میں غوطہ زن اپنی مثال آپ تحیر انگیز ایڈوینچر کہانی

دیکھنے کے ساتھ ساتھ گاہے بہ گاہے بس کے دیگر مسافروں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کے برابر ایک گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو کسی انگلش میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بس اس وقت ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔

اچانک سمن چونک پڑا دور سے ایک ناک نظر آ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف پولیس اہلکار چونکے کھڑے تھے۔ سمن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میک اپ میں ہونے کے باوجود اسے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لیا جائے۔ اس نے سر گھما کر پچھلی نشست پر موجود حیدر علی کو دیکھا جو بظاہر مطمئن بیٹھا تھا۔ اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر سمن کو تسلی ہوئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

ناک پر ملنے والے اشارے پر بس ڈرائیور کو بس روکنا پڑی۔ بس رکتے ہی سمن کو اپنے اعصاب میں تناؤ سا محسوس ہوا۔ بس کے رکتے ہی ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ بس میں چڑھا اور مسافروں کے سامان کی تلاشی لی جانے لگی۔ سمن کا دل انجانے خدشات کے تحت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے یہی خدشات لاحق ہو گئے تھے کہ کہیں اسے پہچان نہ

**سلمان** کی گندی رنگت سیاہی مائل ہو چکی تھی اب وہ کوئی سیاہ فام جیشی دکھائی دیتا تھا۔  
”اب تمہارا نام جوزف ہے اور کوشش کرنا کہ انگلش کے علاوہ کسی دوسری زبان میں کسی سے گفتگو مت کرنا۔“ حیدر علی نے اسے تنبیہ کیا۔ ناک کے نتھنوں میں اسپرنگ اور زیرو نمبر کے چشمے نے اس کی شخصیت کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ پھر حیدر علی نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ریڈی سیڈ میک اپ کیا پھر اپنا ضروری ساز و سامان لے کر وہاں سے نکل گئے۔

سمن اس وقت مسافر بس میں موجود تھا۔ حیدر علی پچھلی نشست پر تھا۔ جبکہ ناصر اور غلام مصطفیٰ ان سے الگ دوسری گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ وہ دو افراد کی الگ الگ ٹولیوں میں مختلف گاڑیوں میں راجستھان پہنچیں گے اور دوران سفر ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ تاکہ اگر ان میں سے کوئی پکڑا جائے تو دوسرے محفوظ رہیں۔ سمن بھائی کے گھر سے نکلتے ہی وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شفٹ ہو گئے تھے وہاں سے وہ دوسرے روز ہی راجستھان کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

سمن کھڑکی سے باہر گزرنے والے نظارے







ٹیکسی میں ہی طے کرنا تھا۔ ابھی ٹیکسی نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ حیدر علی چونک پڑا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ سمن نے پوچھا۔

”ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

حیدر علی نے جواب دیا۔ سمن نے مڑ کر دیکھا وہ واقعی ٹھیک کہہ دیا تھا۔ ایک بڑے ٹائروں والی جیپ ان کے پیچھے تھی سمن سوچنے لگا کہیں انہیں ٹریس تو نہیں کر لیا گیا۔

جیپ میں ڈرائیور سمیت چار افراد موجود تھے وہ زیادہ فاصلہ ہونے کے باعث وہ ان کی شکل و صورت نہیں دیکھ سکے تھے۔ البتہ اتنا اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ سادہ لباس میں تھے۔ سمن کے اندازے کے مطابق وہ بی ایس ایف یا کسی دوسری ایجنسی کے اہلکار بھی ہو سکتے تھے پھر جیپ کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اور لمحہ بہ لمحہ ان کے قریب آتی ہوئی اور ٹیک کرنے لگی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے سمن کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تو سمن کی جان میں جان آئی وہ اس کا بس کا ہم سفر اشوک کمار تھا۔ ”حیدر علی تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ اشوک کمار ہے پولیس رپورٹر۔“ سمن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا وہ انگلش میں ہی بات چیت کر رہے تھے تاکہ ٹیکسی ڈرائیور ان کی بات نہ سمجھ سکے۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اترے اور ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے رخصت کیا۔ کچھ دیر بعد غلام مصطفیٰ اور ناصر بھی ایک دوسری ٹیکسی میں وہاں آ پہنچے۔ ”اب آگے کا سفر ہمیں پیدل طے کرنا ہے دشمن کا یہ ٹریننگ سینٹر پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک میدان میں ہے۔ جہاں دور دور تک سیکورٹی کا سخت انتظام ہے۔“ حیدر علی نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔

انہیں اس سنسان علاقے میں چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ سورج چھپ چکا تھا اور چند اماموں پہاڑیوں کی چوٹیوں سے طلوع ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے حیدر علی رکا تو انہیں بھی قدم روکنے پڑے حیدر علی نے اپنی جیب سے نقشہ نکالا۔ اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد

لیا جائے۔ پولیس اہلکار دیگر مسافروں کی تلاشی لینے کے بعد اب اس کی طرف آرہے تھے۔ مگر خیریت گزری انہوں نے سمن کو سرسری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے بیگ کی تلاشی لینے کے بعد آگے بڑھ گئے پھر کچھ دیر بعد انہوں نے بس کے تمام مسافروں کی تلاشی لینے کے بعد بس کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔

سمن نے محسوس کیا کہ اس کے برابر بیٹھا شخص اسے غور سے دیکھ رہا ہے اسے اس کی ٹولٹی نگاہوں سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ بظاہر لا پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس شخص نے کچھ دیر بعد اسے کھنکار کر متوجہ کیا اور کہا۔ ”میرا نام اشوک کمار ہے اور میں پولیس رپورٹر ہوں۔“

سمن کو بھی مجبوراً اپنا تعارف کرانا پڑا۔ ”میں جوزف ہوں۔“

”آپ کرتے کیا ہیں؟“ اشوک کمار نے پوچھا۔ ”میرا تعلق کینیا سے ہے اور وہاں ہمارے چائے کے باغات ہیں اور میں سیاحت کی غرض سے انڈیا آیا ہوں۔“ سمن نے انگلش میں جواب دیا۔

”اگر آپ سیاحت کی غرض سے آئے ہیں تو راجستھان کی طرف کیوں جا رہے ہیں۔ وہاں تو کوئی تفریحی مقام نہیں۔“ اشوک کمار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اگلا سوال داغ دیا۔

”مجھے ریگستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اسی لئے وہاں جا رہا ہوں۔“ سمن نے اس بار ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ اسے اس صحافی کے سوالات سے الجھن ہو رہی تھی۔ منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے وہ شخص سمن کو اپنی فضول باتوں سے بیزار کر چکا تھا۔

بس سے اترتے ہوئے سمن نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی اس باتونی شخص سے جان چھوٹی۔ وہ حیدر علی کی ہدایت کے مطابق بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر واقع ٹیکسی اسٹینڈ میں پہنچا تو حیدر علی ٹیکسی بک کر چکا تھا۔ یہاں سے آگے کا سفر ان دونوں نے اکٹھے



بولا۔ ”اب ہم ریڈ زون میں داخل ہونے والے ہیں بہتر یہی ہے کہ ہم نصف شب کے بعد اپنی کارروائی شروع کریں جب تک کوئی مناسب جگہ دیکھ کر قیام کر لیتے ہیں۔ کچھ دیر آرام سے ہم تازہ دم بھی ہو جائیں گے۔“

مناسب جگہ انہیں کچھ ہی دیر بعد مل گئی۔ یہ کوئی خستہ ہال زمانہ قدیم کی ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی۔ جو دیران پڑی تھی عمارت کے کمرے گرد و غبار اور چالوں سے اٹے ہوئے تھے۔ اس عمارت کا ایک دروازہ غشی سمت بھی تھا لیکن یہ آمد و رفت کے قابل نہ تھا کیوں کہ یہاں ڈھلان تھی اور بکثرت خود رو پودے اور جھاڑیاں تھیں انہوں نے روشنی کے لئے ٹارچ روشن کر لی تھی اور ایک کمرے کو جھاڑ پونچھ کر بیٹھنے کے لائق بنایا۔ اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

ناصر نے اپنا بیگ کھولا اور اسلحہ نکالنے لگا یہ دو آٹومیٹک رائفلیں اور دو پستل تھے۔ ”کیا تمہاری تلاشی نہیں لی گئی؟“ سمان نے پوچھا۔

”لی گئی کیوں نہیں لی گئی۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر وہ یہ اسلحہ کیوں نہیں ڈھونڈ سکے؟“

سمان نے پوچھا۔

”یہ گرتا نہ کا نہیں ایک نہ ایک داؤ تو استاد بھی شاگرد سے چھپا کر رکھتا ہے۔ جیسے بلی نے شیر کو سب کچھ بتایا مگر درخت پر چڑھنا نہیں سکھایا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے ہر جگہ میر جعفر اور میر صادق جیسے نڈر ہوتے ہیں جو جرائم پیشہ افراد کے کام آتے ہیں۔“

باتوں کے دوران حیدر علی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیرونی سمت کھلنے والی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا۔ ”کیا ہوا؟“ غلام مصطفیٰ نے پوچھا۔

”اس عمارت کو گھیرا جا رہا ہے۔“ حیدر علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور وہ بے اختیار کھڑکی کی طرف لپکے۔ انہوں نے دیکھا واقعی حیدر علی ٹھیک کہہ رہا تھا درجنوں کی تعداد میں دور سے بہت دور سے ہیولوں کی مانند دکھنے والے افراد آہستہ آہستہ اس عمارت کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔ حیدر علی کی حیات

بلا کی تیز تھیں۔

”لیکن انہیں ہمارے یہاں آنے کی کیسے خبر مل گئی۔“ سمان نے کہا اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔ یہ شک و شبہ والی بات تھی۔

حیدر علی کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی غدار بھی ہو سکتا ہے ناصر اور غلام مصطفیٰ اس کے ساتھی تھے۔ جو وطن کے لئے جان تو دے سکتے تھے لیکن غداری نہیں کر سکتے تھے۔ جب کہ سمان کرنل تو حیدر جیسے جانباز فوجی کا بیٹا تھا جس نے جان تو دے دی مگر دشمن کو اپنا راز نہیں بتایا تو پھر دشمن ان کی راہ پر کیسے لگ گیا۔

اچانک اس کی نظر سمان کے شانے پر پڑی اس کی شرٹ پر ٹائیگر کا ایک چھوٹا سا اسٹیکر چپکا ہوا تھا۔ جو شرٹ کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر قدرے ابھرا ہوا تھا۔ حیدر علی نے لبوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور آگے بڑھ کر سمان کی شرٹ سے اسٹیکر اکھاڑ کر ہار کی سے اس کا معائنہ کرنے کے بعد نیچے پھینکا اور جوتے سے مسل دیا۔ ”یہ حساس ترین ڈیوائس بھی ہماری لوکیشن کے بارے میں دشمن لمحہ بہ لمحہ اسی ڈیوائس کے ذریعے جانتا رہا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہاری شرٹ پر یہ اسٹیکر چپکا یا کس نے؟“ حیدر علی نے کہا اور سمان سوچنے لگا بس میں اشوک کمار اس سے چپک کر بیٹھا تھا وہ با آسانی یہ کام کر سکتا تھا اور پھر راستے میں وہ جیب میں ان کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

حیدر علی نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اشوک کمار کوئی اخباری رپورٹر نہیں کسی ادارے کا اہلکار ہے ہو سکتا ہے اس کا تعلق کسی ایجنسی سے ہو۔ کیوں کہ کوئی پولیس والا اس قسم کی حساس ڈیوائس سے آگاہ نہیں ہوتا۔“

انہوں نے اسلحہ اٹھایا اور چھت پر پہنچ گئے۔ دشمن آہستہ آہستہ گھیرا ڈال رہے تھے پھر حیدر علی نے باؤنڈری وال کی دیوار سے سر ابھار کر برسٹ مارا انہوں نے دو افراد کو گرتے دیکھا۔ پھر ان پر بھی جوابی برسٹ



فارے کئے گئے۔ وہ نیچے دیک کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد فارنگ روک دی گئی اور خاموشی چھا گئی۔ اور پھر لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری۔ ”تم لوگ اس وقت ہمارے گھیرے میں ہو۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو میں وچن دیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔“

سمان سنائے میں آ گیا وہ اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ میجر رام پرشاد کی آواز تھی وہی میجر رام پرشاد جو کہ ابرش اور بریرہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ گویا وہ آرمی کے گھیرے میں تھے۔ ان کے دلوں پر دشمن کی ہیبت طاری ہو چکی تھی اور اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ دشمن آرمی کے اس دستے سے مقابلہ ناممکن تھا کیوں کہ ان کے پاس اسلحہ کے نام پر صرف دو پستل اور دو رائفلیں تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں انہیں اذیت ناک موت ملتی۔ دشمن سے کسی بھی رعایت کی توقع فضول تھی وہ آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور وقت ان کی منہی سے ریت کی مانند سرک رہا تھا اور رفتہ رفتہ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

سمان، بریرہ اور ابرش سے شاہ زین رخصت ہو کر پنچو کے بتائے ہوئے راستے پر پیدل چلتا رہا۔ چلتے چلتے جب وہ تھک جاتا تو رک کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے آرام کر لیتا۔ راجستھان کوئی نزدیک نہیں تھا۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں کے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں کہیں نماز کا وقت ہوتا وہ رک کر نماز پڑھ لیتا۔ رات کو وہ جنگل میں ہی سکون سے بے فکر ہو کر سو جاتا۔ مجال ہے جو کوئی درندہ یا کوئی موذی جانور اس کے سامنے آئے۔ اس کی نیت صاف تھی۔ وہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے تکلیفیں اٹھا رہا تھا۔ اس لئے کٹھن منزلیں بھی اس کے سامنے سہل ہوتی جا رہی تھیں۔ راستے میں نہ ہی اسے کسی چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ اور نہ ہی اس کا سامنا دشمن دستے سے ہوا یونہی چلتے چلتے وہ کئی دن کی مسافت کے بعد راجستھان کی

حدود میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ دور ایک آبادی کے آثار دیکھ کر وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بستی سے پہلے اس کے راستے میں ایک مندر آ گیا۔ جس کے احاطے میں برگد کا اونچا درخت دور سے نظر آ رہا تھا۔ پتھر سے بنے ہوئے اس مندر کا عکس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ مندر کے قریب سے گزرنے لگا تو کسی کی سسکیوں اور آہ و بکا کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ آواز مندر سے آرہی تھی وہ فطری تجسس کے تحت مندر میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں کشادہ احاطہ تھا۔ احاطے کے درمیان سبزہ تھا جس پر ایک پجاری لیٹا ہوا تھا۔ اندر سے سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی وہ آواز کی سمت چل پڑا اور محرابی دروازے سے گزر کر ہال نما کمرے میں پہنچا جہاں کالی کا قد آور بت ایستادہ تھا۔ بت کے قدموں کے پاس ایک ادھیڑ عمر شخص سجدہ ریز تھا اور آہ و بکا کر رہا تھا اس سے کچھ فاصلے پر ایک دس بارہ سالہ نحیف و نزار لڑکا چپٹ پڑا تھا۔ وہ لڑکا کیا تھا بیڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جس میں شاید ہلنے چلنے کی سکت بھی نہ تھی۔

وہ ادھیڑ عمر شخص کے قریب پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”تم رو کیوں رہے ہو اور اس بت کے سامنے آہ و زاری کیوں کر رہے ہو؟“

اس شخص کی حیرت دو چند ہو گئی۔ ”مور کھتم کالی مائی کو نہیں جانتے۔ یہ میرا بیٹا راہول ہے پچھلے ورش سے اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے سوکھتا جا رہا ہے ویدوں، ڈاکٹروں ہر ایک کو دکھایا مگر اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے اب تو سب نے جواب دے دیا ہے اس کی بیماری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب نہ تو یہ چل سکتا ہے اور نہ ہی بول سکتا ہے بس ہر وقت بے حس و حرکت پڑا چھت کو تکتا رہتا ہے میں پچھلے کئی دنوں سے کالی مائی کے چرنوں میں آتا ہوں اور پرارتھنا کرتا ہوں کہ شاید کالی ماں مجھ پر دیا



کرے۔“ وہ روتے ہوئے بولا۔

”یا گل انسان یہ پتھر کا بے جان بت جسے ہمارے جیسے کسی انسان نے بنایا ہے نہ ہل سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ یہ بت تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اگر اس بت کو کوئی نقصان پہنچاؤں تو یہ اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا تو پھر بھلا یہ تمہیں کیا فائدہ دے گا۔“ شاہ زین جذباتی ہو گیا تھا۔

”مانگنا ہے تو اس واحد لاشریک سے مانگو جو سب کی سنتا ہے جو خالق ہے مالک ہے اور اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔“

”بالک ایسے شبدھ مت کہو بھگوان ناراض ہو جائیں گے۔“ بوڑھا لرز اٹھا۔

”بابا یہ پتھر کے بے جان بت ہیں۔ جنہیں خود انسان نے بنایا ہے۔ ان میں احساسات نہیں نہ ہی یہ سن سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو اس پر تمہارے دشمن نے کالا جادو کیا ہے یہ لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اسے اٹھاؤ اور میرے ساتھ اپنے گھر لے چلو اگر اس لڑکے کی زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ یہ ضرور صحت یاب ہو جائے گا۔“ اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد بوڑھے نے لڑکے کو اٹھایا اور باہر نکلنے لگا ایسی میں راستے میں انہیں ایک پجاری بھی ملا جس نے شاہ زین کو حیرت سے دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ بستی میں پرکاش نامی اس بوڑھے کا کچا مکان تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور راہول نامی یہ لڑکا اس کا اکلوتا بیٹا تھا گھر آ کر پرکاش نے اس کی ہدایت کے مطابق راہول کو چٹائی پر لٹایا۔

شاہ زین نے اسے پانی لانے کا کہا اور لڑکے کے قریب بیٹھ کر قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ وہ پرکاش کے لائے ہوئے پانی پر پڑھتے ہوئے دم بھی کرتا جا رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے پانی کے چھینٹے راہول کے چہرے پر چھڑکے تو اس نے سراٹھا کر اسے دیکھا بوڑھا ششدر رہ گیا کچھ دیر بعد اس نے راہول

کے پورے جسم پر پانی چھڑکنے کے ساتھ ساتھ دم بھی کیا۔ تو وہ اٹھ بیٹھا۔

بوڑھے نے شاہ زین کے پاؤں پکڑ لئے۔ ”تم ہمارے لئے اوتار ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو نیا جیون دیا ہے۔“ اس نے پرکاش کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

”بابا تو بہ میں ایک معمولی سا انسان ہوں یہ سب اللہ کے کام ہیں اللہ کے کلام کی برکت سے کالے جادو کا توڑ ہو چکا ہے۔ اب یہ لڑکا چند دنوں میں اچھا بھلا ہو جائے گا۔“ پرکاش بار بار اس کا شکر ادا کرتا تھا۔

مسلسل سفر نے شاہ زین کو تھکا دیا تھا۔ وہ کھانا کھا کر رات کو جلدی ہی سو گیا اور صبح ناشتہ کر کے پرکاش کے گھر سے نکلا اور ٹھہلتا ہوا بستی سے کافی دور ایک پہاڑی مقام پر آ گیا۔ وہ مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ منچو نے اسے روک دیا۔ ”شاہ زین آگے تمہارے لئے خطرہ ہے بہتر ہے واپس لوٹ جاؤ۔“

”کیسا خطرہ؟“ اس نے چلتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ منچو کوئی جواب دیتا خطرہ خود اس کے سامنے آ گیا۔

وہ پانچ افراد پر مشتمل پنڈت پجاریوں کا ایک جھتا تھا جو اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر دراز قد اور صحت مند پنڈت آگے بڑھا اور شاہ زین کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ”آپ لوگوں نے میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے۔“ شاہ زین نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

”شاہ زین بھگت رام نامی یہ پنڈت انتہائی خطرناک ہے اور پر تاب بھوش کا چیلہ ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے دل میں کینا رکھتا ہے اس سے پہلے کہ یہ تم پر وار میں پہل کرے میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ منچو تند لہجے میں بولا۔

”میں کسی سے بھی محاذ آرائی نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں باباجی کے حکم پر یہاں آیا ہوں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تم آرام سے بیٹھو۔“ شاہ زین نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا اور منچو تلمتھانے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اگر شاہ زین اسے ٹوک نہ



دیتا تو وہ پنڈت پجاریوں کی اس ٹولی سے الجھ بیٹھتا۔  
بھگت رام نے شاہ زین کو کینہ تو زنگا ہوں سے  
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مورکھ میں تمہیں یہی نصیحت  
دیتا ہوں کہ ترنت اپنے دیش لوٹ جاؤ ابھی بھی سے  
ہے۔ میرے ساتھیوں کی تو یہ اچھا ہے کہ تمہیں نشٹ  
کر دیا جائے۔“

”میں باباجی کے حکم پر یہاں آیا ہوں اور کسی  
سے محاذ آرائی کا ارادہ نہیں رکھتا میرا آپ لوگوں کو بھی  
یہی مشورہ ہے کہ آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کام  
کرنے دیں۔“ شاہ زین نے شائستگی سے جواب دیا۔

مگر بھگت رام کا لہجہ بتدریج درشت ہوتا  
جا رہا تھا۔ وہ اسے مسلسل دھمکا رہا تھا۔ بالآخر شاہ زین  
کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ اس نے بھی اس متعصب  
ہندو پنڈت کو تلخ جوابات دیئے کچھ دیر تک ان کے  
درمیان تلخ وترش جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا اس کے باوجود  
شاہ زین تحمل و برداشت سے کام لیتا رہا اور یہ کہتے  
ہوئے آگے بڑھنا چاہا کہ میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا۔

بھگت رام نے تلمتاتے ہوئے شاہ زین کی  
طرف شہادت کی انگلی کو جنبش دی تو اس کے پاؤں کے  
گردنا دیدہ سی لپٹ گی اور وہ منہ کے بل گرا مگر گرتے  
ہی وہ اس کا توڑ کر چکا تھا۔ رسیوں کی بندش ٹوٹے ہی وہ  
اٹھ کھڑا ہوا اور پجاریوں کے ٹولے کو قہر آلود نگاہوں  
سے دیکھ کر بولا۔ ”اب بھی وقت ہے رک جاؤ۔“

لیکن وہ اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر منتر پڑھ  
رہا تھا۔

شاہ زین نے خود کو حصار میں محفوظ کر لیا۔  
درجنوں کی تعداد میں کتے سے مشابہ خونخوار  
جانور کر یہہ انداز میں چیختے ہوئے شاہ زین کی طرف  
لپکے۔ یہ بھگت رام کے بیر تھے لیکن جو بیر بھی حصار سے  
نکراتا جل کر راکھ ہو جاتا کچھ ہی دیر میں وہ درجنوں  
بیروں سے محروم ہو گیا۔

پھر اس نے غصے سے کھولتے ہوئے اپنے  
دونوں ہاتھ شاہ زین کی طرف جھٹکے۔ توفضا سے شاہ زین

پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ لیکن یہ پتھر بھی حصار سے  
باہر ارد گرد ہی گر رہے تھے اس نے جادو کے کئی مہلک  
ترین وار کئے۔ لیکن شاہ زین اپنے حصار میں محفوظ رہا۔  
پے درپے ناکامیوں نے اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا  
تھا۔ پھر اس نے طیش میں آ کر زمین سے مٹی اٹھائی  
اور منتر پڑھ کر شاہ زین کی طرف پھینکی۔ گرد و غبار کا ایک  
بگولا سا اٹھا۔ اور تیزی سے حصار سے ٹکرایا بگولے کے  
حصار سے ٹکراتے ہی حصار ٹوٹ گیا اور شاہ زین کرب  
اور اذیت سے چیخ پڑا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس  
کے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ درد کی ایک کٹیلی  
لہر اس کے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ تکلیف کی شدت  
سے وہ نیچے گر کر پانی سے نکلی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔  
لیکن اس کی یہ کیفیت عارضی رہی۔

منچو کا ہاتھ دراز ہوا اور اس نے شاہ زین کی  
پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے  
جلتے ہوئے بدن پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ اٹھ  
کر کھڑا ہو گیا۔

بھگت رام اب کسی مداری کی طرح اچھل اچھل  
کر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ رکا تو اس کے ہاتھ  
میں مٹی کی ایک کوری ہانڈی نظر آ رہی تھی یہ کالے جادو کا  
مہلک ترین وار تھا۔

منچو بھی چوکننا ہو گیا اور اپنی نگاہیں بھگت رام  
پر جمادیں۔ بھگت رام نے کالی کالک شگاف نعرہ بلند کیا  
اور ہانڈی شاہ زین کی طرف اچھال دی۔ ہانڈی گھوں  
گھوں کی گونج دار آواز بلند کرتی ہوئی گول گول گھومتی شاہ  
زین کی طرف بڑھی اور اس کے سر پر معلق ہو کر گھومنے لگی۔

منچو کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو چکا تھا وہ خوف زدہ  
نظروں سے شاہ زین کے سر پر گھومتی ہانڈی کو دیکھ رہا تھا۔  
اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا شاہ زین نے آیت  
الکرس پڑھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور ہانڈی  
کو تھام کر نعرہ کبیر بلند کیا سرعت سے ہانڈی بھگت رام

کی طرف اچھال دی۔ ہانڈی تیزی سے بھگت رام کی  
طرف پلٹی اور فضاء میں کان کے پردے پھاڑ دینے والی



نبیب قسم کی چیخ، پکار گونج اٹھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ ہانڈی اب بھگت رام کے سر پر گھوم رہی تھی بھگت رام ڈنڈوت کرتے ہوئے کالی کو پکارنے لگا۔ مگر اس کی فریادیں اور چیخ و پکار بھی اس کی جان نہ بچا سکی اور ہانڈی بھگت رام کے سر پر گر کر پھٹ گئی۔ بھگت رام کا عبرت ناک انجام دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھاگ کر جان بچانا چاہی مگر وہ منچو کے قہر و غضب کا نشانہ بن گئے۔ منچو کی انگلی کی جنبش سے وہ جل کر خاک ہو گئے۔

”تم نے پھر مداخلت کی۔“ شاہ زین نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

”تو اور کیا انہیں پھولوں کے ہار پہناتا۔“ منچو جل کر بولا تو شاہ زین ہنس پڑا۔ اور اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

چھ سات کلو میٹر آگے جانے کے بعد وہ ایک پہاڑی کے قریب جا پہنچا۔ جو سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی ایک طرف اوپر سے نشیب میں بہتی ہوئی آبشار پہاڑی کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ اسے محسوس ہوا اس کے شانے سے منچو غائب ہو چکا ہے یہ غیر معمولی بات تھی وہ ٹھٹھک کر رکنا مگر پھر ہمت کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ پہاڑی کے عین وسط میں پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہاں جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔

ایک طرف حجرہ سا بنا ہوا تھا جس کے دروازے پر بھاری پردہ جھول رہا تھا حجرے کے سامنے درجنوں لوگ مودب بیٹھے تھے۔ حجرے کے دروازے پر ایک باریش شخص مودب کھڑا تھا۔ شاہ زین بھی ان درجنوں افراد میں جا کر بیٹھ گیا۔ باریش شخص کے پکارنے پر ہر شخص باری باری حجرے کے اندر جاتا اور کچھ دیر بعد واپس لوٹ آتا۔ ”حجرے میں کون ہیں؟“ شاہ زین نے قریب بیٹھے ایک شخص سے پوچھا۔

”اندر باباجی ہیں۔ جو برسوں سے یہاں مقیم

ہیں باباجی بنا کسی تفریق کے ہر ایک کے کام آتے ہیں یہاں انسان خالی ہاتھ آتا ہے اور جھولی بھر کر جاتا ہے۔“ اس شخص نے گہری عقیدت سے جواب دیا۔ شاہ زین نے اندازہ لگایا اس ہجوم میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے موجود تھے۔

کچھ دیر بعد جب ایک سائل حجرے سے باہر نکلا تو باریش شخص نے آواز لگائی۔ ”تم لوگوں میں شاہ زین کون ہے؟ اسے باباجی بلارہے ہیں۔“ شاہ زین کی حیرت دوچند ہو گئی گویا حجرے میں موجود شخصیت علم و روحانیت میں کمال رکھتی تھی وہ سر جھکائے حجرے میں داخل ہوا تو ششدر رہ گیا۔ اندر چٹائی پر بابا محمد الیاس بیٹھے تھے۔ وہ دو زنانہ ہو کر ان کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اب اسے سمجھ آیا کہ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے منچو اس کے کندھے سے کیوں غائب ہوا تھا۔

بابا نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولے۔ ”شاہ زین اب کچھ عرصہ تم یہیں رہو گے اور یہاں آنے والے حاجت مندوں کے کام آتے رہو گے۔ کچھ دن میں بھی یہاں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“ بابا سے کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ حالانکہ اس کے ذہن میں کئی سوالات مچل رہے تھے وہاں کے لوگوں کے بقول باباجی کئی برسوں سے یہاں مقیم ہیں۔ جبکہ کئی بار باباجی اسے پاکستان میں مل چکے تھے۔

شاہ زین کے شب و روز وہیں بیتنے لگے۔ باباجی فارغ اوقات میں اسے علم روحانیات کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ دن کا ایک حصہ عام لوگوں کے لئے مختص تھا۔ جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی وہ بنا کسی تفریق کے ہر ایک سے محبت اور شفقت سے پیش آتے یہاں شاہ زین اور ان کا ساتھ صرف مہینہ بھر دیا۔ پھر وہ اسے اپنا قائم مقام بنا کر کچھ دنوں کے لئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ایک روز سہ پہر کے وقت ایک ادھیڑ عمر شخص حجرے میں داخل ہوا۔ اس نے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ شاہ زین کے سامنے مودب ہو کر بیٹھ گیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا



تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ”شاہ صاحب مجھ پر دیا کیجیے۔ میری پتری کا جیون خطرے میں ہے۔“

شاہ زین نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ”گھبرا نہیں اللہ بہتر کرے گا۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ کس مسئلے سے دوچار ہیں۔“

”میں قریبی گاؤں کا کھیا رام اوتار ہوں۔ گاؤں میں میری شاندار حویلی ہے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں باوجود دولت کی ریل پیل کے میں گاؤں کے ہر فرد کے کام آتا ہوں پر نتو نہ جانے پھر بھی کیوں اس پریشانی میں آ پھنسا۔ آپ نے کوئی اپائے نہ کیا تو میرے پاس صرف یہ راستہ بچے گا کہ میں آتما ہتھیا کر لوں۔ کانتا میری اکلوتی بیٹی ہے عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ ہے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ رات آٹھ بجے ہی اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی ہے اور ہمارے پکارنے کے باوجود نہ ہی دروازہ کھولتی ہے اور نہ ہی کوئی جواب دیتی ہے۔ دن بھر کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔“

ایک دن رات کو گیارہ بجے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں محو خواب تھا وہ اپنے کمرے سے نکلی اور گیٹ پر جا پہنچی چوکیدار کا کہنا ہے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ کئی فٹ دور جا گرا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نازک اندام لڑکی کے اندر نہ جانے کون سی حیوانی طاقت آگئی تھی کہ اس نے قوی ہیکل چوکیدار کو کسی کھلونے کی طرح زمین پر گرا دیا تھا پر وہ کھر کھرائی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولی۔ ”اب میرے راستے میں آیا تو نشٹ ہو جائے گا۔“ چوکیدار خوف زدہ ہو کر میرے کمرے کی طرف دوڑا میرے جاگنے تک کانتا غائب ہو چکی تھی۔ وہ صبح پانچ بجے کے قریب گھر آئی۔

جب ہم نے اس سے پوچھا کہ ”وہ کہاں گئی تھی؟“ تو اس نے ہمیں غصے سے گھورا اس کی انگاروں کی طرح دہکتی نگاہیں قہر برسا رہی تھیں۔

پھر وہ کھر کھراتی ہوئی غیر انسانی آواز میں مخاطب ہوئی۔ ”رام اوتار کانتا میری ہے۔ آئندہ ہمارے بیچ آنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تیرے پورے پر یوار کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔“ پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے روز میں چوکیدار کے ساتھ گیٹ پر موجود تھا۔ کانتا رات کو حسب معمول جب گھر سے باہر جانے لگی تو میں نے اور چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے کسی کھلونے کی طرح ہم دونوں کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ جب تک ہم اٹھتے وہ باہر جا کر اندھیرے میں گم ہو چکی تھی۔ میں گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

آج سے دو روز پہلے میں ایک پنڈت دھن راج مہاراج کو گھرا لیا۔ انہوں نے ابھی کانتا کے سامنے بیٹھ کر اشلوک پڑھنا شروع کیا تھا کہ کانتا نے ایک ہاتھ سے ان کا گلا دبوچ کر دوسرا ہاتھ کسی ہتھوڑے کی طرح ان کے سر پر مارا تو وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اور ہوش میں آنے کے بعد کچھ کہے سنے بغیر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔

پھر میں نے پاربتی دیوی کے سیوک امر لال سے سہائتا طلب کی۔ وہ بہت بڑے شکتی شالی پنڈت ہیں۔ انہوں نے لوہان اور عود کی دھونی دینے کے بعد جب منتر پڑھنا شروع کیا تو کانتا کی حالت غیر ہونے لگی۔ اور وہ نیچے گر کر تر پنے لگے۔

اچانک کمرے میں ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ جس نے ایک تیس پینتیس سالہ شخص کا روپ دھار لیا۔ اس شخص کا چہرہ جلا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے وہ اس قدر خوف ناک صورت تھا کہ میری تو کھانسی بندھ گئی پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے امر لال کی طرف دائیں ہتھیلی کا رخ کیا اس کے ہاتھ کی ہتھیلی سے ایک چنگاری سی نکلی اور امر لال مہاراج کے جسم میں آگ لگ گئی وہ نیچے گر کر تر پنے لگے اور چند لمحوں بعد ان کا جسم ساکت ہو گیا۔ ان کی لاش آگ سے اس طرح جھلس



چکی تھی کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔  
پھر وہ دشت آتما میری طرف دیکھ کر غراہٹ  
آميز لہجے میں بولی۔ ”رام اوتار میں تجھے ایک اور موقع  
دیتا ہوں کہ اب میرے راستے میں مت آنا۔“ اس نے  
اپنی رو داد مکمل کی اور دوبارہ رونے لگا۔

”آپ گھبرا نہیں یہاں آستانے میں  
رہیں۔ شام ہوتے ہی میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“  
اس نے رام اوتار کو تسلی دی۔ شام تک حاجت مندوں کا  
رش ختم ہو چکا تھا وہ حجرے سے باہر نکلا تو رام اوتار دو  
ملازموں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وہ پہاڑی سے  
اترے ہی تھے کہ منچو شاہ زین کے کندھے پر آ گیا۔  
”کیسے ہو چھوٹے؟“ شاہ زین نے دل ہی دل میں  
شوخی لہجے میں کہا مگر منچو نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ  
پھلائے بیٹھا رہا۔

پہاڑی سے نیچے رام اوتار کی بگھی موجود تھی  
انہیں گاؤں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی شاہ زین کو حویلی کے  
ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ اس نے رام اوتار کو تاکید کی  
کہ کانتا جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے اسے اطلاع دے  
دی جائے۔

”ہاں تو دوست اب بتاؤ ناراض کیوں ہو؟“  
رام اوتار کے کمرے سے جاتے ہی منچو سے شاہ زین  
مخاطب ہوا۔

”تم اتنے دنوں بعد جو پہاڑی سے اترے  
ہو میں وہیں تمہارا نیچے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔“ منچو  
نے اترتے ہوئے کہا۔

”تم تو جانتے ہو کہ میں نے اپنی زندگی  
انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے  
اور پھر باباجی نے بنا کسی خاص ضرورت کے پہاڑی  
سے اترنے سے منع کیا تھا۔“ شاہ زین نے کہا۔ وہ کافی  
دیر تک گپ شپ میں مصروف رہے۔

نصف شب کے قریب کمرے کے دروازے  
پر دستک ہوئی۔ اور رام اوتار گھبرا یا ہوا کمرے میں داخل  
ہوا۔ ”جلدی چلئے مہاراج! کانتا اپنے کمرے سے نکل

پڑی ہے۔“ وہ رام اوتار کے ساتھ برآمدے میں پہنچا  
تو اس نے ایک نوجوان لڑکی کو گیٹ سے نکلتے دیکھا۔  
چوکیدار کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ کانتا کا راستہ نہ روکے  
شاہ زین دے قدموں اس لڑکی کے پیچھے چل پڑا تو رام  
اوتار اور چوکیدار بھی اس کے ساتھ ہوئے چوکیدار کے  
ہاتھ میں نارچ موجود تھی لیکن شاہ زین کے منع کرنے  
پر اس نے نارچ روشن نہیں کی۔

ادھر کانتا رات کے مہیب سنائے میں بناء ادھر  
ادھر دیکھے چلی جا رہی تھی۔ ”یہ تو مرگھٹ کی راہ پر جاری  
ہے۔“ رام اوتار دہلی دہلی آواز میں بولا۔ پھر وہ واقعی  
مرگھٹ میں داخل ہو گئی۔

چودھویں کا چاند آسمان پر پوری آب و تاب  
سے چمک رہا تھا اس کے باوجود مرگھٹ کا خوف ناک  
اور ہولناک ماحول اور ویرانی انہیں خوف زدہ کرنے کے  
لئے کافی تھی۔ اس ویران ماحول میں ایک عجیب سا  
سکوت طاری تھا۔ ایسے میں اگر کوئی پتہ بھی گرتا  
تو بدروح کا گمان ہوتا رام اوتار اور چوکیدار تو بہت  
ڈرے ہوئے تھے۔ اور مرے مرے قدموں سے شاہ  
زین کا پیچھا کر رہے تھے جو پتے تلمے قدموں سے کانتا  
کے پیچھے چل رہا تھا۔ ایک جگہ جا کر کانتا رک گئی وہ سحر  
زدہ سی ایک طرف دیکھ رہی تھی۔

شاہ زین نے ارد گرد کا جائزہ لیا مگر وہاں ان  
کے علاوہ کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہ تھا۔ منچو بھی شاہ  
زین کے کندھے پر چوکننا کھڑا تھا۔ شاہ زین نے اسے  
اس وقت مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک جلالی  
وظیفے کا ورد کرنے لگا۔

اچانک کانتا کے قریب ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔  
جس نے ایک لمبے تڑنگے 35 سالہ شخص کا روپ  
دھار لیا۔

اس بھیا تک صورت شخص کے چہرے کا رخ ان  
تینوں کی طرف تھا گویا وہ انہیں دیکھنے کی قدرت رکھتا تھا  
اس دوران منچو اسے اس بدروح کے بارے میں  
تفصیلات بتا چکا تھا۔



شاہ زین چند قدم آگے بڑھا اور ٹھہر ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم اس لڑکی سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں گوپال ہوں اور ورشو سے اس مرگھٹ میں موجود ہوں۔ ایک روز جب کہ یہ لڑکی اپنی سکھیوں کے ساتھ یہاں سے گزری تو میری اس پر نظر پڑتے ہی میں فریفتہ ہو گیا یہ میری پریمیکا سنگیت سے ملتی جلتی ہے اگر تم لوگ مداخلت نہ کرتے تو ابھی کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ مگر اب میں اس کی آتما کو اپنے دوش میں کر کے لے جاؤں گا، تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ ترنت اپنا جیون بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ، میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں کوئی عام آتما نہیں، کالی کے مہان سیوک گوپال کی آتما ہوں۔“

شاہ زین بولا۔ ”میں جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک تم زندہ تھے تمہارے شر سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ تم نے کالے جادو سے کئی لوگوں کے گھرا جاڑے۔ اور گاؤں کی بہت سی عورتوں کو عزت سے محروم کیا۔ اور تو اور تم نے اپنے مندر کی داسیوں تک کو نہیں بخشا۔ سنگیت نامی نوعمر داسی کو تم نے زبردستی مندر میں بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ مگر تمہاری بد قسمتی تھی کہ ایک دوسرے پجاری نے تمہیں یہ گھناؤنی حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اسی مرگھٹ میں لا کر گاؤں والوں نے گڑھا کھود کر تمہیں اس گڑھے میں دھکیلنے کے بعد آگ لگا کر زندہ جلا دیا اور پھر اسی گڑھے کو بھر کر وہ مرگھٹ سے چلے گئے۔ تب سے تمہاری آتما اس مرگھٹ میں بھٹک رہی ہے۔“

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دو سو سال پہلے کی بات ہے اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اس معصوم لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ اسی مرگھٹ میں تمہاری آتما کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ ان دونوں کے درمیان تلخ وترش جملوں کا تبادلہ جاری تھا جب کہ رام اوتار اور چوکیدار خوف سے لرز رہے تھے ایک تو رات کا مہیب سناٹا اور پھر مرگھٹ کی ویرانی اور سب سے بڑی خوف ناک بات ان کے سامنے خوف ناک آتما موجود تھی۔ جس کی

شکلی وہ خود اس سے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ جب کہ کانتا اس سب سے بے نیاز تھی کیوں کہ وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔

”خود کو حصار میں محفوظ کر لو۔“ منچو نے سرگوشی کی تو شاہ زین نے گم صم کھڑی کانتا کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا جب کہ رام اوتار اور چوکیدار پہلے ہی اس کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے اپنے اطراف حصار کھینچ لیا۔

”تم کیا سمجھتے ہو یہ کنڈل تمہیں بچالے گا۔“ گوپال نے کہا اور اس کے لب بٹنے لگے۔

شاہ زین سمجھ گیا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے گڑھوں سے نیلے رنگ کی شعاعیں نکلیں اور ان کی طرف بڑھیں اور جیسے ہی حصار سے ٹکرائیں فضا میں چنگاریاں سی اڑیں اور اس طرح کی آواز ابھری جیسے پھلجوریاں پھوٹ رہی ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ تھے لیکن چوکیدار خوف زدہ ہو کر چیختا ہوا جیسے ہی حصار سے باہر نکلا اس شعاع کی زد میں آ گیا اور مرگھٹ اس کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ پھر وہ تیوراً کر نیچے گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ اسے خونی آتما نے مار دیا تھا۔ رام اوتار کا تو جیسے ڈر کے مارے سانس رک گیا تھا وہ کچھ دیر کھڑا لرزتا کانپتا رہا۔ پھر لہرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ آتما نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا تو طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے مرگھٹ میں طوفان آچکا ہو۔ خونی آتما اب دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب کہ شاہ زین با آواز بلند قرآنی آیات پڑھ رہا تھا۔

جیسے ہی آتما حصار کے قریب آئی۔ شاہ زین نے دایاں ہاتھ بلند کر کے انگلی کو جنبش دی اور اس کی طرف پھونک ماری۔ آتما کا وجود آگ کے شعلوں میں گھر گیا اور مرگھٹ خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔ کچھ



ہی دیر میں وہاں راکھ کا ڈھیر پڑا تھا۔ ہوا اڑا کر لے گئی،  
خونی آتما کا خاتمہ ہوتے ہی کانتا بھی بے ہوش ہو گئی۔  
شاہ زین نے جھنجھوڑ کر رام اوتار کو ہوش میں  
لایا۔ وہ اب تک خوف زدہ تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے  
چوکیدار کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ ”گھبراؤ مت اس آتما کا  
خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب تم لوگ محفوظ ہو۔“ شاہ زین نے  
اسے تسلی دی اور کانتا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دم کیا تو وہ بھی  
ہوش میں آ گئی۔

”پتا جی میں یہاں کیسے آ گئی؟“ وہ باپ سے  
لپٹ کر خوف زدہ لہجے میں بولی۔

شاہ زین نے وہ رات حویلی میں بسر کی اور صبح  
سویرے رام اوتار سے جانے کی اجازت طلب کی، وہ  
شاہ زین کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے لاکھوں  
روپے کا نذرانہ دینے پر اصرار کرنے لگا۔ مگر شاہ زین  
نے انکار کر دیا شاہ زین کو کبھی میں بیٹھا کر پہاڑی  
پر پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنے حجرے کی طرف جیسے ہی بڑھا منچو  
غائب ہو گیا۔

اسی روز شام کے قریب جب حاجت مندوں کا  
رش کم ہوا تو وہ حجرے میں کچھ دیر کے لئے لیٹا ہی تھا کہ  
باہر سے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں وہ صورت  
حال جانے کے لئے حجرے سے باہر نکلا۔ ”شاہ  
صاحب اس پہاڑی کو پولیس گھیرے میں لے رہی  
ہے۔“ ایک مرید نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے  
اطلاع دی۔

شاہ زین نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی۔ پہاڑی  
کے چاروں طرف درجنوں پولیس اہلکار موجود تھے ان میں  
سے بہت سے چاروں طرف سے پھیل کر پہاڑی پر چڑھ  
رہے تھے ان کے ساتھ ایک پنڈت بھی تھا۔ جسے اس نے  
بخوبی پہچان لیا وہ اس کا ازلی دشمن پر تاب بھوش تھا۔

☆.....☆.....☆

بڑے جان گسل لحات تھے دشمن آرمی کا دستہ  
اس عمارت کے گرد محاصرہ تنگ کرتا جا رہا تھا۔ وہ جانتے  
تھے کہ زندہ گرفتاری کی صورت میں انہیں اذیت ناک

موت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کا مشن بھی ناکام  
ہو جائے گا اور محدود ایسومیشن کے ساتھ آرمی کے اس  
دستے سے مقابلہ بھی ناممکن تھا۔ اسلحہ کے نام پر ان کے  
پاس صرف 2 پستل اور دو رائفلیں تھیں ایک رائفل غلام  
مصطفیٰ کے پاس جب کہ دوسری رائفل حیدر علی کے  
ہاتھ میں تھی جبکہ سمان اور ناصر کے پاس پستل تھے۔  
مقابلہ یا ہتھیار ڈالنے یعنی دونوں ہی صورتوں میں موت  
یقینی تھی۔ وہ چاروں خاموش کھڑے تھے اور ماحول پر  
سکوت چھایا ہوا تھا۔

اس سکوت کو غلام مصطفیٰ نے توڑا۔ جو کہہ رہا تھا  
”دوستو! ہمارے پاس اتنا ایسومیشن نہیں کہ ہم ان کا  
مقابلہ کر سکیں اور سوچنے کا وقت بھی نہیں میرا مشورہ بلکہ  
آرڈر ہے کہ تم تینوں غنیمتی سمت سے نکلنے کی کوشش کرو  
جبکہ میں انہیں سامنے سے روکتا ہوں۔“

حیدر علی کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔ ”کرٹل  
تو حیدر کے بعد میں اس گروپ کا لیڈر ہوں اور ڈسپلن کے  
مطابق تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔ اور ہماری زندگیوں  
سے زیادہ اہم ہمارا یہ مشن ہے اگر تم تینوں بچ نکلنے میں  
کامیاب ہو گئے تو دہشت گردی کے اس مرکز کو تباہ  
کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کر لو گے۔“

اس کے حکم ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ  
تینوں جانتے تھے کہ غلام مصطفیٰ سچ کہہ رہا ہے ان چاروں  
کا یہاں محصور ہو کر ڈٹ جانا بہادری نہیں بے وقوفی کہلاتا  
۔ غلام مصطفیٰ نے رائفل کی ٹال دیوار میں بنے سوراخ  
سے باہر نکال کر آگے بڑھنے والے فوجی دستے پر برسٹ  
فار کر دیا دو فوجی اس کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔

میجر رام پرشاد نے غصے سے کھولتے ہوئے فار  
کھولنے کا حکم دیا۔ پھر تینوں اطراف سے ان پر گولیاں  
برسائی جانے لگیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونج  
رہی تھی۔ وہ بھی وقفے وقفے سے گولیاں چلا کر اپنی  
موجودگی کا احساس دلا رہا تھا اور تاک تاک کر سامنے  
آنے والے فوجیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ جب کہ سمان  
ناصر اور حیدر علی عقبی سمت پہنچ کر نشیب میں پھسلے ہوئے



چھوٹے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک طرف نکل گئے ادھر غلام مصطفیٰ دشمن کے پانچ چھ اہلکاروں کو واصل جہنم کر چکا تھا پھر اسے میجر رام پرشاد کی آواز سنائی دی۔ ”میں میجر رام پرشاد تم لوگوں کو آخری موقع دے رہا ہوں خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم اس عمارت کو اڑا دیں گے۔ میرا وچن ہے کہ تمہیں جان سے نہیں مارا جائے گا۔“ وہ شاید میگافون میں بول رہا تھا۔ کیوں کہ اس کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

غلام مصطفیٰ نے دونوں ہاتھ منہ کے آگے بھونپو بنایا اور چلا کر جواب دیا۔ ”میجر میں تمہیں وہی تاریخی جواب دوں گا جو ٹیپو سلطان نے انگریز فوج کو دیا تھا۔ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“ اس کی آواز عمارت کے درودیوار سے ٹکراتی ہوئی ہوا کے دوش پر لہرا کر چاروں طرف اس طرح گونجی جیسے اس علاقے کی ایک ایک چٹان ایک ایک پتھر بول رہا ہو۔ اور پھر مصطفیٰ نے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ان پر فائر کھول دیا۔ وہ گولیاں برسا رہا تھا آگے بڑھنے کی کوشش کرنے والے مزید جہنم رسید ہو گئے دشمن کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اتنی سخت مزاحمت کی انہیں توقع نہ تھی دشمن آرمی کا یہ دستہ اس بات سے قطعی آگاہ نہ تھا کہ ان کے مقابلے میں تنہا صرف ایک شخص ہے اور دوسرے وہاں سے نکل چکے ہیں، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اتنی زبردست مزاحمت کئی تربیت یافتہ افراد کر رہے ہیں۔

میجر کے حکم پر اس عمارت پر دستی بم پھینکنے کے ساتھ ساتھ راکٹ لانچر بھی فائر کر دیئے گئے فضا ہولناک دھماکوں سے گونج اٹھی اور زمین لرز گئی جب کہ عمارت جگہ جگہ سے منہدم ہو کر زمین بوس ہو گئی۔

ادھر وہ تینوں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے رات کے اندھیرے میں یہاں قدم قدم پر دشواریاں اور رکاوٹیں تھیں کہیں راستہ ناہموار تھا اور کہیں زمین اس قدر نرم کہ پاؤں مٹی میں ڈھنس جائیں، پتوں کی

سرسراہٹ سے کسی خطرناک سانپ یا جنگلی جانور کے گزرنے کا گمان ہوتا تھا۔ اور پھر اندھیرا بھی تھا اس سب کے باوجود وہ ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھ رہے تھے ان تینوں کے ذہن میں ان دیکھے اندیشے سانپ کی طرح کلبلا رہے تھے کہ نہ جانے غلام مصطفیٰ پر کیا گزری وہ تنہا آرمی کے اس دستے سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک پے درپے تین چار دھماکے ہوئے اور زمین لرز اٹھی عمارت سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زمین ان کے پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہو۔ ظالموں نے عمارت کو اڑا دیا۔“ حیدر علی سرد آہ بھر کر بولا۔

وہ تینوں سمجھ چکے تھے کہ غلام مصطفیٰ شہید ہو چکا ہے اور شہید کے لئے نہ تو روتے ہیں اور نہ ہی افسوس کرتے ہیں وہ بھی رکے بغیر چلتے رہے اور اس عمارت سے کافی دور پہنچ گئے مسلسل بھاگنے سے ان کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے اور جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا کافی دیر بعد جب وہ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے گزرنے لگے تو یلکھت فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری وہ تینوں زمین پر گر گئے اور گولیاں شوں شوں کی آواز سے ان کے قریب سے گزرنے لگیں۔ وہ پھرتی سے جھاڑیوں کے جھنڈ میں جا گھسے۔ فائرنگ رک چکی تھی اور فائرنگ تھمتے ہی سناٹا چھا چکا تھا۔ ویسے بھی چاروں طرف تاریکی کا راج تھا اس گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں وہ حملہ آوروں سے نہیں بچ سکتے۔

کچھ فاصلے پر چار پانچ ٹارچوں کی روشنی لہراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ انہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے ان کے ذہن میں ایک ہی سوال مچل رہا تھا کہ نامعلوم حملہ آور کون تھے کیا وہی فوجی دستہ تھا جس نے انہیں اس عمارت میں گھیرا تھا؟

پھر کہیں دور سے انہیں میجر رام پرشاد کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کہاں گئے وہ مسئلے؟ ڈھونڈو



یہاں کہیں ہوں گے انہیں بچ کر نہیں نکلنا چاہئے۔“ وہ بجلی کی سی سرعت سے جھاڑیوں سے نکل کر ایک طرف ریگ گئے۔ اس طرف قدرے نشیبی ڈھلان تھی وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرائنگ کرتے ہوئے اس کھلے میدان سے نشیبی ڈھلان سے ہوتے ہوئے قد آور جھاڑیوں کی آڑ میں پہنچے اور اٹھ کر بھاگنے لگے۔ مسلسل بھاگنے سے ان کے سانس پھول چکے تھے وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے ہوتے ہوئے ریتیلے میدان میں پہنچ چکے تھے اس میدان میں فاصلے فاصلے سے مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے تھے وہ ان ٹیلوں کی آڑ میں پہنچنا چاہتے تھے ان کی کوشش یہی تھی کہ رات کی تاریکی میں ہی آرمی کے دستے سے نجات حاصل کر لیں۔

اچانک عقب سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آواز ابھری۔ خوش قسمتی سے انہیں ایک بھی گولی چھونہ سکی تھی اور وہ ایک بڑے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں دیک گئے گاڑی کی ہیڈ لائٹس دور سے دکھائی دے رہی تھیں وہ ایک بڑے ٹائروں والی جیپ تھی جس پر پانچ چھ فوجی سوار تھے جیپ ان سے فاصلے پر رکی اور اس سے فوجی نیچے اترے۔

”وہ تو صرف پانچ چھ ہیں دوسرے کہاں گئے؟“ سمان نے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ بھی ادھر ہی ارد گرد ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے اور ان پر گولی چلانے کی حماقت مت کرنا ورنہ ہم دھر لے جائیں گے۔“ حیدر علی نے کہا۔

دشمن انہیں ارد گرد پھیل کر ڈھونڈ رہا تھا۔ اور وہ دل دہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ اس ٹیلے کا رخ نہ کریں جس کی آڑ میں وہ مورچہ زن ہیں پھر ان کے دل دھک سے رہ گئے۔ فوجی اسی ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے جس کی آڑ میں وہ تینوں موجود تھے۔ حیدر علی نے ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور نہایت ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ دشمن کے پہنچنے سے پہلے اپنی جگہ تبدیل کر کے ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں پہنچے اور پھر وہاں سے ریگتے ہوئے ٹیلے کا طواف کر کے

ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں جا پہنچے جہاں سے محض چند قدموں کے فاصلے پر فوجیوں کی جیپ موجود تھی۔

اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری انہوں نے مڑ کر دیکھا فوجی اندھا دھند ارد گرد کی جھاڑیوں اور ٹیلوں پر برسٹ فار کر رہے تھے انہوں نے موقع غنیمت جان کر جیپ کی طرف دوڑا لگادی جب تک دشمن ان کی طرف متوجہ ہوتا وہ جیپ میں سوار ہو چکے تھے انجن اشارٹ تھل حیدر علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گیر لگایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا جیپ طوفانی رفتار سے آگے بڑھی فوجیوں نے جیپ کے پیچھے دوڑتے ہوئے ان پر گولیوں کے برسٹ فار کئے انہوں نے بروقت جھک کر جان بچائی گولیاں سنسناتی ہوئی جیپ کی باڈی سے ٹکرائیں۔

لیکن حیدر علی گولیوں کی برسات میں انتہائی مہارت سے تیز رفتار سے جیپ دوڑاتا ہوا فارنگ رینج سے باہر نکل گیا۔ ناہموار راستے میں تیز رفتاری کی وجہ سے گاڑی بری طرح ڈگمگاہی تھی اور ہچکولے کھا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے جیپ الٹ جائے گی مگر خیریت گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی جیپ جھٹکا کھا کر رکی تو حیدر علی نے اطلاع دی کہ ”فیول ختم ہو چکا ہے۔“

اب پیدل چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ سستانے کے لئے رے کے ایک جگہ بیٹھ کر حیدر علی نے اپنے کٹ بیگ میں سے ایک بوتل نکالی اور سمان سے کہا۔ ”اس محلول کو اپنے جسم پر اچھی طرح ملنے کے بعد کسی کپڑے سے پونچھ لو۔“

”یہ کیا ہے؟“ سمان نے سفید رنگ کے محلول کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”اس سے تم اپنی اصل شکل و صورت میں آ جاؤ گے یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ اشوک کمار بس میں تمہیں نیگرو کے روپ میں دیکھ چکا ہے۔“ حیدر علی نے جواب دیا اور سمان اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا



حیدر علی اور ناصر نے بھی اپنا میک اپ صاف کر لیا۔  
کچھ دیر قیام کے بعد وہ اٹھ کر آگے بڑھے ہی  
تھے کہ انہیں کچھ فاصلے سے کوئی دوڑتا ہوا اپنی طرف آتا  
دکھائی دیا وہ ٹھٹھک کر رک گئے حیدر علی نے رائفل اور  
ناصر اور سمان نے پستل آنے والے پر تان لئے پھر وہ  
قریب آیا تو سمان ششدر رہ گیا وہ رادھا بھی جو قریب  
آ کر اسے پہچان کر اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی  
ناصر اور حیدر علی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے سمان  
نے اسے بمشکل خود سے الگ کیا۔ ”تم رات کے اس  
پہر اس ویرانے میں کیا کر رہی ہو اور تمہاری یہ حالت  
کس نے بنائی؟“ وہ رادھا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا  
جس کے بال منتشر تھے چہرے پر خراشوں کے نشانات  
تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سمان نے اپنی  
جیکٹ اتار کر اسے پہنا دی۔

”تمہارے جانے کے دوسرے روز وہاں  
پولیس نے ریڈ کیا اور مجھے گرفتار کرنے کے بعد آرمی  
کے حوالے کر دیا گیا پھر وہاں سے مجھے یہاں  
راجستھان میں لایا گیا جہاں درجنوں کی تعداد میں  
لڑکے اور لڑکیوں کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے  
وہ رات دن مجھے نوپنے کھونٹے کے بعد تم لوگوں کے  
بارے میں پوچھتے تھے، آج میں میجر رام پرشاد کے  
کمرے میں بھی وہ جیسے ہی شراب کے نشے میں دھت  
ہو امیں وہاں سے بھاگ نکلی اور بھگوان کی کرپا سے وہاں  
سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

وہ تینوں چونک پڑے تھے نادائستگی میں وہ دشمن  
آرمی سے بھاگتے ہوئے اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے  
تھے۔ ”ان کا وہ ٹریننگ سینٹر کہاں ہے؟“

سمان نے بے تابانی سے پوچھا۔  
”میں ایک خفیہ راستہ جانتی ہوں یہ ایک سرنگ  
ہے جو ٹریننگ سینٹر تک جا رہی ہے مجھے بھی فرار ہوتے  
ہوئے اتفاقاً ہی نظر آ گئی تھی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“  
”رادھا یہ دہشت گردی کا مرکز ہے جہاں جدید  
ترین ہلاکت خیز اسلحہ بھاری مقدار میں موجود ہے۔

یہاں سے اسلحہ پاکستان اسمگل کر کے دہشت گردوں  
تک پہنچایا جاتا ہے اور اس اسلحہ سے وہاں دہشت گرد  
معصوم بچوں عورتوں اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام کرتے  
ہیں۔ اس ٹریننگ سینٹر میں نو جوان لڑکوں کو برین واش  
کر کے دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ یہ ظالم  
لوگ لڑکوں کا ذہن اس قدر تبدیل کر لیتے ہیں کہ وہ  
انسانی روبرو ان درندوں کے حکم پر خود کش جیکٹ جسم  
سے باندھ کر اپنی جان دینے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں  
لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں ہمارا مشن دہشت  
گردی کے اس کمپ کا خاتمہ ہے اور اس مشن کی خاطر ہم  
اپنے دو جانثاروں سے محروم ہو چکے ہیں ان میں سے  
ایک میرے والد تھے۔“

”ٹھیک ہے میں تمہیں وہاں لے چلتی ہوں مگر تم  
تین افراد ایک رائفل اور دو پستل کے بل پر ان سے  
کیسے مقابلہ کرو گے؟ وہ درجنوں کی تعداد میں تربیت  
یافتہ فورس کے اہلکار ہیں اور پھر ان کے پاس جدید  
اور مہلک ہتھیار ہیں۔“

سمان مسکرایا اور بولا۔ ”رادھا حق کی خاطر  
لڑنے کے لئے طاقت اور اسلحہ کی نہیں حوصلے ہمت  
اور عزم کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارا مقصد نیک ہے،  
انشاء اللہ خدا ہماری مدد کرے گا۔“

وہ رادھا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔  
کچھ دیر بعد رادھا ایک چھوٹی سی پہاڑی کے قریب  
بھاڑیوں کے جھنڈ کے پاس جا کر۔ ”اس جھنڈ میں  
سرنگ ہے۔“ رادھا نے ہا اور وہ بلا جھجک بھاڑیوں کے  
جھنڈ میں جا گھسے۔

ایک طرف زمین پر بڑا سائل نما پتھر تھا۔ رادھا  
کے کہنے پر سمان وہ بھاری پتھر ایک طرف سرکایا تو تین  
بائی چار کا خلا نظر آیا وہ باری باری اس خلاء میں اتر گئے  
یہ سرنگ نما راستہ تھا جو آگے جا کر کشادہ ہو گیا اب وہ اس  
سرنگ میں با آسانی چل سکتے تھے وہ اندھیرے کے  
باوجود بنار کے چلتے رہے اس سرنگ کا خاتمہ ایک وسیع  
وعریض ہال نما کمرے میں ہوا یہاں بھی تاریکی تھی۔



”اب کہاں جاتا ہے؟“ سہان نے سرگوشی کی۔  
اچانک کمرہ روشن ہو گیا اور وہ تینوں ششدر رہ گئے کمرے میں میجر رام پرشاد سمیت چھ سات افراد موجود تھے جن کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی خودکار رائفلیں تھیں۔ انہوں نے نجا اسٹائل کے بلیک کلر کے یونیفارم پہن رکھے تھے اور چہرے پر نقاب تھے۔

”اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں اپنے ہتھیار پھینک دو۔“ میجر رام پرشاد غرایا تو انہوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔

”کیا رادھا نے انہیں پھنسا یا ہے؟“ سہان نے سوچا اور بے بسی سے میجر رام پرشاد اور سیاہ پوشوں کو دیکھا جن کی مہیب گنوں کا رخ ان کی طرف تھا اور انگلیاں ٹریگر پر تھیں۔ ان کی انگلی کی معمولی سی جنبش انہیں موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔

”کس سوچ میں پڑ گئے۔ اتنا زیادت سوچو ابھی تو میرے پاس تمہارے لئے بہت سے سرپرائز ہیں، پہلا سرپرائز تو یہ رادھا ہے جو تمہیں یہاں گھیر کر لائی ہے اور ذہن سے اس غلط فہمی کو نکال دو کہ یہ ہماری ساتھی ہے تم نے اس کے گھر میں کچھ گھنٹوں کے لئے پناہ لی تھی اور اس کے ساتھ بڑے رنگین اور سنگین لمحات گزارے تھے پھر تم وہاں سے چلے گئے اور پولیس کی نااہلی کی وجہ سے اس علاقے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے تمہیں اس کی ملازمہ ماننی تو یاد ہوگی وہ دلش پری کی نکلی، پہلے دن تو خاموش رہی، دوسرے روز پولیس کو اطلاع دے دی اسے گرفتار کر لیا گیا وہاں سے خفیہ ادارے اسے لے گئے۔

مجھے پتہ چلا تو رادھا کو اپنی تحویل میں لے لیا پھر میرے ہی حکم پر اس کی پانچ سالہ بیٹی کو بھی یہاں پہنچا دیا گیا ادھر تم راجستھان آتے ہوئے بس میں میرے ایک کارندے اشوک کمار کی نظر میں آ گئے اور اس نے چالاکی سے تمہارے لباس میں حساس ڈیوائس جو کہ اسٹیکر کی شکل میں تھی چپکادی۔ پھر تم لوگ ہماری نظروں میں تھے۔ اس عمارت پر میرے دستے

نے ریڈ کیا تو قلع کے برخلاف وہاں زبردست مزاحمت ہوئی اور میرے دستے کے کئی جوان مارے گئے تو میں نے سوچا اس عمارت میں آنگ وادی آٹھ نو تو ضرور ہوں گے اس عمارت کو دستی بموں اور راکٹ لانچروں سے اڑا دیا گیا وہاں صرف تمہارے ایک ساتھی کی لاش ملی تب پتہ چلا کہ تم سب بھاگ گئے ہو، اور ہم سے صرف ایک ہی شخص مقابلہ کر رہا تھا۔“

وہ بولتے بولتے لمحہ بھر کے لئے رکا تو سہان بول اٹھا۔ ”میجر رام پرشاد غلام مصطفیٰ سے مقابلہ کرتے وقت تم اور تمہارے ساتھی اتنا تو جان چکے ہوں گے کہ سوگیدڑ مل کر بھی ایک شیر کا شکار نہیں کر سکتے اور ہم وہاں سے تم سے ڈر کر نہیں بھاگے تھے جھپٹنے کے لئے پلٹے تھے پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا ہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ۔

ان سنگین لمحات میں بھی حیدر علی اور ناصر بنس پڑے انہوں نے دیکھا تو بین آ میر باتوں کے باوجود میجر رام پرشاد مسکرا رہا تھا۔ ”بولو خوب بولو جتنا چہک سکتے ہو چہک لو کچھ دیر بعد تم نے رونا بھی ہے ہاں تو میں کہہ رہا تھا اسکے بعد تم ریتلیے میدان میں دیکھ لئے گئے یہاں سے میں نے اپنی پلاننگ میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور تمہارے ساتھ جو ہے بلی کا کھیل کھیلا۔

تمہیں وہاں سے جان بوجھ کر فرار ہونے کا موقع دیا گیا شاید تم لوگوں نے غور نہیں کیا وہاں تم تینوں پر گولیوں کی بارش ہوئی مگر ایک بھی گولی تمہیں چھو نہ سکی۔ گولیاں چلانے والے نہ اتاری تھے اور نہ ہی تم تینوں سپر ہیرو جو گولیوں کی برسات میں وہاں سے با آسانی فرار ہو گئے۔

کلدیپ ہمارے قبضے میں تھی رادھا کو اس کی جان بچانے کے لئے مجبوراً ہماری بات ماننا پڑی۔ اور وہ گھیر کر تمہیں یہاں لے آئی اب تمہارے لئے ایک سرپرائز اور بھی ہے لیکن اس کے لئے تمہیں باہر چلنا پڑے گا۔“ رام پرشاد کے اشارے پر ایک سیاہ پوش نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

وہ کمرے سے باہر نکلے تو ایک وسیع و عریض



سہان بے اختیار ان کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رام پرشاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”رک جاؤ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ان کی موت بھی حیرت ناک ہوگی۔“ وہ وہیں رک گیا مگر اس کی نظریں بدستور ابرش اور بریرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ جن کی نگاہوں میں اس کے لئے اجنبیت تھی۔

”یہ ہمارے تیار کردہ انسانی بم ہیں جو سوائے ہمارے کسی کو نہ جانتے ہیں اور نہ ہی پہچانتے ہیں نہ ہی ان کے کوئی احساسات ہیں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں۔ ہم انہیں جو حکم دیں گے اس پر یہ بلا جھجک عمل کریں گے یہی ہتھیار ہم جہاں چاہتے ہیں بھیجتے ہیں پھر یہ ہمارے حکم پر ہدف پر پہنچ کر خود کو ختم کر ڈالتے ہیں اور ہمارے دشمن کو ناکافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان دونوں کو جب یہاں لایا گیا تو انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لئے ہمارے خود کش اسکوڈ کا حصہ بننے کے لئے رضا مندی ظاہر کر دی۔ اسی طرح کے ہمارے دوسرے اسکوڈ کے تربیت یافتہ دہشت گرد بھی تمہارے ہی ملک کے نوجوان ہیں جنہیں ہم برین واش کر کے ان کے ذہنوں میں اپنے دشمن کے لئے زہر بھر دیتے ہیں نسلی تعصب کا زہر فرقہ واریت کا زہر اور پھر انہیں ٹریننگ دے کر مطلوبہ جگہ بھیجتے ہیں جہاں یہ اپنے ہی ہم وطنوں پر ہمارے ہتھیار آزماتے ہیں۔ اس کمپ میں اتنا اسلحہ موجود ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”اب تم عملی مظاہرہ دیکھو کہ یہ انسانی بم ہمارے ایک اشارے پر خود کو کیسے اڑائیں گے۔“

پھر میجر رام پرشاد نے ہنسی لال کی طرف دیکھا تو ہنسی لال نے پکارا۔ ”نمبر ٹوٹی فائیو اور نمبر ٹوٹی سکس۔“

ان تینوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے خاص کر سہان کی حالت غیر ہونے لگی گویا یہ شیطان ابرش اور بریرہ کو ان کے سامنے اڑانے والے تھے اور وہ ان دونوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ

میدان میں کھڑے تھے مسلسل بھاگ دوڑ سے رات اختتام پذیر ہو رہی تھی اور صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا تینوں اطراف سے پہاڑیوں میں گھرے اس وسیع و عریض میدان میں طلوع آفتاب کا منظر بڑا خوشنما تھا۔ چوتھی سمت خاردار تاریں تھیں وہاں آٹھ دس نجاشاٹل سیاہ پوش گئیں لئے چوکنے کھڑے تھے۔ ایک جگہ درجنوں کی تعداد میں لڑکے کرائے کے مخصوص لباس میں کھڑے تھے ان کا انسٹرکٹر انہیں ایکساٹز کروا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر نشانہ بازی کی تربیت دی جا رہی تھی۔

وہ ان تینوں کو اس میدان کے عین وسط میں لے گئے جہاں پچاس ساٹھ لڑکے مختلف قطاروں میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر بنی لال اور اشوک کمار موجود تھے۔ چند رائفل بردار سیاہ پوش وہاں بھی تعینات تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سلمان حیدر علی اور ناصر نہتے تھے اور پھر اس احاطے میں درجنوں مسلح سیاہ پوش گشت کر رہے تھے۔

”ان لڑکوں کو غور سے دیکھو۔“ رام پرشاد نے عجیب سے لہجے میں کہا تو وہ تینوں اس گروپ کی طرف مڑے مختلف قطاروں میں کھڑے لڑکے لڑکیاں ٹراؤز پہنے ہوئے تھے اور شرٹ پر عجیب ساخت کی جیکٹ موجود تھی ان کے چہروں پر بھی نقاب تھے۔

”نمبر ٹوٹی فائیو اور نمبر ٹوٹی سکس قطار سے باہر نکل کر سامنے آؤ۔“ ہنسی لال نے حکمانہ لہجے میں کہا اور دو نقاب پوش لڑکیاں ایک قطار سے نکلیں اور بوٹ کی طرح چلتی ہوئی ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں نہ جانے کیوں ان لڑکیوں کو دیکھ کر سہان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”نقاب اتار دو۔“ ہنسی لال نے دوسرا حکم دیا۔ دونوں لڑکیوں نے جیسے ہی چہرے سے نقاب اتارا سہان حیرت زدہ رہ گیا وہ ابرش اور بریرہ تھیں جو کسی روبوٹ کی طرح ساکت جامد کھڑی اگلے حکم کی منتظر تھیں ان کے چہرے بے تاثر تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔



ان کے چاروں طرف درجنوں بلیک کیٹ کے مسلح کارندے موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

پولیس اہلکار پہاڑی کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے تھے اور پرتاب بھوش بھی چند پولیس اہلکاروں کے ساتھ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا بڑے کٹھن لمحات تھے اس کا مقصد اچھا اور ارادے نیک تھے وہ دکھی انسانوں کے کام آنے کے لئے اس پہاڑی پر موجود تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر پولیس نے اسے حراست میں لے لیا تو ساری زندگی دشمن کی کسی جیل میں سڑتا رہے گا وہ پریشان سا حجرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا، باباجی حجرے میں کھڑے تھے۔ ”پریشان مت ہو اور ایک طرف آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ باباجی نے حکم دیا۔

تو وہ ایک کونے میں دوڑا نو ہو کر بیٹھ گیا باہر سے لوگوں کے چیخنے پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ پہاڑی پر موجود باباجی کے عقیدت مند تھے جو پولیس اہلکاروں کی راہ میں مزاحم ہو رہے تھے گویا اس کی گرفتاری کے لئے قانون کی ساری مشینری حرکت میں آچکی تھی۔

پرتاب بھوش نے جب دیکھا کہ اتنے عرصہ سے وہ شاہ زین پر قابو نہیں پاسکا تو اس نے قانون کی مدد لی تھی۔ شاہ زین اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ ہندو پولیس ایک مسلمان کے مقابلے میں ہندو پنڈت کا ساتھ دے گی۔ سب سے مرید زیادہ دیر تک پولیس کو حجرے میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے اور ڈی ایس پی رینک کا آفیسر نصف درجن مسلح اہلکاروں کے ساتھ حجرے میں داخل ہوا ان کی نگاہیں باباجی پر مرکوز تھیں پھر ڈی ایس پی آگے بڑھا اور درشت لہجے میں باباجی سے مخاطب ہوا۔ ”تم کون ہو اور شاہ زین کہاں ہے؟“

گویا پولیس اہلکار شاہ زین کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ شاہ زین سمجھ گیا کہ یہ سب باباجی کی روحانیت کا کمال تھا۔ ”شاہ زین میرا شاگرد ہے۔ تم خود دیکھ لو اگر نظر آئے تو گرفتار کر لینا، لیکن مجھے اس کا جرم

تو بتا دو۔“ باباجی نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
”وہ یہیں کہیں اسی پہاڑی پر موجود ہے ہمیں اس کا پتہ بتا دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا وہ مجرم ہے تم زیادہ دیر تک اسے نہیں چھپا سکو گے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولا۔  
”ڈی ایس پی میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ شاہ زین کا جرم کیا ہے؟ اور رہا یہ سوال کہ وہ یہاں کہیں ہے تو تم اس حجرے سمیت پہاڑی کے چپے چپے کی تلاشی لے سکتے ہو۔“

”اس ڈشٹ نے پنڈت بھگت رام سمیت پانچ پجاریوں کی ہتھیا کی ہے۔ پر تو تم کون ہو اور یہاں کر رہے ہو؟“ ڈی ایس پی رعونت بھرے لہجے میں بولا۔  
”میرا نام محمد الیاس ہے اور میں برسوں سے اپنے اس حجرے میں اللہ کی عبادت میں مصروف ہوں رہا، سوال شاہ زین کا تو وہ تمہیں یہاں ملتا ہے تو پکڑ کر لے جاؤ۔“ شاہ زین خاموش بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

”وہ ہماری نظروں سے بچ کر کہاں جائے گا، درجنوں پولیس اہلکار اس پہاڑی کے چپے چپے کی تلاشی لے رہے ہیں اسے بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔“ ڈی ایس پی نے کہا، اسی وقت پرتاب بھوش حجرے میں داخل ہوا مگر دوسرے ہی لمحے باباجی کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اپنی دانست میں وہ شاہ زین کو پھنسا چکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ باباجی بھی اس حجرے میں موجود ہو سکتے ہیں وہ کچھ دیر تک انہیں گھورتا رہا پھر ڈی ایس پی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مہاشے تم نے اب تک اس مسئلے کو کیوں نہیں گرفتار کیا۔“

”مہاراج اس حجرے میں داخل ہونے پر ہمیں یہ بوڑھا نظر آیا۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی نہیں تھا۔“ ڈی ایس پی نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

”یہاں موجود نہیں؟ کیا تم سب اندھے ہو گئے ہو، وہ دیکھو حجرے کے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا ہے اسے پکڑ لو۔“ وہ شاہ زین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شاہ زین کو اس سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ گویا



وہ اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا پرتاب بھوش کوئی معمولی پنڈت پجاری نہیں تھا۔ وہ اس پہاڑی پر باباجی کے لئے بھی مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ ادھر ڈی ایس پی حیرت سے کہہ رہا تھا۔ ”کون مہاراج یہاں تو ہمیں آپ اور اس بوڑھے کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آ رہا۔“

”کیا کہا تمہیں نظر نہیں آ رہا وہ دیکھو وہ سامنے بیٹھا ہے۔ جس نے پانچ پجاریوں کی ہتھیا کی تھی۔“

پرتاب بھوش جھلا کر بولا۔

”مہاراج آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں آپ دونوں اور ہمارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔“ ڈی ایس پی زچ ہو گیا۔

”اوہ میں سمجھ گیا یہ سب اس پاپی کے کارن ہو رہا ہے۔ اس نے تمہاری نظروں کے سامنے پردہ ڈال دیا ہے میں ابھی اس کا توڑ کرتا ہوں۔“ اس نے منتر پڑھتے ہوئے شاہ زین کی طرف ہاتھ جھٹکے۔

”پرتاب بھوش اپنی اوقات میں رہو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے تم بار بار شاہ زین کے راستے میں آتے ہو اور شکست کھاتے ہو اس کے باوجود باز نہیں آتے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا حق ہے باطل بظاہر جتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو فتح بالآخر حق کی ہی ہوتی ہے۔“ باباجی نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

”بڑھے میرے سامنے تیرا کوئی چمٹکا نہیں چلے گا اس ڈشٹ نے پنڈت پجاریوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ اب اس کی کوئی بھی سہائتا نہیں کر سکتا۔“

”پرتاب بھوش تم شاہ زین کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اپنی تمام تر تپسیا اور گیان دھیان کے باوجود مجھ سے ناواقف ہو۔“ باباجی نے اس پر نظریں جما کر بولے۔

”بڑھے زیادہ باتیں مت بنا اور سیدھی طرح بتا تو نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔“ ڈی ایس پی غرایا۔

”اپنے اس شکستی مان پنڈت سے کیوں نہیں پوچھتے۔“ باباجی نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ پرتاب بھوش اور ڈی ایس پی سے قطعی مرعوب نہ تھے۔

”تم دیکھ لیتا میں اسے کیسے یہاں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔“ پرتاب بھوش غصے سے بولا۔

”شیطان کی عمر طویل سہی لیکن انجام بہت برا ہے۔“ باباجی جلال میں آچکے تھے۔

پرتاب بھوش نے باباجی کی بات کا جواب دیئے بغیر منتر پڑھا اور اپنے دائیں ہاتھ کو جنبش دی اور شاہ زین کی طرف اشارہ کیا باباجی نے نیچے بیٹھ کر حجرے کے وسط میں عمودی لکیر کھینچی اور پرتاب بھوش کی طرف دیکھا۔

”بڑھے اب تو اسے نہیں بچا سکتا میں خود اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ ڈی ایس پی تم اس بڑھے کو گرفتار کر لو میں خود اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔“ وہ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر بولا۔

”رک جاؤ آگے مت بڑھنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“ باباجی نے اسے تنبیہ کیا۔

”دیکھ رہے ہو ڈی ایس پی میں سچ کہہ رہا ہوں وہ ملیچھ سامنے موجود ہے تم صرف اس بڑھے کو قابو کرو باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔“

ایک نومند سپاہی ہتھکڑی لے کر باباجی کی طرف بڑھا اس نے باباجی کی کلائی کو ہاتھ لگایا تھا کہ چپٹا ہوا ایک طرف جا گرا۔ دوسرے کا بھی یہی حشر ہوا تو پولیس اہلکاروں نے باباجی کی طرف رائفلیں تان لیں پرتاب بھوش تیزی سے شاہ زین کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نادیدہ چیز سے ٹکرا کر گر پڑا۔ جب وہ اٹھا تو غصے سے کانپ رہا تھا۔

”کیا ہوا مہاراج؟“ ڈی ایس پی آگے بڑھا۔

”یہ بڑھا کالی کے مہان سیوک سے یدھ (جنگ) کرنا چاہتا ہے پر تو یہ نہیں جانتا میں اسے نشٹ کر سکتا ہوں۔“ اس نے منتر پڑھتے ہوئے اپنا دایاں پاؤں اوپر اٹھا کر زمین پر مارنا شروع کر دیا۔ حجرے کے درود یوار لرزنے لگے۔ اور چیخوں کی خوف ناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں پولیس اہلکار بھی ڈی ایس پی سمیت سہم کر ایک طرف دبک گئے تھے۔ جب کہ باباجی



با آواز بلند قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے حقیقت یہ تھی کہ اس بار شاہ زین بھی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ یہ ماورائی قوتوں کی لڑائی تھی جو اس وقت زوروں پر تھی پر تاب بھوش مسلسل منتر پر رہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور حجرہ بھیا نک قسم کی چیخ و پکار سے گونج رہا تھا پولیس اہلکاروں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ سبے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ شور کافی دیر جاری رہا پھر خاموشی چھا گئی۔

باباجی کی آواز گونجی۔ ”تمہارے سارے بیرو تو گئے کام سے اب کیا کرو گے۔“

پر تاب بھوش نے ڈنڈوت کیا اور کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کر کے اپنے سر سے چند بال توڑ کر زمین پر پھینکنے، پولیس اہلکار حیرت اور خوف سے ایک طرف سمٹ گئے زمین پر پانچ چھ خوف ناک قسم کے سانپ پھنکارتے ہوئے باباجی کی طرف بڑھ رہے تھے، باباجی نے اطمینان سے وظیفہ پڑھتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا پانچ چھ نیولے نمودار ہوئے اور سانپوں سے بھڑ گئے۔

ڈی ایس پی اور دیگر پولیس اہلکار پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپوں اور نیولوں کا مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ جو زیادہ دیر جاری نہ رہا اور نیولوں نے لمحوں میں سانپوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر سانپ اور نیولے دونوں ہی غائب ہو گئے۔ پر تاب بھوش نے اس کے بعد بھی جادو کے مہلک ترین وار کئے مگر ناکام رہا۔

باباجی نے حق اللہ کا نعرہ بلند کیا تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر باباجی نے آگے بڑھ کر شاہ زین کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں اپنی آنکھیں بند کراؤ اور جب تک میں نہ کہوں اپنی آنکھیں مت کھولنا۔“

شاہ زین نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں تو اس نے خود کو کسی پرندے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔

”وہ بھاگ رہے ہیں گولیاں چلاؤ“ پر تاب بھوش کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی اور حجرہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ کچھ دیر بعد شاہ زین نے

محسوس کیا کہ وہ حجرے سے باہر نکل چکے ہیں اور فضا میں اڑ رہے ہیں یہ شاہ زین کی زندگی کا حیرت انگیز تجربہ تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ یا کوئی ماورائی طرز کی ہارر مووی دیکھ رہا ہو، جس میں جن اور پریاں پرندوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس کے پاؤں زمین سے ٹکرائے پھر باباجی کی آواز ابھری۔

”اب آنکھیں کھول دو۔“

شاہ زین نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک سنسان علاقے میں کھڑا تھا اور باباجی غائب تھے۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ قریب ہی کہیں سے دل دہلانے والا دھماکہ سنائی دیا اور زمین لرز اٹھی۔ یہ لرزش اس قدر زیادہ تھی کہ شاہ زین لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اور پھر وقفے وقفے سے زوردار دھماکوں سے فضا گونج اٹھی اور زمین لرز نے لگی۔ شاہ زین اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گر پڑا اور سر اٹھا کر دیکھا تقریباً سو گز دور سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے کچھ فاصلے سے ایک بڑے ٹائروں والی جیپ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی اسی طرف آرہی تھی جیپ میں سوار افراد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اسے زمین و آسمان اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔

☆.....☆.....☆

خوف اور گھبراہٹ سے سمان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اسے اپنی موت کا ڈر نہیں تھا۔ وہ اس شہید سپاہی کا بیٹا تھا جو انجام سے بے پرواہ دشمن بھیڑیوں کے غول میں جا گھسا تھا اور مرتے مرتے بھی دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ اسے یہی خطرات لاحق تھے کہ کہیں بنسی لال ان دونوں لڑکیوں کو خود کش حملے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لئے تو منتخب نہیں کر چکا۔ یہ سوچتے ہی اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنسی لال نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو وہ انجام سے پرواہ ان پر پل پڑے گا۔ چاہے اس کے نتیجے میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن خیریت گزری ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بنسی



لال نے پکارا۔ ”نمبر ٹوٹی سکس اور نمبر ٹوٹی فائیو تم دونوں اپنی قطار میں لوٹ جاؤ، وہ دونوں اپنی قطار میں جا کر کھڑی ہو گئیں پھر ان کی سماعت سے بنی لال کی مخصوص بھاری آواز ٹھکرائی۔ ”نمبر الیون قطار سے باہر آؤ۔“

ایک نقاب پوش قطار سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے عجیب ساخت کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ”ریڈ پوائنٹ پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔“ بنی لال نے ایک طرف اشارہ کیا تو وہ ان سے کافی دور جا کر ایک سنسان جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بنی لال اس کی طرف اشارہ کر کے دھاڑا۔ ”ہارا کاری۔“

لفظ ہارا کاری سنتے ہی نمبر الیون نے جیکٹ پر ہاتھ رکھا اس کے ساتھ ہی سماعت شکن دھماکہ ہوا اور نمبر الیون کے جسم کے پرچے اڑ گئے۔ ساتھ ہی زمین لرز اٹھی۔ گرد و غبار کا بادل سا چھا گیا تھا جس جگہ نمبر الیون کھڑا تھا۔ وہاں گڑھا بن گیا تھا وہ نمبر الیون سے کافی فاصلے پر تھے اس لئے کسی بھی قسم کے جانی نقصان سے محفوظ رہے۔ اس وسیع و عریض احاطے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔ ”یہ معمولی نوعیت کا دھماکہ خیز مواد تھا۔ اس لئے ہم سب محفوظ رہے تم نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ نمبر الیون نے میرے حکم پر بلا جھجھک خود کو اڑا دیا۔ کیوں کہ اس کا داغ میرے تابع تھا اور اگر میں زبان سے نہ کہتا اور اسے سوچ کے ذریعے حکم دیتا تب بھی وہ وہی کرتا جو اسے حکم دیا گیا تھا۔“

”گویا تم ٹیلی پیٹھی اور ہپناٹزم پر عبور رکھتے ہو۔“ سمن نے پر خیال انداز میں گردن ہائی۔

”انسانی جسم میں سب سے بڑی شکتی دماغ میں ہے۔ ٹیلی پیٹھی، ہپناٹزم، مسمریزم، اور اسی طرح کے دیگر علوم کا تعلق دماغ سے ہے بس صرف خیال کے بے لگام گھوڑے پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ تم دیکھو گے ایک روز دنیا پر ہماری حکومت ہوگی۔“ وہ ہذیالی انداز میں ہنسا۔

”تمہارے جیسے کئی پاگل دنیا میں آئے اور چلے

گئے فرعون، نمرود، قارون، چنگیز خان، انہوں نے بھی تمہاری طرح خدائی دعوے کئے تھے انجام کیا ہوا وہ رہتی دنیا تک کے لئے عبرت کا نشان بن کر رہ گئے۔ انسان وہی ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو انسانیت کی بھلائی کے کام میں لائے۔ ورنہ اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔“ ان کی گفتگو میں حیدر علی نے دخل دیا۔ اور میجر رام پرشاد نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ خون کی سرخی سے دمکتا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں کا تیکھا پن ظاہر کرتا تھا کہ وہ سخت گیر طبیعت کا مالک ہے۔ وہ بلیک کیٹ کے ایک سیاہ پوش کی طرف دیکھ کر غرایا۔ ”انہیں سیل نمبر تھری میں لے جا کر خاطر خواہ تواضع کرو تا کہ ان کے دماغ ٹھکانے آ جائیں۔“

سیل نمبر تھری ایک لاک اپ نما کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ آہنی سلاخوں کا تھا۔ انہیں کمرے میں لے جا کر ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور منہ پر ٹیپ لپٹنے کے بعد پاؤں میں رسی باندھ کر کرچھت لگے کہوں سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ اور کمرے میں تیز روشنی والا بلب جلا دیا گیا تھا۔ روشنی اس خوف ناک حد تک تند و تیز تھی کہ اس میں آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا اوپر سے وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی مانند اُلٹے لٹک رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے یہ بھی اعصاب شکنی کا مرحلہ ہے۔ نہایت ہی اذیت ناک اور اعصاب شکن صورتحال تھی لمحہ بہ لمحہ ان کی اذیت اور تکلیف میں اضافہ ہونے لگا۔ سیاہ پوش انہیں بند کر کے جا چکے تھے۔

کمرے سے باہر کچھ فاصلے پر ایک دوسرا سیاہ پوش رانقل ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھا تھا۔

ادھر رادھا میجر رام پرشاد سے التجا کر رہی تھی ”آپ نے جیسا کہا میں نے ویسا ہی کیا اب آپ بھی اپنا وجہ پورا کریں اور میری بیٹی کو میرے حوالے کر دیں اور جانے دیں۔“

رام پرشاد کرسی سے اٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تم پریشان مت ہو چند روز ہمیں بھی سیوا کرنے کا موقع دو۔“ پھر اس نے کسی شکر نامی شخص



کو پکارا ایک قوی ہیکل سیاہ پوش نمودار ہوا۔

”اسے کسی کمرے میں منتقل کر دو۔“ اس نے حکم دیا۔ رادھا کو ایک بارہ بائی بارہ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ سہان کو پناہ دینا اور اس کی سنگت میں گزارے چند خوشگوار لمحات کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ اور اسے بیٹی سمیت راجستھان کے اس ویرانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور اسے مجبوراً بیٹی کی جان بچانے کے لئے سہان اور اس کے ساتھیوں کو دھوکے سے گھیر کر یہاں لانا پڑا تھا۔ اس کے باوجود میجر رام پرشاد نے اپنا وعدہ ایفا نہیں کیا تھا۔ رادھا کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیٹی کو اس کمپ میں کہاں رکھا گیا ہے اور کس حال میں ہے۔

دن کو اسے کھانا بھی دیا گیا۔ اس نے بے دلی سے چند نوالے کھائے اور بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی، نہ جانے اب یہ درندے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ رات نو بجے کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور دو سیاہ پوش اندر داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں آتشیں سیال کی بوتلیں تھیں اور آنکھوں میں ہوس کی چمک انہوں نے دروازہ اندر سے لاک کیا۔ اپنے مکروہ چہروں سے نقاب اتارے اور اس کی طرف بڑھے۔ رادھا نے مزاحمت کی کوشش کی مگر ان گرانڈیل شیطانوں کے مقابلے میں اس کی مزاحمت اس جڑیا کی طرح تھی جسے باز اپنے بنیوں میں دبوج چکا ہو۔ وہ ان کی ہولناک گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور وہ اسے نہایت بے رحمی سے روند رہے تھے۔

کمرہ رادھا کی چیخوں اور کراہوں سے گونج رہا تھا۔ وہ نصف شب تک شراب پیتے رہے اور مال مفت دل بے رحم کے مصداق اسے نوچتے کھسوتے رہے رات ایک بجے کے قریب انہوں نے نشے میں مدہوش ہو کر اسے چھوڑا تو اس نے سسکتے ہوئے پہلا سوال اپنی بیٹی کے بارے میں کیا۔ ”وہ کہاں ہے اور اسے اس سے کب ملایا جائے گا؟“

ان میں سے ایک ہنسا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ابے سالی وہ پرلوک سدھار چکی ہے اسے میجر رام پرشاد کے حکم پر کل ہی گولی مار کر گڑھے میں دفن کر دیا تھا۔“

وہ بمشکل اپنے خراشوں سے بھرے بدن کو سمیٹ کر اٹھی اور دوبارہ چکرا کر بیڈ پر گر پڑی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جبکہ وہ دونوں شیطان شراب کے نشے میں قالین پر دھت پڑے تھے۔

غم بے چینی اضطراب اور پھر اذیت میں بدل کر جسم و جان کو سلگا دیتا ہے وہ بیڈ پر چت لیٹی چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر رو کر ماتم کرتی رہی پھر اپنے کرجی کرجی وجود کو سمیٹ کر اٹھی۔ لباس پہنا اور بمشکل چلتی ان دونوں شیطانوں کے قریب پہنچی جو شراب کے نشے میں مدہوش خراٹے لے رہے تھے۔ ان کی رائفلیں ایک طرف پڑی تھیں رادھا نے ایک رائفل اٹھائی پھر کچھ سوچ کر رائفل واپس رکھی اور رائفلوں کے قریب پڑے خنجر کی طرف لپکی یہ خنجر بھی ان دونوں میں سے کسی کا تھا۔ اس کے دل میں نفرت اور انتقام کا جوالا مکھی دہک رہا تھا اور اسے دہکتے ہوئے انگارے میں تبدیل کر دیا تھا جو قریب موجود ہر شے کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں اس کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جس نے اس کے ڈر خوف اور بڑی کے جذبات کو نگل لیا تھا۔

وہ خنجر اٹھائے ہوئے ان میں سے ایک کے قریب گئی اور نیچے بیٹھ کر خنجر کی دھار اس کی شہ رگ پر پھیر دی۔ اپنی پامالی کے احساس کے ساتھ ساتھ بیٹی کے قتل کا بدلہ لینے کا جنون تھا۔ اس لئے ہاتھ کی گرفت سخت رہی۔ تیز دھار خنجر نے اس شخص کا زرخرہ موم کی طرح کاٹ دیا۔ اور خراہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے گلے سے خون کا فوارہ نکلا جو رادھا کے چہرے اور لباس کو داغ دار کر گیا۔ اس کا جسم چند لمحوں کے بعد ساکت ہو گیا۔

آوازیں سن کر اس کا ساتھی کسمسایا مگر نشے نے اسے دوبارہ مدہوش کر دیا۔ رادھا آگے بڑھی اور خنجر دستے تک اس کے سینے میں عین دل کے مقام میں



اتار دیا۔ پھر اس پر بھی اسے چین نہیں آیا اس نے پے درپے کئی وار وحشیانہ انداز میں اس کے جسم پر کئے، وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی باپتی رہی پھر ہاتھ روم میں نہانے کے ساتھ ساتھ لہو کے داغ دھبے دھو کر باہر نکلی رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب کوریڈور سنان پڑا تھا وہ غائب دماغی کی حالت میں آگے برہتی رہی۔

اسے سیل نمبر تھری کی تلاش تھی جہاں سمان اور اس کے ساتھیوں کو قید رکھا گیا تھا وہ ویسے بھی یہاں کے محل وقوع سے کسی حد تک واقف تھی وہ گزشتہ چند دنوں سے اسی کیمپ میں محصور تھی۔ اگرچہ اس پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی لیکن گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی وہ اسے بے ضرر اور کمزور سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ چیونٹی بظاہر کتنی ہی تھیں سہی ٹنوں وزنی ہاتھی کو کاٹ لے تو اس کا دم نکل جاتا ہے۔

کافی آگے جا کر یہ راہداری ایل کی صورت میں دائیں سمت مڑ رہی تھی وہ چند لمحوں کے لئے راہداری کے کنڈر پر رکی ذرا سا سر نکال کر جائزہ لیا سامنے ہی سنگلاخ سلاخوں والا دروازہ تھا جس میں تیز روشنی کے بلب میں الٹے لٹکے انسانی جسم صاف دکھائی دے رہے تھے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ پوش کرسی کی پشت سے نیک لگائے سورہا تھا۔

رادھانے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی سیاہ پوش کے سر پر جا پہنچی۔ وہ تربیت یافتہ بلیک کیٹ کا اہلکار تھا اس کی چھٹی حس نے اسے ہوشیار کیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں مگر تب تک دیر ہو چکی تھی رادھانے خنجر اس کے دل میں اتار دیا۔ اسے چیخنے تک کی بھی مہلت نہ ملی اور وہ جہنم رسید ہو گیا۔ رادھا کے ہاتھوں یہ تیسرا قتل تھا وہ ایک عام سی عورت تھی جو کا کروچ چوبے سے لے کر چھپکلی تک سے ڈرتی تھی۔ مگر بیٹی کے قتل کی وجہ سے وہ قاتل بن چکی تھی۔

سیاہ پوش کی لاش کی تلاشی کے دوران اس کی جیب سے تالے کی چابی بھی مل گئی۔ اس نے تالا کھولا

اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ ناصر اور سمان ذبح کئے ہوئے جانوروں کی طرح الٹے لٹکے رہے تھے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے رادھا کو بھی دیکھ لیا تھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں لیکن وہ بولنے سے لاپچار تھے اس بات کا احساس ہوتے ہی رادھا نے سمان کے منہ سے ٹیپ ہٹانے کے بعد سمان کے ہاتھوں پر بندھی رسی خنجر سے کاٹ ڈالی۔

”تم یہاں کیسے پہنچی؟“ سمان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ وقت ان باتوں کے لئے مناسب نہیں اس سے پہلے کوئی دوسرا پہرے دار یہاں آ جائے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو آزاد کروانے کی تدبیر کرو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

کئی گھنٹوں سے الٹا لٹکنے کے باعث ان کی جسمانی حالت خاصی خراب تھی۔ سارا جسم سن ہو چکا تھا رادھانے اس کے پاؤں کی رسی کاٹی تو اس نے گرتے وقت ہاتھ آگے کر لئے اس کے سر پر کوئی چوٹ نہ لگی چند منٹ چل کر اس سے دوران خون بحال کیا پھر اپنے ساتھیوں کو آزاد کرایا۔ وہ دونوں بھی اذیت کی وجہ سے چلنے سے قاصر تھے خیر چند لمحے میں وہ دونوں بھی چلنے کے قابل ہو گئے ویسے بھی جب موت سر پر کھڑی ہو تو انسان موت کو سامنے دیکھ کر اپنے جسم کی ساری قوت یکجا کر کے اپنے لئے بچاؤ کی تدبیریں کرنے لگتا ہے۔ یہی کچھ اس وقت ان کے سامنے تھا۔

خوف کی تلوار ان سب کے سروں پر لٹک رہی تھی ان کی ٹانگیں ہلکی ہلکی کپکپا رہی تھیں، دل تھا کہ اپنی رفتار سے زیادہ دھڑک رہا تھا۔ حالت ان سب کی ایسی تھی کہ اگر کوئی ہلکی آواز بھی پیدا ہو جاتی تو ان کی چیخ نکلنے سے کسی صورت نہیں رک سکتی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے انہیں ایک کمرے کے دروازے کے نیچے سے روشنی نظر آئی اور پھر جب وہ دروازے کے قریب پہنچے تو وہ ششدر رہ گئے۔

(جاری ہے)